مکمل

پریم پچیسی

حصہ اوّل ودوم

مصنّفہ

منشی پریم چند

مصنّف

★ پریم بتیسی۔ دودھ کی قیمت۔ بازارِ حسن۔ جلوۂ ایثار۔

دیہات کے افسانے۔ نرملا۔ میرے بہترین افسانے۔ زادِ راہ وغیرہ

قیمت

مطبوعہ:۔ جمال پرنٹنگ پریس۔ جامع مسجد دہلی

آزاد بک ڈپو ہال بازار امرتسر

فہرست مضامین

دیباچہ

منشی پریم چند کے قصوں کے لئے کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہے ان میں سے اکثر قصے زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں، بعض ہمدرد میں بھی شائع ہوئے ہیں اور اکثر اردو، ہندی، گجراتی، بنگالی اخبارات و رسائل نے انہیں نقل و ترجمہ کر کے اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کی ہے۔ ہم ان قصص کو کتابی صورت میں شائع کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اس مجموعے کی قدر کریں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ کسی تصنیف کو زندہ رکھنے کے لئے محض کتابی صورت میں آ جانا کافی نہیں ہوتا، ہزاروں کتابیں آئے دن چھپتی رہتی ہیں، جن کا نام تک ہم نہیں سنتے، بقا کے لئے تصنیف میں ذاتی جوہر کا ہونا ضروری ہے اور ان قصوں کے متعلق اسی امر کے یقین نے ہم کو ان کی اشاعت پر آمادہ کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کہانیاں اردو میں ایک نئی چیز ہیں۔ ان کے اخلاقی اور ادبی محاسن نے انہیں زندۂ جاوید رہنے کا مستحق بنا دیا ہے۔ اور انہیں اس کا موقع نہ دینا ادبی تقصیر سے کم نہ تھا۔ اب اس فرض کا بقیہ حصہ ناظرین کی سخن شناسی اور کہانیوں کے ادبی اوصاف پر منحصر ہے اگر قدر شناس ناظرین کے اصراری خطوط اور اخبارات کی ہمدردانہ تنقیدیں عام رائے کا پتہ دے سکتے ہیں تو ہم امید کرتے ہیں کہ کہانیوں کا دوسرا حصہ بھی ہم کو جلد شائع کرنا پڑے گا۔

پبلشر

ممتا

بابو رام رکھا مل دہلی کے ایک مرفّہ حال کھتری تھے۔ بہت ہی خوشنما وضع اور انتہا درجے کے اپ ٹو ڈیٹ۔ ان کی مہمان نوازی کی سارے محلّے میں دھوم تھی۔ آئے دن احباب کسی نہ کسی تقریب سے جمع ہو جاتے۔ ٹینس کھیلتے۔ تاش سے دل بہلاتے ہارمونیم سے شوق کرتے۔ چائے پانی کا لطف اٹھاتے اور اپنے دریا دل میزبان کی فراخدلی اور مہمان نوازی کی داد دیتے۔ بابو صاحب ممدوح دن بھر میں جتنے رنگ بدلتے اس پر پیرس کی سوسائٹی آف ویمن کو رشک ہو سکتا تھا۔ اس کا کئی بنکوں میں حصّہ تھا۔ کئی دکانیں تھیں۔ اور آمدنی کے ذرائع وافر تھے۔ مگر بابو صاحب کو اتنی فرصت نہ تھی کہ ان کی کچھ دیکھ بھال کرتے۔ مہمان نوازی ایک پاک فرض ہے۔ وہ ایک سچے محبِ وطن کے جوش سے فرمایا کرتے تھے۔ "مہمان نوازی ابتدائے آفرینش سے ہندوؤں کی امتیازی صفت رہی ہے۔ ہماری مہمان نوازی یگانۂ روزگار ہے ہم اس لحاظ سے دنیا میں فرد ہیں۔ ہم سب کچھ کھو بیٹھے ہیں۔ مگر جس دن ہم میں یہ صفت باقی نہ رہے گی، وہ دن ہندو قوم کے لئے ماتم ذلت اور موت کا دن ہوگا۔"

مگر باوجود ان مہمان نوازیوں کے مسٹر رام رکھا قومی ضروریات سے بے خبر نہ تھے۔ وہ ملکی اور تمدنی تحریکوں میں پرجوش حصہ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ سال میں دو بلکہ کبھی تین تقریریں ضرور تیار کر لیتے۔ تقریریں بہت شستہ بہت حمیت اور انشا پردازی کی خوبیوں سے مرصع ہوتی تھیں۔ احباب تقریر کے ایک ایک لفظ

پر نعرۂ مرحبا بلند کرتے، تالیاں بجاتے حتیٰ کہ مسٹر رام رکھا کو تقریر کا سلسلہ قایم رکھنا دشوار ہو جاتا۔ خاتمۂ تقریر پر اکثر احباب اُنہیں گود میں اُٹھا لیتے اور پیٹھ ٹھوک کر کہتے ”تیری زبان میں جادو ہے“۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے؟ قوم کی اتنی بیش بہا خدمت کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ نیچ ذاتوں کے سدھار کے لئے دہلی میں ایک سوسایٹی تھی۔ بابو صاحب اس کے سیکریٹری تھے۔ اور اس کام کو غیر معمولی دلچسپی سے انجام دیتے تھے۔ جب ان کا بوڑھا کہار بیمار ہوا اور کرسچین مشن کے ڈاکٹروں نے اُس کا علاج کیا۔ جب اس کی بیوہ عورت گزران کی کوئی صورت نہ دیکھ کر درگاہ مشن کی سجادہ نشین ہو گئی تب اِن دونوں موقعوں پر بابو صاحب نے افسوس کے ریزولیشن پاس کئے۔ زمانہ جانتا ہے کہ سیکریٹری کا کام جلسے کرنا اور ریزولیوشن بنانا ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔

مسٹر رام رکھا کی قومی مصروفیتیں یہیں تک محدود نہ تھیں۔ وہ بے جا رسوم اور جاہلانہ عقائد کے زبردست مخالف تھے۔ ہولی کے دنوں میں جب محلّہ کے چمار اور کہار شراب سے متوالے ہو کر پھاگ گاتے اور دف بجاتے ہُوئے نکلتے تو انہیں بڑا صدمہ ہوتا۔ قوم کی اِس جہالت پر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور وہ اکثر اس بُری رسم کا علاج اپنے ہنٹر سے کیا کرتے تھے۔ اُن کے ہنٹر میں قومی فلاح کا جوش ان کی زبان سے بھی زیادہ تھا۔ یہ اُنہیں کی مبارک اور قابلِ یادگار کوششیں تھیں جنہوں نے عین ہولی کے دن دہلی شہر میں کہرام مچا دیا۔ پھاگ گانے کے جرم میں ہزاروں پولیس کی زد میں آگئے۔ سینکڑوں گھروں میں عین ہولی کے دن محرم کا سا ماتم برپا ہو گیا۔ ادھر ان کے دروازے پر ہزاروں مرد اور عورتیں نالہ و فریاد کر رہی تھیں اور ادھر بابو صاحب کے خیر سگالی اور قدرداں احباب ان کی اِس اعلےٰ اور بے لوث خدمت پر صدق دلی سے مبارکباد دیتے تھے۔ غرض بابو صاحب کی یہ

قومی ہمدردیاں اور کوشش نمائشی خیالی۔ ذہنی اور فیشن ایبل تھیں ہاں اگر انہوں نے کسی اچھی تحریک میں حصّہ لیا تھا۔ تو وہ خاندان مشترکہ کی مخالفت تھی۔ اپنے والد مرحوم کے انتقال کے بعد بیوہ ماں سے الگ ہو گئے تھے۔ اس قومی خدمت میں ان کی بیوی خاص مددگار تھیں۔ بیوہ ماں اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اس سے بہو کی آزادی میں فرق آتا ہے۔ اور آزادی میں فرق آنے سے دل و دماغ کی بالیدگی اور تقویت نہیں حاصل ہوتی۔ بہو کو جلانا اور کڑھانا ساس کی طبیعت ہے۔ اس لئے بابو رام رکھا اپنی ماں سے علیحدہ ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے سعادت مندی کو راہ دے کر دس ہزار روپے اپنی ماں کے نام جمع کر دیئے۔ تاکہ اس کے سود سے اس کی گزران ہوتی رہے۔ لیکن بیٹے کی اس سعادتمندی پر ماں کا ایسا دل ٹوٹا کہ وہ دہلی چھوڑ کر اجودھیا جا رہیں اور تب سے برابر وہیں رہتی تھیں۔ بابو صاحب مسز رام رکھا کی نہ زور مخالفت کے باوجود کبھی کبھی اجودھیا چلے جایا کرتے تھے مگر وہ دہلی آنے کا کبھی نام نہ لیتی تھیں۔ ہاں اگر خیر و عافیت کا خط پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو دل سے مجبور ہو کر دریافت حال کر لیتی تھیں:۔

(۲)

اسی محلّے میں ایک سیٹھ گردہاری لال رہتے تھے۔ لاکھوں کا لین دین تھا۔ ہیرے جواہرات کا روزگار کرتے تھے۔ بابو رام رکھا کے دور کے رشتے میں ساڑھو ہوتے تھے۔ پرانی وضع کے آدمی تھے۔ صبح کو جمنا نہانے والے۔ گائے کو اپنے ہاتھوں سے جھاڑے پوچھنے والے۔ ان سے مسز رام رکھا کی طبیعت نہ ملتی تھیں مگر جب کبھی روپیوں کی ضرورت ہوتی۔ تو سیٹھ گردہاری لال کے یہاں سے بے تکلّف منگا لیا کرتے۔ آپس کا معاملہ تھا۔ صرف رقعے پر روپیہ مل جاتا۔ نہ کوئی رہن نہ ضمانت نہ اسٹامپ نہ شہادت۔ موٹر کار کے لئے دس ہزار کی ضرورت ہوئی وہ

وہیں سے آیا۔ گھوڑ دوڑ کے لئے ایک آسٹریلین گھوڑا ڈیڑھ ہزار میں لیا۔ وہ بھی سیٹھ جی کے یہاں سے آیا۔ رفتہ رفتہ کوئی بیس ہزار کا معاملہ ہو گیا۔ سیٹھ جی نیک طبیعت آدمی تھے۔ سمجھتے تھے کہ اس کے پاس دکانیں ہیں۔ بنکوں میں حصہ ہے۔ جب جی چاہے گا۔ روپیہ وصول کر لیں گے۔ مگر جب دو تین سال گذر گئے اور بابو رام رکھا کے تقاضے سیٹھ جی کے تقاضوں سے زیادہ سرگرم ہوتے گئے تو گردہاری لالہ کو اندیشہ ہوا ایک روز وہ رام رکھا کے مکان پر آئے اور ملائمت سے کہا۔ "بھائی صاحب! مجھے ایک ہنڈی کا روپیہ دینا ہے۔ اگر آپ میرا حساب کر دیں تو بہت اچھا ہو۔" یہ کہہ کر فرد حساب اور رقعے دکھائے۔ مسٹر رام رکھا کسی گارڈن پارٹی میں شریک ہونے کے لئے تیار تھے۔ بولے۔ "اس وقت معاف رکھیئے پھر دیکھ لوں گا۔ جلدی کیا ہے۔"

گردہاری لال کو بابو صاحب کی رُکھائی پر غصہ آ گیا۔ ترش ہو کر بولے۔ "آپ کو جلدی نہیں ہے۔ مجھے تو ہے۔ میرا دو سو روپیہ ماہوار کا نقصان ہو رہا ہے۔" مسٹر رام رکھا نے بے صبری سے گھڑی دیکھی۔ پارٹی کا وقت بہت قریب تھا۔ بہت منّت آمیز لہجے میں بولے۔ "بھائی صاحب! اس وقت میں بڑی عجلت میں ہوں۔ اس وقت مجھ پر عنایت کیجئے۔ میں کل خود حاضر ہوں گا۔

سیٹھ جی خوددار آدمی تھے۔ رام رکھا کی اس کج خلقی پر جل گئے۔ میں ان کا مہاجن۔ ان سے دولت میں عزت میں حیثیت میں بڑھا ہوا۔ چاہوں تو ایسوں کو نوکر رکھ لوں۔ ان کے دروازے پر آؤں اور میری یہ خاطر۔ یہ ہاتھ باندھے میرے سامنے کھڑے نہ رہیں مگر کیا میں حقہ۔ پان۔ الائچی۔ عطر کا بھی مستحق نہیں؟ تنک کر بولے "اچھا۔ تو کل حساب صاف ہو جائے۔"

رام رکھا نے اکڑ کر جواب دیا۔ "ہو جائے گا۔"

رام رکھا کی خود پسند طبیعت پر سیٹھ جی کے اس برتاؤ کا اثر کچھ کم حوصلہ شکن نہ ہوا۔ اس کندۂ ناتراش نے آج میری آبرو مٹی میں ملا دی، مجھے ذلیل کر گیا۔ خیر تم بھی اسی دلی میں رہتے ہو اور ہم بھی یہیں ہیں۔ غرض دونوں دلوں میں گانٹھ پڑ گئی۔ بابو صاحب کی طبیعت ایسی گری اور دل میں ایسی تشویش پیدا ہوئی کہ پارٹی میں شریک ہونے کا خیال چھوڑ دیا۔ دیر تک اسی الجھن میں پڑے رہے۔ پھر سوٹ اتار دیا اور خدمت گار سے بولے، جا کر منیب جی کو بلا لیا۔ منیب جی آئے ان کا حساب دیکھا گیا۔ پھر بینکوں کا حساب دیکھا۔ مگر جوں جوں اس وادی میں اترے، اندھیرا بڑھتا گیا۔ بہت کچھ ٹٹولا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر مایوس ہو کر وہ آرام کرسی پر گر پڑے اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ دکانوں کا مال بکا، مگر رقم بقایا میں پڑی ہوئی تھی۔ کئی گاہکوں کی دکانیں ٹوٹ گئیں اور ان پر جو رقم آتی تھی، وہ ڈوب گئی۔ کلکتہ کے آڑھتیوں سے جو مال منگایا اس کی ادائی کی تاریخ سر پر آپہنچی اور یہاں روپیہ بھی وصول نہ ہوا۔ دکانوں کا یہ حال، بینک کا اس سے بھی بدتر۔ رات بھر وہ انہیں تفکّرات میں کروٹیں بدلتے رہے، اب کیا کرنا چاہیے۔ گردھاری لال شریف آدمی ہے اگر سارا کچّا حال اسے سنا دوں تو ضرور مان جائیگا مگر یہ ذلّت کیونکر اٹھائی جائے گی۔ کمزور طالب علم کی جو کیفیت امتحان کے دنوں ہوتی ہے، وہی حال اس وقت رام رکھا کا ہے۔ بستر سے نہ اٹھے، منہ ہاتھ بھی نہ دھویا۔ کھانا کھانے نہ گئے۔ اتنا جانتے تھے کہ مصیبت میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں ہوتا۔ اس لئے ایک ذلّت سے بچنے کی کوشش میں کئی ذلتوں کا بوجھ نہ اٹھانا پڑا۔ دوستوں کو ان معاملات کی خبر تک نہ دی۔ جب دوپہر ہو گئی اور ان کی طبیعت یکسو نہ ہوئی تو ان کا چھوٹا لڑکا بلانے آیا۔ اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا "لالہ جی! آج کھانے کیوں نہیں نکلتے؟"

رام رکھا بولے۔ "بھوک نہیں ہے۔"
"کیا کھایا ہے؟"
"من کی مٹھائی"
"اور کیا کھایا ہے؟"
"مار"
"کِسنے مارا؟"
"گردھاری لال نے"

لڑکا روتا ہوا گھر میں چلا گیا۔ اور اس مار کے صدمے سے دیر تک روتا رہا۔ آخر طشتری کی بالائی نے اُس کے اس زخم پر مرہم کا کام دیا۔

(۳)

مریض کو جب جینے کی آس نہیں رہتی تو علاج کرانا چھوڑ دیتا ہے۔ بابو رام رکھا جب اس گتھی کو نہ سلجھا سکے۔ تو چادر تان لی۔ اور منہ لپیٹ کر سو گئے۔ شام کو یکایک اُٹھ کر سیٹھ جی کے یہاں جا پہنچے اور کسی قدر بے پروائی سے بولے۔ "حضرت! مَیں اب آپ کا حساب نہیں کر سکتا۔"

سیٹھ جی گھبرا کر بولے۔ "کیوں؟"

رام رکھا۔ اس لئے کہ میں بالکل مُفلس قلاّش ہوں۔ میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔ آپ اپنا روپیہ جیسے چاہیں وصول کریں۔

سیٹھ۔ یہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟

رام رکھا۔ بالکل سچ۔

سیٹھ۔ دُکانیں نہیں ہیں؟

رام رکھا۔ دُکانیں آپ مفت لے جائیے۔

سیٹھ۔ بنک کے حصّے۔

رام رکھا۔ وہ کب کے اُڑ گئے۔

سیٹھ۔ جب یہ حال تھا۔ تو آپ کو مناسب نہیں تھا۔ کہ میرے گلے پر چھری پھیرتے

رام رکھا نے مغرورانہ انداز سے کہا "میں آپ کے یہاں اُپدیش سننے کیلئے نہیں آیا ہوں۔ اور وہاں سے اُٹھ کر چل دیئے۔

سیٹھ جی نے فوراً نالش دائر کی۔ بیس ہزار اصل، پانچ ہزار سُود۔ ڈگری ہو گئی۔ مکان نیلام پر چڑھا۔ پندرہ ہزار کی جائداد پانچ ہزار میں نکل گئی۔ دس ہزار کی موٹر چار ہزار میں اُڑ گئی۔ غرضیکہ ساری جائداد منقولہ و غیر منقولہ کا صفایا ہو گیا۔ اور کُل ملا کر سولہ ہزار سے زائد رقم نہ کھڑی ہو سکی۔ اب رام رکھا کی ذات کے سوا کوئی ایسی جائداد باقی نہ تھی۔ جو اس بوجھ کی کفیل ہوتی۔ ساری گرہستی تباہ ہو گئی پھر بھی دس ہزار کے مقروض رہ گئے۔ عزت آبرو، مال اسباب سب مٹی میں مل گئے۔ بہت تیز دوڑنے والا شخص اکثر مُنہ کے بل گر پڑتا ہے۔

(۴)

اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد دہلی میونسپلٹی کے ممبروں کا انتخاب شروع ہوا۔ ممبری کے اُمیدوار ووٹروں کی ناز برداریاں کرنے لگے۔ دلالوں کی گرم بازاری ہوئی۔ رائیں موتیوں کے تول بکنے لگیں۔ اُمیدوار ممبروں کے پیروکار اپنے مؤکل کے محاسن ذاتی اور جوہر صفاتی کے راگ الاپنے لگے۔ چوطرفہ چہل پہل ہو گئی۔ ایک وکیل صاحب نے عام جلسے میں اپنے مؤکل صاحب کی نسبت فرمایا۔

"میں جس باکمال بزرگ کا پیروکار ہوں۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے فرزند اکبر کی شادی پر ۲۵ ہزار روپیہ صرف رقص و سرود میں صرف کر دیا تھا" حاضرین نے نعرہ تحسین بلند کیا۔

ایک دوسرے کنولیسر نے اپنے حلقہ کے دوٹروں کے روبرو اپنے مؤکل کا یوں ذکر خیر کیا۔ "میں یہ نہیں کہتا کہ آپ سیٹھ گردھاری لال کو اپنا ممبر بنایئے، آپ خود اپنا نیک و بد سمجھتے ہیں اور نہ سیٹھ جی میری سفارش کے محتاج ہیں، میری صرف یہ التماس ہے کہ آپ جیسے ممبر بنائیں، پہلے اس کے گذشتہ کارناموں کو غور سے دیکھیں دلی میں صرف ایک شخص ہے جو گذشتہ دس سال سے آپ کی خدمت کر رہا ہے صرف ایک شخص ہے جس نے آب رسانی اور صفائی کے انتظامات میں دل و جان سے مدد دی ہے صرف ایک شخص ہے جس کو حضور وائسرائے کے دربار میں کرسی پر بیٹھنے کا حق حاصل ہے اور آپ سب اصحاب اسے جانتے ہیں"۔ حاضرین نے تالیاں بجائیں۔

سیٹھ گردھاری لال کے حلقے میں اُن کے ایک رقیب بھی تھے منشی فیض الرحمان خاں، بڑے زمیندار اور مشہور وکیل تھے۔ بابو رام رکھا نے اپنی رسیدح اپنی سرگرمی اور اپنی جادو بیانی سے منشی صاحب کی خدمت کرنی شروع کی۔ انہیں سیٹھ جی کو زک دینے کا نادر موقع ہاتھ آیا۔ روزانہ ایک نہ ایک جلسہ کرتے، رات اور دن اسی دُھن میں رہتے۔ ان کی شعلہ بیانیوں کا حاضرین پر بہت اچھا اثر پڑتا۔ ایک بار آپ نے غیر معمولی جوش عقیدت سے فرمایا: "میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ منشی فیض الرحمان سے زیادہ لائق آدمی آپکو دلی میں نہ مل سکے گا۔ یہ وہ شخص ہے جس کی غزلوں سے مشاعرے گرما ہو جاتے ہیں۔ ایسے بزرگ کی اعانت کرنا میں اپنا قومی اور انسانی فرض خیال کرتا ہوں۔ میں ان شعبدہ بازوں پر لعنت بھیجتا ہوں، جو ایسے پاک اور قومی کام کو ذاتی مفاد کا ذریعہ بناتے ہیں دولت اور شے ہے، حضور وائسرائے کے دربار میں باریابی اور شے ہے۔ اگر قومی خدمت اور قومی جاں گری کچھ اور ہی چیز ہے۔ اور وہ شخص جس کی ساری زندگی سود خوری، حرام کاری۔

غضب اور عیش وعشرت میں گزری ہو، وہ اس خدمت کو ہرگز انجام نہیں دے سکتا۔"

(۵)

سیٹھ گردھاری لال نے اس معرکۃ الآرا تقریر کا حال سُنا تو غصے سے آگ ہو گئے میں حرام کار ہوں۔ سود خوار ہوں۔ عیاش ہوں۔ خیریت ہوئی کہ تم نے میرا نام نہیں لیا۔ مگر اب بھی تم میرے قابو میں ہو۔ ہوا خواہوں نے آگ پر تیل ڈالا ادھر مسٹر رام رکھا اپنے کام میں مصروف رہے۔ یہاں تک کہ ووٹنگ ڈے آ پہنچا۔ مسٹر رام رکھا کو اپنی کوششوں میں بہت کچھ کامیابی ہوئی تھی۔ آج وہ بہت خوش تھے۔ آج گردھاری لال کو نیچا دکھا دوں گا۔ آج اُسے معلوم ہو جائے گا کہ دولت دُنیا کی کل نعمتوں کو مہیا نہیں کر سکتی۔ جس وقت فیض الرحمان کے ووٹ زیادہ نکلیں گے اور میں تالیاں بجاؤں گا۔ اس وقت گردھاری لال کا چہرہ قابل دید ہو گا۔ رنگ فق ہو جائے گا۔ مُنہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں گی۔ آنکھیں نہ ملا سکے گا۔ شاید مجھے پھر منہ نہ دکھائے۔

انہیں خیالات میں مگن مسٹر رام رکھا شام کو ٹاؤن ہال میں داخل ہوئے شاندار مجمع تھا۔ حاضرین نے بڑے جوش سے ان کا خیر مقدم کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ووٹنگ شروع ہوا۔ اُمیدوار ممبر صاحبان اپنی قسمتوں کا فیصلہ سننے کے لئے مضطر ہو رہے تھے۔ چھ بجے چیئرمین نے فیصلہ سُنایا۔ سیٹھ جی کو شکست ہو گئی فیض الرحمان نے میدان مار لیا۔ مسٹر رام رکھا نے فرطِ مسرت سے ٹوپی ہوا میں اُچھال دی اور خود کئی بار اُچھل پڑے۔ جس نے سُنا حیران رہ گیا چاندنی چوک سے سیٹھ جی کو ہٹانا قطب صاحب کی لاٹ کو جگہ سے اُکھاڑنا تھا۔ والله کرامات ہے! معجزہ ہے۔ سیٹھ جی کے چہرے سے رام رکھا کو جتنی آرزوئیں

تھیں وہ سب پوری ہوگئیں۔ رنگ فق تھا۔ خفت اور ندامت کی تصویر۔ ایک وکیل صاحب نے اُن سے ازراہِ ہمدردی کہا۔ سیٹھ جی! مجھے آپ کی شکست کا بہت افسوس ہے۔ اگر میں جانتا کہ یہاں مُبارکباد کے بجائے ماتم پرسی کا فرض ادا کرنا پڑے گا تو ہرگز یہاں نہ آتا۔ میں تو صرف آپ کے خیال سے یہاں چلا آیا تھا۔" سیٹھ جی نے بہت ضبط کیا۔ مگر آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا ہی آئے۔ بے تعلقی بننے کی بے سود کوشش کر کے بولے "وکیل صاحب! مجھے اس کا کچھ افسوس نہیں۔ کونسی ریاست نکل گئی؟ خواہ مخواہ کی اُلجھن۔ فکر۔ پریشانی رہتی۔ چلو اچھا ہوا گلو خلاصی ہوگئی۔ اپنے کام میں ہرج ہوتا تھا۔ مجھے سچ سچ دل سے خوشی ہوئی۔ یہ کام تو بے کاروں کا ہے۔ گھر نہ بیٹھے رہے یہی بیگار کی۔ میری حماقت تھی کہ اتنے دنوں آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا۔" مگر سیٹھ جی کے چہرے نے ان خیالات کی تصدیق نہ کی۔ چہرہ دل کا آئینہ ہے۔ اس کی تصدیق البتہ ہوگئی۔"

مگر بابو رام رکھا بہت دیر تک خوشی کے مزے نہ لوٹنے پائے اور نہ سیٹھ جی کو انتقام کے لئے بہت دیر تک منتظر ہونا پڑا۔ مجلس برخاست ہونے پر جب بابو رام رکھا کامیابی کے زعم میں انڈے تلے مونچھوں پر تاؤ دیتے اور چاروں طرف مغرورانہ نگاہیں ڈالتے ہوئے باہر آئے تو دیوانی کے تین سپاہی آگے بڑھ کر انہیں گرفتاری کا وارنٹ دکھایا۔ اب کے بابو صاحب کے چہرے کا رنگ فق اور سیٹھ جی کے اس مبارک نظارے سے محفوظ ہونے کی باری تھی۔ گردھاری لال نے نشاط انگیز تالیاں تو نہ بجائیں مگر مسکرا کر منہ پھیر لیا۔ رنگ میں بھنگ پڑ گئی۔ آج اس فتح کی خوشی میں منشی فیض الرحمان نے پہلے ہی سے ایک شاندار دعوت کی تیاریاں کی تھیں مسٹر رام رکھا اس کے منتظم تھے۔ آج کی تقریر اُنہوں نے بڑی عرقریزی سے تیار کی تھی۔ مگر اس وارنٹ نے ساری آرزوؤں کا خون کر دیا۔ بابو صاحب کے دوستوں میں

کوئی بھی ایسا نہ تھا جو دس ہزار روپے کی ضمانت کرلیتا۔ ادا کر دینے کا ذکر ہی کیا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا بھی تو سیٹھ جی اپنے کو بد نصیب سمجھتے کیونکہ دس ہزار روپیہ اور میونسپلٹی کی ممتاز ممبری ہاتھ سے کھو کر انہیں اس وقت یہ شادمانی حاصل ہوئی تھی۔

(۶)

مسز رام رکھا کے گھر میں جوں ہی یہ خبر پہنچی۔ کہرام مچ گیا۔ ان کی بیوی پچھاڑ کر زمین پر گر پڑی۔ جب ذرا ہوش بجا ہوئے تو رونے لگی اور رونے سے فرصت ہوئی۔ تو اس نے گردھاری لال کو کوسنا شروع کیا۔ دیوتاؤں سے منت کر رہی تھی۔ انہیں رشوتیں دینے پر آمادہ کیا۔ کہ وہ کسی طرح گردھاری لال کو نگل جائیں۔ اس کارِ عظیم میں گنگا اور جمنا سے مدد مانگ رہی تھی۔ پلیگ اور ہیضہ کی خوشامدیں کر رہی تھی۔ کہ وہ دونوں مل کر اس گردھاری لال کو ہضم کر جائیں۔ مگر گردھاری لال کا کوئی قصور نہیں۔ قصور تمہارا ہے۔ بہت اچھا ہوا۔ تم اسی پوجا کے دیوتا تھے۔ کیا اب دعوتیں نہ کھلاؤ گے۔ میں نے تمہیں کتنا سمجھایا۔ روئی۔ روٹھی۔ بگڑی مگر تم نے میری ایک نہ سُنی گردھاری لال نے بہت اچھا کیا۔ تمہیں سبق تو مل گیا۔ مگر اس کا بھی کوئی قصور نہیں یہ سب آگ میں نے لگائی ہے۔ مخملی سلیپروں کے بغیر میرے پاؤں نہ اُٹھتے تھے جڑاؤ کڑوں کے بغیر مجھے نیند نہ آتی تھی۔ سیج گاڑی میرے ہی لئے بنوائی گئی تھی۔ انگریزی پڑھانے کے لئے میم صاحبہ کو میں نے ہی رکھا۔ غرض یہ سب کانٹے میں نے بوئے ہیں۔

مسز رام رکھا بہت دیر تک انہیں خیالات میں ڈوبی رہی۔ جب وہ رات بھر کروٹیں بدلنے کے بعد صبح کو اُٹھی تو اس کے خیالات چاروں طرف سے ٹھوکر کھا کے صرف ایک ہی مرکز پر جم گئے تھے۔ گردھاری لال بڑا موذی ہے اُسے ہمارا سب کچھ لے کر بھی تسکین نہ ہوئی۔ اتنا بھی ظالم قصائی سے نہ دیکھا گیا۔ اِن

خیالات نے انتشار سے اجتماع کی صورت اختیار کر کے اس کے دل میں غصے کی آگ دہکا دی۔ سورج کی کرنیں جب ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں تو شعلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس عورت کے دل میں رہ رہ کر غصے کا ایک بے قابو کر دینے والا جوش پیدا ہوتا تھا۔ بچے نے مٹھائی کے لئے ضد کی۔ اس پر برس پڑی۔ مہری نے چوکا برتن کر کے چولھے میں آگ جلا دی اس کے پیچھے پڑ گئی۔ میں تو اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں، آپ چڑیل کو روٹیوں کی دھن لگی ہے۔ آخر نو بجے اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے یہ خط لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

"سیٹھ جی! تمہیں اب اپنی دولت کے گھمنڈ نے اندھا کر دیا ہے۔ مگر کسی کا گھمنڈ یوں ہی نہیں قائم رہتا۔ کبھی نہ کبھی سر ضرور نیچا ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ کل شام جب تم نے میرے پیارے پتی کو گرفتار کرایا ہے میں وہاں موجود نہ تھی۔ ورنہ اپنا اور تمہارا خون ایک کر دیتی۔ تم دولت کے نشے میں بھولے ہوئے ہو۔ میں اسی دم تمہارا نشہ اتار دیتی۔ ایک عورت کے ہاتھوں ذلیل ہو کر تم پھر کبھی کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتے۔ خیر اس ظلم کا بدلہ تمہیں کسی نہ کسی طرح ضرور مل جائے گا۔ مجھے اس دن چین آئے گا جب تمہارے خاندان کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ اور تمہارا خاتمہ ہو جائے گا۔"

سیٹھ جی نے یہ پھٹکار پڑھی تو غصے سے آگ ہو گئے۔ اور گو کم ظرف و کمینہ آدمی نہ تھے۔ مگر غصے کے عالم میں طبعی شرافت کا نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ خیال نہ رہا کہ گو بیہودہ گستاخانہ تحریر ہے مگر ایک مظلوم عورت کے دلی جذبات ہیں۔ اس کی بے کسی اور مجبوری پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ مرے ہوئے کو مارنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔

(۷)

اس کے تیسرے دن سیٹھ گردھاری لال پوجا کے آسن پر بیٹھے ہوئے تھے کہ مہرانے

آ کر کہا۔ "سرکار! کوئی عورت آپ سے ملنے آئی ہے۔" سیٹھ جی نے اندر سے پوچھا۔ "کون عورت ہے"۔ مہرانے جواب دیا۔ "سرکار! مجھے کیا معلوم مگر ہے کوئی امیرزادی۔ ریشمی ساڑھی پہنے ہوئے ہے ہاتھوں میں سونے کے کڑے ہیں، پیر میں ٹاٹ کا سلیپر ہے۔ بڑے گھر کی عورت معلوم ہوتی ہے۔"

یوں بالعموم سیٹھ جی پوجا کے وقت کسی سے نہیں ملتے تھے۔ خواہ کیسا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو، عبادت الٰہی میں مکروہات روزگار کو راہ نہیں دیتے تھے۔ مگر ایسی حالت میں کہ بڑے گھر کی عورت ملنے کے لئے آئے تو تھوڑی سی دیر کے لئے پوجا میں ہرج چنداں قابل شکائت نہیں سمجھتے تھے۔ نوکر سے کہا۔ "بلا لاؤ"۔

جب وہ عورت آئی، تو سیٹھ جی فرط تعظیم سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ بعد ازاں نہائت ملائم رخلیق اور ہمدردانہ لہجہ سے بولے۔ "ماتا کہاں سے آنا ہوا"؟ اور جب یہ جواب ملا، کہ وہ اجودھیا سے آئی ہے تو آپ نے اُسے دوبارہ ڈنڈوت کیا۔ اور قند و شکر سے زیادہ شیریں اور مکھن بالائی سے زیادہ چکنے الفاظ میں بولے۔ "اچھا آپ سری اجودھیا جی سے آرہی ہیں۔ اس نگری کا کیا کہنا۔ دیوتاؤں کی بستی ہے۔ بڑے بھاگ تھے۔ کہ آپ کے درشن ہوئے۔ یہاں آپ کا آنا کیسے ہوا۔"

عورت نے جواب دیا۔ "مکان تو میرا یہیں ہے۔"

سیٹھ جی کا مُنہ پھر کان حلاوت بنا۔ "اچھا تو آپ کا مکان اسی شہر میں ہے؟ تو آپ نے مایا جنجال کو تیاگ دیا؟ وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ ایسی پاک آتمائیں دُنیا میں بہت تھوڑی ہیں۔ ایسی دیویوں کے درشن مُبارک ہوتے ہیں۔ آپ نے مجھے درشن دیئے۔ بڑا احسان کیا۔ میں اس لائق نہیں، کہ آپ جیسی دیویوں کی کچھ خدمت کر سکوں مگر جو کام میرے لائق ہو، جو کچھ میرے لئے ہو سکتا ہو اُس میں مجھے مطلق دریغ نہیں ہے۔ یہاں سیٹھ ساہوکاروں نے مجھے بہت بدنام کر رکھا ہے۔ میں سب کی آنکھوں میں

کھٹکتا ہوں۔ اگر کوئی بزرگ سن رسیدہ آدمی مجھ سے معاملہ کرنے آتا ہے تو یقین مانو مجھے اس کی زبان پھیرتے نہیں بنتی کچھ تو بڑھاپے کا ادب کچھ ان کی دل شکنی کا خوف۔ کچھ یہ خیال کہ کہیں یہ دغابازوں کے پنجے میں نہ پھنس جائیں۔ مجھے ان کی فرمائشوں کی تعمیل پر مجبور کر دیتا ہے۔ میرا اصول ہے۔ کہ اچھی جائداد اور کم سود۔ مگر آپ سے اس قسم کی باتیں فضول ہیں۔ آپ سے تو گھر کا معاملہ ہے۔ میرے لائق جو کچھ کام ہو۔ اس کے لئے بسر و چشم حاضر ہوں۔"

بوڑھی عورت نے کہا۔ "میرا کام آپ ہی سے ہو سکتا ہے۔"

سیٹھ جی (خوش ہو کر) شوق سے کہئے۔"

عورت۔ "میں آپ کے سامنے بھکارنی بن کر آئی ہوں۔ آپ کے سوا کوئی میرا سوال نہیں پورا کر سکتا۔"

سیٹھ جی۔ "شوق سے کہئے۔"

بوڑھی عورت۔ "میرا سوال رد نہ کرنا۔ میں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا"

سیٹھ جی۔ "کہئے کہئے۔"

بوڑھی عورت۔ "آپ رام رکھا کو رہا کر دیجئے۔"

سیٹھ جی کا چہرہ مدھم پڑ گیا۔ سارے ہوائی قلعے جو ابھی ابھی تیار ہوئے تھے۔ منہدم ہو گئے۔ بولے۔ "اس نے مجھے نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا گھمنڈ توڑ کر ہی چھوڑوں گا۔"

ماں۔ "کچھ میرا میرے بڑھاپے کا۔ میرے ہاتھ پھیلانے کا۔ کچھ اپنی بڑائی کا خیال نہ کرو گے بیٹا۔ ماں تا بڑی چیز ہے۔ دنیا سے ناطہ ٹوٹ جائے۔ دھن جائے۔ دھرم جائے مگر لڑکے کی محبت دل سے نہیں جاتی۔ انقلاب زمانہ سب کچھ کر سکتا ہے مگر لڑکے کی محبت ماں کے دل سے نہیں نکال سکتا۔ اس پر حاکم کا۔ بادشاہ کا یہاں تک

کہ ایشور کا بھی بس نہیں ہے۔ تم مجھ پر ترس کھاؤ۔ میرے لڑکے کی جان بخش دو۔ تمہیں بڑا ثواب ہوگا۔ میں جب تک جیوں گی، تمہیں دعا دیتی رہوں گی۔"

سیٹھ جی کا دل کچھ پسیجا۔ پتھر کی تہہ میں پانی رہتا ہے مگر مسز رام رکھا کے اس خط کا خیال آ گیا۔ بولے۔ "مجھے رام رکھا سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اگر انہوں نے مجھے نہ چھیڑا ہوتا تو میں نہ بولتا۔ آپ کے کہنے سے میں اب بھی ان کا قصور معاف کر سکتا ہوں۔ مگر ان کی بیوی نے جو خط میرے پاس بھیجا ہے، اسے دیکھ کر بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ دکھاؤں آپ کو؟"

رام رکھا کی ماں نے خط لے کر پڑھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولی بیٹا۔ اس عورت نے مجھے بہت دکھ دیا ہے۔ اس نے مجھے دیش سے نکال دیا۔ اس کا مزاج اور زبان اس کے قابو میں نہیں۔ مگر اسوقت اس نے تم سے گستاخی کی ہے۔ اس کا تمہیں خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ ہوش کی چٹھی نہیں ہے۔ بیہوشی کا رونا ہے تم اس سے در گزر کرو۔ تمہارا دیش دیش میں نام ہے۔ یہ نیکی تمہارے نام کو اور بھی روشن کرے گی میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ سارا حال رام رکھا سے لکھوا کر کسی مشہور اخبار میں چھپوا دوں گی۔ رام رکھا میرا کہنا نہیں ٹالے گا۔ تمہارے اس احسان کو وہ کبھی نہ بھولے گا۔ جس وقت یہ حالات اخباروں میں چھپیں گے۔ تو ہزاروں آدمیوں کو تمہارے درشن کا شوق ہوگا۔ سرکار میں تمہاری بڑائی ہوگی۔ اور میں سچے دل سے کہتی ہوں کہ تمہیں جلد کوئی نہ کوئی جاگیر مل جائے گی۔ رام رکھا کی انگریزوں سے بہت دوستی ہے۔ وہ اس بات کو کبھی نہ ٹالیں گے۔"

سیٹھ جی کے دل میں گدگدی پیدا ہو گئی۔ اگر اس سلوک سے وہ پاک اور مبارک منزل قریب ہو جائے جس کے لئے ہزاروں خرچ کئے۔ ہزاروں ڈالیاں دیں، ہزاروں سلام بجا لائے۔ ہزاروں خوشامدیں کیں۔ خانساموں کی جھڑکیاں سہیں، بنگلوں کے چکر

لگائے۔

آہ! اس کامیابی کیلئے ایسے ایسے کئی ہزار میں خرچ کر سکتا ہوں، اور مجھے اس کام میں رام رکھا سے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ مگر ان خیالات کو ظاہر کرنے سے کیا فائدہ۔ بولے۔ "ماتا مجھے نام نمود کی بہت پرواہ نہیں ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے نیکی کر اور دریا میں ڈال، مجھے تو آپ کی بات کا خیال ہے۔ جاگیر ملے تو لینے سے انکار نہیں، اور نہ ملے تو اس کی ہوس بھی نہیں ہے۔ مگر یہ تو بتایئے کہ میرے روپوں کا کیا بندوبست ہوگا؟ آپکو معلوم ہوگا کہ میرے دس ہزار روپے آتے ہیں۔" رام رکھا کی ماں نے جواب دیا۔ "تمہارے روپوں کی ضمانت میں کرتی ہوں۔ یہ دیکھو بنک بنگال کی پاس بک ہے۔ اس میں پچیس ہزار روپیہ جمع ہے۔ اس روپے سے تم رام رکھا کو کوئی روزگار کرادو۔ تم اس دکان کے مالک رہو گے۔ رام رکھا کو اس کا منیجر بنا دینا۔ جب تک وہ تمہارے کہنے پر چلے۔ تب تک بنا ورنہ دکان تمہاری ہے۔ مجھے اس میں سے کچھ نہیں چاہیئے۔" یہ کہہ کر پاس بک سیٹھ جی کو دے دی۔ ماں کی اس انتہا محبت نے سیٹھ جی کو پھسلا دیا۔ پانی ابل پڑا اور پتھر اس کے نیچے ڈھک گیا۔ ایسے پاک نظارے دیکھنے کے زندگی میں کب موقعے ملتے ہیں۔ سیٹھ جی کے دل میں فیاضی کی ایک لہر سی اٹھی۔ آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ جس طرح پانی کے بہاؤ سے کبھی کبھی باندھ ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح فیاضی کے اس جوش نے خود غرضی اور دنیاداری کے باندھ کو توڑ دیا۔

پاس بک بوڑھی عورت کو واپس دے کر بولے "ماتا! یہ اپنی کتاب لو۔ مجھے اب زیادہ شرمندہ نہ کرو۔ یہ دیکھو، میں رام رکھا کا نام بہی سے اڑا دیتا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ میں نے اپنا سب کچھ پا لیا۔ آج تمہارا رام رکھا تم کو مل جائے گا۔"

اس واقعہ کے دو سال بعد ٹاؤن ہال میں پھر ایک شاندار جلسہ ہوا۔ بینڈ بج رہا تھا برقیں اور جھنڈیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ شہر کے تمام رؤساء جمع تھے۔ لینڈو فٹن اور موٹروں سے احاطہ بھرا ہوا تھا۔ یکایک ایک مشکی گھوڑوں کی فٹن احاطے میں داخل ہوئی

سیٹھ گردھاری لال عمامہ اور جُبّہ زیب بر کئے اس میں سے اُترے۔ ان کے ساتھ ایک فیشن ایبل نوجوان انگریزی سوٹ پہنے ہوئے مسکراتا ہُوا اترا۔ یہ مسٹر رام رکھا تھے وہ اب سیٹھ جی کی ایک خاص دوکان کے منیجر تھے۔ محض منیجر نہیں بلکہ مینجنگ پروپرائیٹر سمجھنا چاہئے۔ دہلی کے دربار تاجپوشی میں سیٹھ جی کو بھی رائے بہادری کا خطاب عطا ہوا تھا۔ آج مجسٹریٹ ضلع اس کا باقاعدہ اعلان کریں گے۔ اور رؤسائے شہر کی جانب سے سیٹھ جی کو مُبارک دینے کے لئے یہ جلسہ منعقد کیا گیا ہے۔ سیٹھ جی کی طرف سے شکریہ کا اظہار مسٹر رام رکھا کریں گے۔ اور جن لوگوں نے ان کی تقریریں سُنی ہیں۔ وہ بہت بے صبری سے اس موقع کا انتظار کر رہے ہیں۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد جب سیٹھ جی رام رکھا کے ساتھ اپنے مکان پر پہنچے تو معلوم ہُوا کہ آج وہی بوڑھی عورت پھر ان سے ملنے آئی ہے۔ سیٹھ جی دوڑ کر رام رکھا کی ماں کے قدموں سے لپٹ گئے۔ ان کا دل اس وقت دریا کی طرح اُمڈا ہُوا تھا۔

رام رکھا اینڈ فرینڈس کا کارخانہ شکر سازی بہت ترقی پر ہے۔ رام رکھا اب بھی اسی شان سے بسر کر رہے ہیں۔ مگر پارٹیاں کم دیتے ہیں۔ اور دن بھر میں تین سے زیادہ سوٹ نہیں بدلتے۔ وہ اب اس خط کو جو اُن کی بیوی نے سیٹھ جی کو لکھا تھا۔ دُنیا کی ایک بہت بیش بہا چیز سمجھتے ہیں۔ اور مسز رام رکھا کو بھی اب غالباً سیٹھ جی کے نام ونشان مٹنے کی زیادہ آرزو نہیں ہے۔ کیونکہ ابھی سال میں جب ان کے لڑکا پیدا ہُوا تھا۔ تو مسز رام رکھا نے اپنا طلائی کڑا دائی جنائی کی نذر کر دیا تھا۔ اور منوں مٹھائی تقسیم کی تھی۔

یہ سب ہو گیا۔ مگر وہ بات جو اُن ہونی تھی۔ نہ ہوئی۔ رام رکھا کی ماں اب بھی اجودھیا میں رہتی ہیں۔ اور اپنی بہو کی صورت نہیں دیکھنا چاہتیں۔

وکرمادت کا تیغہ

(۱)

بہت زمانہ گزرا۔ ایک روز پشاور کے موضع ماہ نگر میں قدرت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آیا۔ اندھیری رات تھی بستی سے کچھ دور برگد کے ایک سایہ دار درخت کے نیچے ایک شعلہ آتشین نمودار ہوا۔ اور ایک جھلملاتی ہوئی شمع کی طرح نظر آنے لگا۔ گاؤں میں بہت جلد یہ خبر پھیل گئی۔ باشندے یہ عجیب و غریب نظارہ دیکھنے کے لئے جا بجا اکٹھے ہو گئے۔ عورتیں جو کھانا پکا رہی تھیں، ہاتھوں میں گوندھا ہوا آٹا لپیٹے باہر نکل آئیں۔ بوڑھوں نے بچوں کو کندھے پر بٹھا لیا اور کھانستے ہوئے آ کھڑے ہوئے۔ نویلی بہوئیں حیا سے باہر نہ آ سکیں۔ مگر دروازوں کی دراڑوں سے جھانک جھانک کر اپنے بے قرار دلوں کو تسکین دینے لگیں۔ اس گنبد نما درخت کے نیچے تاریکی کے اس انتھاہ سمندر میں روشنی کا یہ دھندلا شعلہ ابر معصیت میں گھری ہوئی روح کی متشکل مثال پیش کر رہا تھا۔

ٹیک سنگھ نے عارفانہ انداز سے سر ہلا کر کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ بھوتوں کی سبھا ہو رہی ہے۔"

پنڈت چیت رام نے عالمانہ یقین کے ساتھ فرمایا۔ "تم کیا جانو؟ میں تہ پر پہنچ گیا۔ سانپ من چھوڑ کر چرنے گیا ہے۔ اس میں جسے شک ہو جا کر دیکھ آئے۔"

منشی گلاب چند بولے۔ "اس وقت جو وہاں جا کر من کو اٹھا لائے۔ اس کے راجہ

ہونے میں شک نہیں، مگر جان جوکھوں ہے۔"

پریم سنگھ ایک بوڑھا جاٹ تھا۔ وہ ان مہاتماؤں کی باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا۔

(۲)

پریم سنگھ دُنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ اس کی ساری عمر معرکہ آرائیوں میں صرف ہوئی تھی مگر جب زندگی کی شام آئی اور وہ صبح کی زندگی کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں پھر آیا، تو اُس کے دل میں ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی۔ افسوس! دُنیا میں میرا کوئی نہیں۔ کاش میرے بھی کوئی بچہ ہوتا۔ جو خواہش شام کے وقت طائروں کو گھونسلوں میں کھینچ لاتی ہے۔ اور جس خواہش سے بے قرار ہو کر جانور شام کو اپنے تھانوں کی طرف چلتے ہیں۔ وہی خواہش پریم سنگھ کے دل میں موجیں مارنے لگی۔ ایسا کوئی نہیں جسے وہ کھانے کے وقت لقمے بنا بنا کر کھلائے۔ ایسا کوئی نہیں جسے وہ رات کے وقت لوریاں سُنا سُنا کر سلائے۔ یہ آرزوئیں پریم سنگھ کے دل میں کبھی نہ پیدا ہوئی تھیں، مگر سارے دن کی تنہائی ایسی غمناک نہیں ہوتی جیسی شام کی۔

ایک روز پریم سنگھ بازار گیا ہوا تھا۔ راستے میں اُس نے دیکھا کہ ایک گھر میں آگ لگی ہوئی ہے آگ کے بلند اور خوفناک شعلے ہوا میں اپنے پھریرے لہرا رہے ہیں۔ اور ایک عورت دروازے پر کھڑی سر پیٹ کر رو رہی ہے۔ یہ غریب بیوہ عورت تھی اُس کا بچہ اندر سو رہا تھا کہ گھر میں آگ لگ گئی۔ وہ دوڑی تھی کہ گاؤں کے آدمیو کو آگ بجھانے کے لئے بلا لے، کہ اتنے میں آگ نے زور پکڑ لیا۔ اور اب شعلہ ہائے سوزاں کا اُمڈا ہوا دریا اُسے اس کے پیارے بچے سے الگ کئے ہوئے تھا۔ پریم سنگھ کے دل میں اس عورت کی دردناک آہیں چبھ گئیں۔ وہ بیخوف آگ میں گھس گیا۔ اور سوتے ہوئے بچے کو گود میں لے کر باہر نکل آیا۔ بیوہ عورت نے بچے کو گود میں لے لیا

اور اس کے نازک رخساروں کو بار بار چوم کر آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ اور بولی۔
"مہاراج! تم جو کوئی ہو۔ میں آج اپنا پیارا بچہ تمہیں بھینٹ کرتی ہوں۔ تمہیں ایشور نے اور بھی لڑکے دیئے ہوں گے۔ انہیں کے ساتھ اس یتیم کی بھی خبر لیتے رہنا۔ تمہارے دل میں رحم اور ترس ہے۔ میرا سب کچھ اگن دیوی نے لے لیا۔ اب اس تن پر کے کپڑے کے سوا میرے پاس اور کوئی چیز نہیں۔ میں مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال لوں گی۔ یہ بچہ اب تمہارا ہے۔"

پریم سنگھ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بولا۔ "بیٹی ایسا نہ کہو۔ تم میرے گھر چلو اور ایشور نے جو کچھ رُوکھا سوکھا دیا ہے، وہ کھاؤ۔ میں بھی دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ کوئی پانی دینے والا نہیں۔ کیا جانے پرماتما نے اسی بہانے سے ہم لوگوں کو ملایا ہو۔"

شام کے وقت جب پریم سنگھ گھر لوٹا۔ تو اس کی گود میں ایک ہنستا ہوا گلگدار بچہ تھا۔ اور پیچھے پیچھے ایک زرد اور مرجھائی ہوئی عورت۔ آج پریم سنگھ کا گھر آباد ہوا۔ آج سے اسے کسی نے شام کے وقت ندی کے کنارے خاموش بیٹھے نہیں دیکھا۔

اسی بچے کے لئے سانپ کا من لانے کا قصد کر کے پریم سنگھ آدھی رات کے وقت کمر سے تلوار لگائے چونک چونک کر قدم رکھتا برگد کے درخت کی طرف روانہ ہوا۔

جب درخت کے نیچے پہنچا تو من کی دمک زیادہ صاف نظر آنے لگی۔ مگر سانپ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پریم سنگھ بہت خوش ہوا۔ سمجھا شاید سانپ کہیں چرنے گیا ہے مگر جب من کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہاں صاف زمین کے سوا اور کوئی چیز نہ دکھائی دی۔ بوڑھے جاٹ کا کلیجہ سُن سے ہو گیا۔ اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یکا یک اُسے اپنے سامنے کوئی چیز لٹکتی ہوئی نظر آئی۔ پریم سنگھ نے تیغہ کھینچ لیا۔ اور اس کی طرف لپکا۔ مگر دیکھا تو وہ برگد کی جٹا تھی۔ اب پریم سنگھ کا خوف بالکل دُور ہو گیا

اُس نے اس جگہ کو جہاں سے روشنی کی رَو نکل رہی تھی ۔ اپنی تلوار سے کھودنا شروع کیا ۔ جب ایک بالشت زمین کھُد گئی تو تلوار کسی چیز سے ٹکرائی اور لَو بھبک اُٹھی ۔ یہ ایک چھوٹا سا تیغہ تھا ۔ مگر پریم سنگھ کے ہاتھ میں آتے ہی اُس کی شمع گوں چمک غائب ہو گئی ۔

(۳)

یہ ایک چھوٹا سا تیغہ تھا ۔ مگر نہایت آبدار ۔ اس کے دستے میں بیش قیمت جواہر جڑے ہوئے تھے ۔ اور دستے کے اُوپر "وکرمادت" منقوش تھا ۔ یہ وکرمادت کا تیغہ تھا اُس وکرمادت کا جو بھارت کا آفتاب بن کر چمکا ۔ جس کے گُن اب تک گھر گھر گائے جاتے ہیں ۔ اس تیغے نے بھارت کے زندہ جاوید تا لیداس کی صحبتیں دیکھی ہیں ۔ جس وقت وکرمادت راتوں کو بھیس بدل کر درد دکھ کی کہانی اپنے کانوں سے سُننے اور جور و جبر کے کرشمے اپنی دردرس آنکھوں سے دیکھنے کیلئے نکلتے تھے ۔ تو یہی تیغہ آبدار اُن کے پہلو کی زینت ہوا کرتا تھا ۔ جس رحیم و انصاف نے وکرمادت کا نام اب تک زندہ رکھا ہے اس میں یہ تیغہ بھی اُن کا ہمدرد اور شریک تھا ۔ یہ اُن کے ساتھ اس تخت پر جلوہ افروز ہوتا تھا ۔ جس پر راجہ بھوج کو بھی بیٹھنا نہ نصیب ہوا ۔

اس تیغے میں غضب کی چمک تھی ۔ مدت دراز تک زمین کے نیچے دفن رہنے پر بھی اس پر زنگ کا نام نہ تھا ۔ اندھیرے گھروں میں اُس سے اُجالا ہو جاتا تھا ۔ رات بھر درخشاں تارے کی طرح جگمگاتا رہتا ۔ جس طرح چاند پردۂ ابر میں چھپ جاتا ہے ۔ مگر اس کی مدھم روشنی چھن چھن کر آتی ہے اسی طرح خلاف کے اندر سے اس تیغے کی شعاعیں شوخ نگاہیاں کیا کرتی تھیں ۔

جب کوئی شخص اُسے ہاتھ میں لے لیتا تو اس کی چمک غائب ہو جاتی تھی ۔ اس کا یہ وصف دیکھ کر لوگ دنگ رہ جاتے تھے ۔

ہندوستان میں ان دنوں شیر پنجاب کی للکار گونج رہی تھی۔ رنجیت سنگھ سخاوت و شجاعت اور رحم و انصاف میں اپنے وقت کے ذکر مادت تھے۔ اُس مغرور کابل کا غرور جس نے صدیوں تک ہندوستان کو سر نہیں اُٹھانے دیا تھا، خاک میں ملا کر لاہور جاتے تھے۔ ماہ نگر کا پُر فضا میدان اور درختوں کا دلاویز جمگھٹ دیکھا۔ تو وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ بازار آراستہ ہو گئے۔ خیمے اور شامیانے نصب کر دیئے گئے۔ جب رات ہوئی تو پچیس ہزار چولھوں کی آگ قندیلیں اور مشعلیں ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا اندھیری رات میں آسمان پر تارے نکل آئے ہیں۔

(۴)

شاہی فرودگاہ سے گانے بجانے کی پُر شور اور پُر جوش آوازیں آ رہی تھیں۔ سکھ سرداروں نے سرحدی مقامات پر صدہا افغانی عورتیں گرفتار کر لی تھیں۔ جیسا ان دنوں لڑائیوں میں عام طور پر ہُوا کرتا تھا۔ وہی عورتیں اس وقت سایہ دار درختوں کے نیچے قدرتی فرش سے سجی ہوئی محفل میں اپنی بے سری تانیں الاپ رہی تھیں اور اہلِ محفل جنہیں نغمہ کا لطف اُٹھانے کی اتنی خواہش نہ تھی۔ جتنی ہنسنے اور خوش ہونے کی، خوب زور زور سے قہقہے لگا لگا کر ہنس رہے تھے کہیں کہیں منچلے سپاہیوں نے سوانگ بھر رکھے تھے۔ وہ چند مشعلیں اور سینکڑوں تماشائیوں کا ہجوم ساتھ لئے ادھر اُدھر خوش فعلیاں کرتے پھرتے تھے ساری فوج کے دلوں میں بیٹھ کر فتح کی دیوی اپنے جلوس دکھا رہی تھی۔

رات کے نو بجے ہوں گے کہ ایک آدمی کالا کمل اوڑھے ایک بالس کا سونٹا لئے شاہی خیمے سے باہر نکلا اور بستی کی طرف آہستہ آہستہ چلا۔ آج ماہ نگر بھی مسرت سے اینڈ رہا ہے۔ دروازوں پر گھی کے چراغوں والے فیتل سوز روشن ہیں۔ دروازوں کے صحن جھاڑ کر صاف کر دیئے گئے ہیں۔ وہ ایک جگہ شہنائیاں بج رہی ہیں اور کہیں کہیں لوگ بھجن

گا رہے ہیں۔ کالی کملی والا مسافر ادھر اُدھر دیکھتا بھالتا گاؤں کی چوپال میں جا پہنچا
چوپال خوب سجی ہوئی تھی۔ اور گاؤں کے معززین بیٹھے ہوئے اس اہم مسئلے پر بحث گرم
رہے تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خدمت میں کونسا تحفہ پیش کیا جائے۔ آج مہاراج
نے اس گاؤں کو اپنے قدموں سے روشن کیا ہے۔ تو کیا اس گاؤں کے بسنے والے مہاراج
کے قدموں کو بوسہ نہ دیں گے۔ ایسے مبارک موقعے کہاں آتے ہیں۔ سب لوگ سر جھکائے
متفکر بیٹھے تھے۔ کسی کی عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ وہاں انمول جواہرات کی کشتیاں کہاں؟
کامل گھنٹہ بھر تک کسی نے سر نہ اُٹھایا۔ یکایک بوڑھا پریم سنگھ کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔
"اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں بکرماجیت کی تلوار نذرانہ کے لئے دے سکتا ہوں۔"

اتنا سنتے ہی سب کے سب آدمی فرطِ مسرت سے اچھل پڑے اور ایک ہلڑ سا مچ
گیا۔ اتنے میں ایک مسافر کالی کملی اوڑھے چوپال کے اندر آیا اور ہاتھ اُٹھا کر بولا۔
"بھائیو! واہ گورو کی جے۔" جیت رام بولے "تم کون ہو؟"

مسافر۔ راہی آدمی ہوں۔ پشاور جانا ہے۔ رات زیادہ آ گئی ہے۔ اس لئے
یہیں لیٹ رہوں گا۔

ٹیک سنگھ۔ ہاں ہاں آرام سے سوؤ۔ چارپائی کی ضرورت ہو تو منگا دوں؟

مسافر۔ نہیں آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ میں اسی ٹاٹ پر لیٹ رہوں گا۔ ابھی آپ لوگ
بکرماجیت کی تلوار کی کچھ باتیں کر رہے تھے۔ یہی سُن کر چلا آیا۔ ورنہ باہر ہی پڑا رہتا۔ کیا
یہاں کسی کے پاس بکرماجیت کی تلوار ہے؟

مسافر کے لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی شریف آدمی ہے۔ اس کی
آواز میں وہ کشش تھی جو کانوں کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتی ہے۔ سب کی آنکھیں اس کی
طرف اُٹھ گئیں۔ پنڈت جیت رام بولے "جی ہاں کچھ عرصہ ہوا۔ مہاراج بکرماجیت کا تیغہ
زمین سے نکالا ہے۔"

مسافر۔ یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ یہ تیغہ اُنہیں کا ہے؟

چیت رام۔ اُس کے دستے پر اُن کا نام کھُدا ہوا ہے۔

مسافر۔ اُن کی تلوار تو بہت بڑی ہوگی؟

چیت رام۔ نہیں۔ وہ تو ایک چھوٹا سا تیغہ ہے۔

مسافر۔ تو پھر اس میں کوئی خاص وصف ہوگا۔

چیت رام۔ "جی ہاں۔ اس کے گُن انمول ہیں۔ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جہاں رکھ دو۔ اسمیں جلتے چراغ کی سی روشنی پیدا ہو جاتی ہے۔"

مسافر۔ "اوہ"!

چیت رام۔ مگر جونہی کوئی آدمی اُسے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اس کی ساری چمک دمک غائب ہو جاتی ہے۔

یہ عجیب بات سُن کر اس مُسافر کی وہی کیفیت ہو گئی۔ جو ایک حیرت انگیز کہانی سُننے سے بچوں کی ہو جایا کرتی ہے۔ اس کی آنکھ اور انداز سے بے صبری ظاہر ہونے لگی۔ جوش سے بولا۔ "کرامات تمہارے پرتاپ پر دھنیہ ہے۔"

ذرا دیر کے بعد پھر بولا۔ "وہ کون بزرگ ہیں جن کے پاس یہ انمول چیز ہے"

پریم سنگھ نے فخریہ انداز سے کہا "میرے پاس ہے۔"

مسافر۔ کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔؟"

پریم سنگھ۔ ہاں۔ میں آپ کو سویرے دکھا دوں گا۔ مگر یہیں ٹھہریئے۔ سویرے تو ہم اُسے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو بھینٹ کریں گے۔ آپ کا جی چاہے تو اسی وقت دیکھ لیجئے۔

دونوں آدمی چوپال سے چل کھڑے ہوئے۔ پریم سنگھ نے مُسافر کو اپنے گھر میں لے جا کر تیغے کے پاس کھڑا کر دیا۔ اس کمرے میں چراغ نہ تھا۔ مگر سارا کمرہ روشنی سے جگمگا

رہا تھا۔ مسافر نے پُرجوش آواز سے کہا۔ "دکرمادت! تمہارے پرتاپ پر دھبہ ہے۔ اتنا زمانہ گزرنے پر بھی تمہاری تلوار کا تیج کم نہیں ہُوا۔"

یہ کہہ کر اس نے فرطِ شوق سے ہاتھ بڑھا کر تیغے کو پکڑ لیا۔ مگر اس کا ہاتھ لگتے ہی تیغے کی چمک جاتی رہی اور کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔

مسافر نے فوراً تیغے کو تخت پر رکھ دیا۔ اس کا چہرہ اب بہت اُداس ہو گیا تھا اُس نے پریم سنگھ سے کہا۔ "کیا تم یہ تیغہ رنجیت سنگھ کو بھینٹ دو گے؟ وہ اسے اسے ہاتھ میں لینے کے قابل نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر مسافر تیزی سے باہر نکل آیا۔ برندا دروازے پر کھڑی تھی۔ مسافر نے اس کے چہرے کی طرف ایک بار غور سے دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ مگر فوج میں شور و غل بدستور جاری تھا۔ ہنگامۂ مسرّت نے نیند کو سپاہیوں کی آنکھوں سے دُور بھگا دیا ہے۔ اگر کوئی انگڑائی لیتا یا اُونگھتا نظر آ جاتا ہے تو اہلِ مجلس اُسے ایک ٹانگ سے کھڑا کر دیتے ہیں۔ لیکایک یہ خبر مشہور ہوئی۔ کہ مہاراج اسی وقت کوچ کریں گے۔ لوگ تعجب میں آ گئے کہ مہاراج نے کیوں اس اندھیری رات میں سفر کرنے کی ٹھانی ہے۔ اس خوف سے کہ فوج کو اسی وقت کوچ کرنا پڑے گا۔ چاروں طرف کھلبلی مچ گئی۔ وہ خود چند آزمودہ کار سرداروں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اس کا سبب کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

جس طرح منڈ ٹوٹ جانے سے تالاب کا پانی قابو سے باہر ہو کر زور شور کے ساتھ بہ نکلتا ہے اسی طرح مہاراج کے جاتے ہی فوج کے افسر اور سپاہی خرمستیاں کرنے لگے۔

(۵)

برندا کو بیوہ ہوئے تین سال گزرے ہیں۔ اس کا شوہر ایک بے فکر اور رنگین مزاج

آدمی تھا۔ گانے بجانے کا اُسے شوق تھا۔ گھر کی جو کچھ جمع جتھا تھی، وہ سرسوتی اور اس کے پجاریوں کو بھینٹ کر دی۔ تین لاکھ کی جائداد تین سال کے لئے بھی کافی نہ ہو سکی مگر اس کا مدعا پورا ہو گیا۔ سرسوتی دیوی نے اُسے دعا دی۔ فن نغمہ میں اُس نے ایسا کمال پیدا کیا کہ اچھے اچھے گُنی استاد اُس کے سامنے زبان کھولتے ڈرتے تھے۔ گانے کا اُسے جس قدر شوق تھا۔ اُتنی ہی محبت اُسے برندا سے تھی۔ اس کی جان اگر گانے میں بستی تھی تو دل برندا کی محبت میں بسر یز تھا۔ پہلے مذاق اور پھر تفریحاً اُس نے برندا کو کچھ گانا سکھایا۔ یہاں تک کہ اس کو بھی اس آبِ حیات کی لذت مل گئی۔ اور اگرچہ اُس کے شوہر کو مرے تین سال گذر گئے ہیں۔ اور اس نے لطائف دُنیا کو خیر باد کہہ دیا ہے یہاں تک کہ کبھی نے اس کے گلاب سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی جھلک نہیں دیکھی مگر گانے کی طرف ابھی تک اُس کی طبیعت مائل تھی۔ اس کی طبیعت جب کبھی ایام رفتہ کی یاد سے اُداس ہوتی ہے تو وہ کچھ گا کر جی بہلا لیتی ہے۔ لیکن گانے سے اُس کا مقصود حظِ نفس نہیں ہوتا۔ بلکہ جب کوئی دلکش راگ الاپنے لگتی ہے تو خیال میں اپنے شوہر کو خوشی سے مسکراتے ہوئے دیکھتی ہے۔ وہی خیالی تصویر اُسے داد دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ گانے سے اُس کا مدعا اپنے جنت نصیب شوہر کی یاد کو تازہ کرنا ہے۔ گانا اُس کے نزدیک پتی دھرم کا نباہ ہے۔

تین پہر رات جا چکی ہے۔ آسمان پر چاند کی روشنی ماند ہو چکی ہے۔ چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ اور اس خیال افزا سناٹے میں برندا زمین پر بیٹھی ہوئی دھیمے سُروں میں گا رہی ہے۔

بتا دے کوئی پریم نگر کی ڈگر

برندا کی آواز میں لوچ بھی ہے اور درد بھی۔ اس میں بے چین دل کو تسکین دینے والی قوت بھی ہے۔ اور سوئے ہوئے جذبات کو جگانے کی طاقت بھی۔ صبح کے

وقت شفق میں سر اٹھائے ہوئے نخل گل پر بیٹھ کر گانے والی بلبل کی چہک میں بھی یہ ملاحت نہیں ہوتی۔ یہ وہ نغمہ ہے جسے سن کر اہل صفا وجد کرنے لگتے ہیں، اس کی تان کانوں کو چھیدتی ہوئی جگر میں جا پہنچتی ہے۔

تبا دے کوئی پریم نگر کی ڈگر
میں پوری یگ یگ سے بھٹکوں کا ہو کی کچھ ناہیں کھبر
تبا دے کوئی پریم نگر کی ڈگر

یکایک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور کئی آدمی پکارنے لگے۔ "کس کا مکان ہے؟ دروازہ کھولو۔" برندا چپ ہو گئی۔ پریم سنگھ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا دروازے کے صحن میں سپاہیوں کا ایک ہجوم تھا۔ دروازہ کھلتے ہی کئی سپاہی دہلیز میں گھس آئے اور بولے۔ "تمہارے گھر میں کوئی گائن رہتی ہے ہم اس کا گانا سنیں گے۔"

پریم سنگھ نے کڑی آواز میں کہا "ہمارے یہاں کوئی گائن نہیں ہے۔"

اس پر کئی سپاہیوں نے پریم سنگھ کو پکڑ لیا اور بولے تیرے گھر سے گانے کی آواز آتی تھی۔

ایک سپاہی۔ تبلاتا کیوں نہیں ہے، کون گا رہا تھا؟

پریم سنگھ۔ میری لڑکی گا رہی تھی۔ مگر وہ گائن نہیں ہے۔

سپاہی۔ کوئی ہو۔ ہم تو آج گانا سنیں گے۔

غصہ سے پریم سنگھ کانپنے لگا۔ ہونٹ چبا کر بولا۔ "یارو ہم نے بھی اپنی زندگی فوج میں کاٹی ہے مگر کبھی ...."

اس ہنگامے میں پریم سنگھ کی بات کسی نے نہ سنی۔ ایک نوجوان جاٹ نے جس کی آنکھیں نشے میں سرخ ہو رہی تھیں للکار کر کہا۔ "اس بڈھے کی مونچھیں اکھاڑ لو۔" برندا آنگن میں پتھر کی مورت کی طرح کھڑی یہ کیفیت دیکھ رہی تھی۔ جب اس

نے دو سپاہیوں کو پریم سنگھ کی مونچھ پکڑ کر کھینچتے دیکھا۔ تو اس سے نہ رہا گیا۔ وہ بےخوف سپاہیوں کے بیچ میں گھس آئی۔ اور بلند آواز میں بولی۔ "کون میرا گانا سننا چاہتا ہے۔؟"

سپاہیوں نے اُسے دیکھتے ہی پریم سنگھ کو چھوڑ دیا اور بولے۔ "ہم سب تیرا گانا سنیں گے۔"

برندا۔ "اچھا بیٹھ جاؤ میں گاتی ہوں۔"

اس پر کئی سپاہیوں نے ضد کی کہ اسے پکڑ پڑاؤ لے چلو۔ وہاں خوب رنگ جمے گا۔"

جب برندا سپاہیوں کے ساتھ پڑاؤ کی طرف چلی تو پریم سنگھ نے کہا۔ "برندا ان کے ساتھ جاتی ہو۔ تو پھر اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔"

برندا جب پڑاؤ پہ پہنچی تو خرمستیوں کا ایک طوفان برپا تھا۔ فتح کی دیوی غنیم کو پامال کرکے اب فاتحوں کی انسانیت اور شرافت کو پاؤں سے کچل رہی تھی۔ حیوانیت کا خونخوار شیر غنیم کے خون سے آسودہ نہ ہو کر اب انسانی جذبات کا خون چوس رہا تھا۔ برندا کو لوگ ایک سجے ہوئے خیمے میں لے گئے۔ یہاں فرشی گلاس روشن تھے۔ اور بادہ آتشیں کے دور چل رہے تھے۔ برندا اس بچہ گوسفند کی طرح جو خونخوار درندوں کے پنجے میں پھنس جاتا ہے۔ فرش کے ایک گوشے پر سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ نفسانیت کا بھوت جو اس وقت دلوں میں اپنی شیطانی فوج آراستہ کئے بیٹھا تھا کبھی آنکھوں کی کمان سے تیر آبرو دز تیر چلاتا۔ اور کبھی منہ کی کمان سے جگر دوز تیروں کی بوچھاڑ کرتا۔ زہریلی شراب میں بجھے ہوئے یہ تیر برندا کے نازک اور پاکیزہ دل کو چھیدتے ہوئے پار ہو جاتے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ "اے دروپدی کی لاج رکھنے والے کرشن بھگوان! تم نے دھرم کے تیدھن سے بندھے ہوئے پانڈوؤں کے ہوتے

ہوئے دروپدی کی لاج رکھی تھی، مَیں تو دُنیا میں بالکل بے کس ہوں. کیا میری لاج نہ رکھوگے؟" یہ سوچتے ہُوئے اُس نے میرا کا یہ مشہور بھجن گایا.

سیام گھو بیر بھر دسو ا لیسو

برندا نے یہ گیت بڑے دِلکش انداز سے گایا. اس کے میٹھے سُروں میں میرا کا انداز پیدا ہو گیا تھا. ظاہری حیثیت سے وہ بادہ نوش سپاہیوں کے روبُرو گا رہی تھی، مگر عالمِ خیال میں وُہ مُرلی والے شیام کے رُو برو ہاتھ باندھے کھڑی اس سے التجا کر رہی تھی.

ذرا دیر کے لئے اُس پُرشور محفل میں عالمِ سکوت طاری ہو گیا. اِنسان کے دِل میں بیٹھے ہُوئے حیوان پر بھی پریم کی یہ دِلسوز صدا اپنا جادُو چلا گئی. نغمہ لطیف فیلِ مست کو بھی رام کر لیتا ہے. پورے گھنٹہ بھر تک برندا نے سپاہیوں کو بے حس و حرکت رکھا. یکایک گھڑیال نے پانچ بجائے. سپاہی اور سردار سب چونک پڑے سب کا نشہ ہرن ہو گیا. چالیس فرسنگ کی منزل طے کرنی ہے. پُھرتی کے ساتھ روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں. خیمے اکھڑنے لگے. سواروں نے گھوڑوں کو دانہ کھلانا شروع کیا. ایک تھا گھڑی تیّار ہو گئی. اُدھر آفتاب نکلا، ادھر فوج نے نقارہ کوچ بجا دیا. شام کو اس میدان کا ایک ایک گوشہ آباد تھا. صبح کو وہاں کچھ بھی نہ تھا. صرف ٹوٹے پھوٹے بکھرے چولھوں کی راکھ اور خیموں کی میخوں کے نشان اس خدم و حشم کی یادگار باقی ہے.

برندا نے جب اہلِ محفل کو روانگی کی تیاریوں میں معرُوف دیکھا تو وہ خیمے سے باہر نکل آئی، کوئی مزاحم نہ ہُوا. مگر اس کا دِل دھڑک رہا تھا، کہ کہیں کوئی آ کر پھر نہ پکڑ لے. جب وہ درختوں کے جُھرمٹ سے باہر پہنچی تو اس کی جان میں جان آئی. بڑا سہانا موسم تھا. ہوائے دلنواز مستانہ وار درختوں کے پتوں پر محوِ خرام تھی اور اُفق

مشرق میں شہ خورشید کے استقبال کے لئے سُرخ مخمل کا فرش بچھایا جا رہا تھا۔ برندا نے آگے قدم بڑھانا چاہا۔ مگر اس کے پاؤں نہ اُٹھے۔ پریم سنگھ کی یہ بات کہ سپاہیوں کے ساتھ جاتی ہو تو پھر اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔ اسے یاد آ گئی۔ اُس نے ایک لمبی سانس لی۔ اور زمین پر بیٹھ گئی۔ دُنیا میں اب اُس کے لئے کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

اُس بے کس چڑیا کی حالت کیسی دردناک ہے جو دل میں شوق پرواز لئے ہُوئے قیدِ صیّاد سے نکل آتی ہے۔ مگر آزاد ہو کر اُسے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بے رحم صیّاد نے اُس کے پروں کو کاٹ دیا ہے وہ درختوں کی سایہ فگن ڈالیوں کی طرف بار بار حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ مگر پر پرواز نہیں کھول سکتی اور ایک بے بسی کے عالم میں سوچنے لگتی ہے کہ کاش صیّاد مجھے پھر اپنے قفس میں قید کر لیتا۔ برندا کی حالت بھی اس وقت ایسی ہی دردناک تھی۔

برندا کچھ دیر تک خیال میں ڈوبی ہوئی بیٹھی رہی۔ پھر وہ اُٹھی اور آہستہ آہستہ پریم سنگھ کے دروازے پر آئی۔ دروازہ کھلا ہُوا تھا۔ مگر وہ اندر قدم نہ رکھ سکی۔ اُس نے در و دیوار کو آرزومند نگاہوں سے دیکھا اور پھر جنگل کی طرف چلی گئی۔

(۶)

شہر لاہور کے ایک ممتاز محلے میں حسین سر راہ ایک خوش قطع صاف ستھرا سہ منزلہ مکان ہے۔ سرسبز اور خوشنما پھولوں والی مادھوری نے اُس کی دیواروں اور محرابوں کو خوب سجا دیا ہے۔ اسی مکان میں ایک امیرانہ انداز سے سجے ہُوئے کمرے کے اندر برندا ایک مخملی قالین پر بیٹھی ہوئی اپنی خوش رنگ اور خوشنوا مینا کو پڑھا رہی ہے۔ کمرے کی دیواروں پر ہلکے سبز رنگ کی قلعی ہے خوشنما دیوارگیریاں خوبصورت تصویریں مناسب موقعوں پر زیب دے رہی ہیں۔ صندل اور خس کی جانفزا خوشبو کمرے میں پھیلی ہُوئی

ہے ۔ ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی پنکھا جھل رہی ہے ۔ مگر اس تکلّف اور سامان عیش کے باوجود برندا کا چہرہ اُداس ہے ۔ اس کا چہرہ اَب اور بھی زرد نظر آتا ہے ۔ مولسری کا پھول مُرجھا گیا ہے ۔

برندا اب لاہور کی مشہور گانے والیوں میں ہے اسے اس شہر میں آئے تین ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے ۔ مگر اتنے ہی دنوں میں اُس نے عام شہرت حاصل کرلی ہے ۔ یہاں اُس کا نام شاما مشہور ہے اتنے بڑے شہر میں جس سے شاما بائی کا پتہ پوچھو وہ یقیناً بتا دے گا ۔ شاما کی آواز اور انداز میں کوئی موہنی ہے جس نے شہر میں ہر خاص و عام کو اپنا شیدائی بنا رکھا ہے ۔ لاہور میں باکمال گانے والیوں کی کمی نہیں ہے ۔ لاہور اس زمانے میں ہر فن اور کمال کا مرکز تھا مگر کوئلیں اور بلبلیں بہت تھیں ۔ شاما صرف ایک تھی ۔ وہ دھرپد زیادہ گاتی تھی ۔ اس لئے لوگ اُسے دھرپدی شاما کہتے تھے ۔

لاہور میں میاں تان سین کے خاندان کے کئی اہل کمال ہیں جو راگ اور راگنیوں میں باتیں کرتے ہیں ۔ وہ شاما کا گانا پسند نہیں کرتے وہ کہتے ہیں کہ شاما کا گانا اکثر غلط ہوتا ہے اُسے راگ اور راگنیوں کی تمیز نہیں ۔ مگر اُن کی حرف گیریوں کا کسی پر کچھ اثر نہیں ہوتا ۔ شاما غلط گائے یا صحیح گائے وہ جو کچھ گاتی ہے لوگ اُسے سن کر مست ہو جاتے ہیں ۔ اس کا راز یہ ہے کہ شاما ہمیشہ دل سے گاتی ہے اور جن جذبات کا وہ اظہار کرتی ہے اُنہیں خود بھی محسوس کرتی ہے ۔ وہ کٹھ پتلیوں کی طرح تلی ہوئی اداؤں کی نقل نہیں کرتی ۔ اب اس کے بغیر محفلیں سونی رہتی ہیں ۔ ہر محفل میں اس کا موجود ہونا لازمی ہو گیا ہے ۔ وہ چاہے اشلوک ہی گائے مگر اس کے بغیر ضیافت طبع کا سامان پورا نہیں ہوتا ۔ تلوار کی باڑھ کی طرح وہ محفلوں کی جان ہے اُس نے عوام کے دلوں میں یہاں تک گھر کرلیا ہے کہ جب وہ اپنی پالکی پر ہوا کھانے نکلتی ہے تو اُس پر چاروں طرف سے پھولوں کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو کابل سے لوٹے ہوئے تین مہینے گذر گئے مگر ابھی تک فتح کی خوشی میں کوئی

جلسہ نہیں ہوا۔ واپسی کے بعد کئی دن تک تو مہاراج کسی وجہ سے اُداس تھے۔ بعدازاں ان کے مزاج میں یکایک ایک تغیر واقع ہوا۔ انہیں کابل کے ذکر سے نفرت سی ہوگئی۔ جو کوئی انہیں اس فتح پر مبارکباد دینے جاتا اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیتے تھے۔ وہ روحانی مسرت جو موقع ماہ نثر ترنگ ان کے چہرے سے جھلکتی تھی۔ اب وہاں نہ تھی۔ تسخیر کابل ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ وہ مہم جو ایک ہزار سال تک ہندو راجاؤں کے امکان خیال سے بھی بعید تھی اُن کے ہاتھوں سر ہوئی۔ جس ملک نے ہندوستان کو ایک ہزار برس تک زیرنگیں رکھا وہاں ہندو قوم کا پھریرا رنجیت سنگھ نے اُڑایا۔ غزنی اور کابل کی پہاڑیاں انسانی خون سے لال ہوگئیں مگر رنجیت سنگھ خوش نہیں ہیں۔ اُن کے مزاج کی کایا پلٹ کا راز کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر کچھ سمجھتے ہیں تو پرندا سمجھتی ہے۔

تین مہینے تک مہاراج کی یہی کیفیت رہی۔ بعدازاں ان کا مزاج اپنے اصلی رنگ پر آنے لگا۔ ہواخواہان دربار اس موقع کے منتظر تھے۔ ایک روز اُنہوں نے مہاراج سے ایک شاندار جلسہ کرنے کی استدعا کی۔ پہلے تو وہ برہم ہوئے مگر بآخر مزاج شناسوں کی گھاتیں اپنا کام کر گئیں۔

جلسے کی تیاریاں وسیع پیمانے پر کی جانے لگیں۔ شاہی رقص گاہ کی سجاوٹ ہونے لگی پٹنہ، بنارس، لکھنؤ، گوالیار، دہلی اور پونا کی نامور طوائفوں کو پیغام دیئے گئے۔ پرندا کو بھی دعوت ملی۔ آج ایک مدت کے بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔

جلسے کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ لاہور کی گزرگاہوں پر خوشرنگ جھنڈیاں لہرانے لگیں چاروں طرف سے نواب اور راجے شاہانہ احتشام کے ساتھ سج سج کر آنے لگے۔ ذی شعور فراشوں نے رقص گاہ کو ایسے حسن لیاقت سے آراستہ کیا تھا کہ اُسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ عشرت کا آرام گاہ ہے۔

شام کے وقت دربار شاہی آراستہ ہوا۔ مہاراجہ صاحب تخت زرنگار پر جلوہ

افروز ہوئے۔ نواب اور راجے۔ امراء رؤسا ہاتھی گھوڑوں پر سوار اپنی سج دھج دکھاتے ہوئے ایک جلوس بنا کر مہاراج کی قدم بوسی کو چلے سڑک پر دو رویہ تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ خوشی کو رنگوں سے بھی کوئی گہرا تعلق ہے۔ جدھر نظر اُٹھتی تھی۔ رنگوں کی کیفیت دکھائی دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوئی امڈی ہوئی ندی خوش رنگ پھولوں کی کیاریوں سے بہتی چلی آتی ہے۔

مسرّت کے جوش میں کبھی کبھی لوگ تہذیب سے گری ہوئی حرکتیں بھی کر بیٹھتے تھے۔ ایک پنڈت جی مرزائی پہنے سر پر گول ٹوپی رکھے تماشا دیکھنے میں مصروف تھے۔ کسی شریر آدمی نے ان کی توند پر ایک چمگادڑ چپٹا دی۔ پنڈت جی بے تحاشا توند مٹکاتے ہوئے بھاگے بڑا قہقہہ پڑا۔ ایک اور مولوی صاحب نیچی اچکن پہنے ایک دکان پر کھڑے تھے۔ دکاندار نے کہا مولوی صاحب آپ کو کھڑے کھڑے تکلیف ہوتی ہے۔ یہ کرسی رکھی ہوئی ہے۔ بیٹھ جائیے۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے۔ سوچنے لگے کہ شاید میرے لبترے سے رعب ٹپک رہا ہے۔ ورنہ دکاندار کرسی کیوں دیتا۔ دکاندار غضب کے مردم شناس ہوتے ہیں۔ ہزاروں آدمی کھڑے ہیں۔ مگر اُس نے کسی سے بیٹھنے کی استدعا نہ کی۔ مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھے مگر بیٹھتے ہی پیچھے کی طرف لڑھکے اور نیچے بہتی ہوئی نالی میں گر پڑے۔ سارے کپڑے لت پت ہو گئے۔ دکاندار کو ہزاروں بے نقط سنائیں۔ بڑا قہقہہ پڑا۔ کرسی تین ہی ٹانگ کی تھی۔

ایک جگہ کوئی افیونی صاحب تماشا دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ جھکی ہوئی کمر، پیلا منہ، سر کی چھدری خانہ لفیں اور داڑھی کے بال مہندی سے رنگے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں سُرمہ بھی تھا آپ بڑے غور سے مصروف سیر تھے۔ اتنے میں ایک حلوائی سر پر خوانچہ رکھے ہوئے آیا اور بولا خاں صاحب! جمعرات کی گلاب والی ریوڑیاں ہیں۔ آج پیسے کی آدھ پاؤ لگا دیں۔ کھا لیجئے ورنہ پچھتائیے گا۔ افیونی صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مگر پیسے نہ تھے۔ کف افسوس مل کر رہ گئے۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ گلاب والی ریوڑیاں اور پیسے میں آدھ پاؤ! نہ ہوئے

پیسے نہیں تو سیروں تلا بیٹھے۔ حلوائی تاڑ گیا۔ بولا۔ آپ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ پیسے پھر مل جائیں گے۔ آپ کوئی غیر معتبر آدمی تھوڑا ہی ہیں۔" فیونی صاحب کی باچھیں کھل گئیں رنگ پھڑک اُٹھی۔ آپ نے پاؤ بھر ریوڑیاں لیں اور جی میں کہا۔ اب پیسے دینے والے پر لعنت ہے۔ گھر سے نکلوں گا ہی نہیں تو پیسے کیا ہوں گے۔ اپنے رومال میں ریوڑیاں لیں۔ دل عاشق میں صبر کہاں۔ مگر جوں ہی پہلی ریوڑھی زبان پر رکھی تلملا گئے۔ پاگل کتے کی طرح پانی کی تلاش میں ادھر اُدھر دوڑنے لگے۔ آنکھ اور ناک سے پانی بہنے لگا۔ آدھا منہ کھول کر ٹھنڈی ہوا سے زبان کی جلن بجھانے لگے۔ جب ہوش بجا ہوئے تو حلوائی کو ہزاروں صلواتیں سُنائیں۔ اس پر بھی لوگ خوب ہنسے خوشی کے موقعوں پر ایسی بے ضرر شرارتیں اکثر ہُوا کرتی ہیں۔ اور اُنہیں لوگ معاف کر دینے کے قابل سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ کھولتی ہوئی ہانڈی سے کے اُبال ہیں۔

رات کے نو بجے سردگاہ میں جگمگھٹ ہُوا۔ سارا قصر نیچے سے اُوپر تک خوش رنگ ہانڈیوں میں اور فانوسوں سے جگمگا رہا تھا۔ اُور جھاڑوں کی بہار تھی۔ ایک باکمال کاریگر نے رنگ شالہ کے بیچوں بیچ فضا میں معلق تھما ہُوا ایک فوارہ لگایا تھا۔ جس کے سوراخوں سے خس، کیوڑہ، گلاب اور صندل کا عرق ہلکی پھواروں میں برس رہا تھا۔ محفل میں عنبریں طراوت پھیلی ہُوئی تھی۔ خوشی اپنی سکھیوں سمیت خوشیاں منا رہی تھی۔

دس بجے مہاراجہ رنجیت سنگھ تشریف لائے۔ اُن کے بدن پر تن زیب کی ایک سفید اچکن تھی۔ اُور سر پر ترچھی پگڑی بندھی ہوئی۔ جس طرح آفتاب شفق کی خوش رنگ آرائشوں سے پاک رہ کر اپنی پوری روشنی دکھا سکتا ہے اُسی طرح ہیرے اور جواہرات دیبا و حریر کی پُر تکلف سجاوٹ سے مبرا ہو کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کا جلال پوری تیزی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ چند نامور شعراء نے مہاراج کی شان میں اسی موقع کیلئے قصیدے کہے تھے۔ مگر حاضرین کے چہروں سے ان کے دلوں میں جوش کھاتا ہُوا شوق نغمہ دیکھ کر مہاراج

نے گانا شروع کرنے کا حکم دیا۔ طبلے پر تھاپ پڑی۔ سازندوں نے سُر ملایا۔ نیند سے جھپکتی ہُوئی آنکھیں کھُل گئیں اور گانا شروع ہوگیا۔

(۷)

اس شاہی محفل میں رات بھر نغمہ لطیف کی بارش ہوتی رہی۔ بیلہ اور موتیا، دلیس اور بھاگ کے طرب ناک جھونکے چلتے رہے۔ رقاصانِ دل نواز نے باری باری اپنا جوہرِ کمال دکھایا کسی کی پُرناز ادائیں دِلوں میں کھُب گئیں۔ کسی کا تھرکنا قتلِ عام کر گیا۔ کسی کی رسیلی تانوں پر واہ واہ مچ گئی۔ ایسی طبعیتیں بہت کم تھیں، جنہوں نے خلوص کے ساتھ گانے کا پاکیزہ لطف اُٹھایا ہو۔

چار بجے ہوں گے جب شاما کی باری آئی۔ تو حاضرین سنبھل بیٹھے۔ فرطِ شوق سے لوگ آگے کھسکنے لگے۔ خمار سے بھری ہوئی آنکھیں چونک پڑیں۔ برندا محفل میں آئی اور سر جھُکا کر کھڑی ہوگئی۔ اُسے دیکھ کر لوگ حیرت میں آگئے۔ اُس کے جسم پر نہ آبدار گہنے تھے نہ خوش رنگ بھڑکیلی پشواز، وہ صرف ایک گیروے رنگ کی ساری پہنے ہوئے تھی۔ جس طرح ورقِ گلاب پر ڈوبتے ہُوئے آفتاب کی سنہری کرن چمکتی ہے، اسی طرح اُس کے گلابی ہونٹوں پر مُسکراہٹ جھلکتی تھی۔ اس کا تکلف سے پاک حسن اپنی قدرتی آرائش کی شان دکھا رہا تھا۔ اصلی حسن مشاطہ کی فسوں سازیوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ نظارۂ فطرت سے رُوح کو جو حظ اور سرور حاصل ہوتا ہے، وہ پُر تکلف باغیچوں کی سیر سے ممکن نہیں، برندا نے گایا۔

"سب دِن ناہیں برابر جات"

یہ گیت اس سے پہلے بھی لوگوں نے سُنا تھا۔ مگر اس وقت کا سا اثر کبھی دِلوں پر نہیں ہُوا تھا۔ کسی کے سب دن برابر نہیں جاتے، یہ کہاوت روز سُنتے تھے۔ آج اس کے معنے سمجھ میں آئے، کسی رئیس کو وہ دن یاد آیا، جب وہ خود تاجدار تھا۔ آج وہ ایک

اطاعت گذار ہے۔ کبھی تو اپنے بچپن کا آغوش ناز یاد آیا۔ کبھی کو وہ زمانہ یاد آیا۔ جب وہ زندگی کے دلفریب خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر افسوس اب وہ خود خواب پریشان ہو گیا ہے۔ برندا بھی گذرے ہوئے دنوں کو یاد کرنے لگی۔ ایک دن وہ تھا۔ کہ اُس کے دروازے پر عطائیوں اور گانے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اور دل میں خوشیوں کا! اور آج! آہ آج! اس سے آگے برندا کچھ نہ سوچ سکی۔ دونوں حالتوں کا مقابلہ نہایت دل شکن۔ نہایت یاس انگیز تھا۔ اس کی آواز بھاری ہو گئی۔ اور رقت سے گلا بیٹھ گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ شاما کے طرز و انداز کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی تیز نگاہیں اس کے دل میں پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لوگ متحیر تھے۔ کہ کیوں ان کی زبان سے تعریف اور قدردانی کا ایک کلمہ بھی نہ نکلا۔ وہ خوش نہ تھے۔ غمگین بھی نہ تھے۔ وہ خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قیافہ انہیں بتا رہا تھا۔ کہ یہ عورت ہرگز ادا فروش نہیں ہے۔ یکایک وہ اُٹھے اور بولے شاما! جمعرات کو میں پھر تمہارا گانا سنوں گا۔

(۸)

برندا کے چلے جانے کے بعد اُس کا گلعذار بچہ راجہ اُٹھا۔ اور آنکھیں ملتا ہوا بولا "اماں کہاں ہے؟" پریم سنگھ نے اُسے گود میں لے کر کہا۔ "اماں مٹھائی لینے گئی ہے۔"

راجہ خوش ہو گیا۔ باہر جا کر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ مگر کچھ دیر کے بعد پھر بولا "اماں! مٹھائی۔" پریم سنگھ نے مٹھائی لا کر دی۔ مگر راجہ رو رو کر کہتا رہا۔ اماں مٹھائی وہ شاید سمجھا تھا۔ کہ اماں کی مٹھائی اس مٹھائی سے زیادہ میٹھی ہو گی۔

آخر پریم سنگھ نے اُسے کندھے پر چڑھا لیا۔ اور دوپہر تک کھیتوں میں گھومتا رہا راجہ کچھ دیر تک چپکا رہتا۔ اور پھر چونک کر پوچھنے لگتا۔ "اماں کہاں؟"

بوڑھے سپاہی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ بچے کے پاس سے ایک دم کو بھی کہیں نہ جاتا۔ اور اُسے باتوں میں لگائے رہتا۔ کہ کہیں وہ پھر نہ پوچھ بیٹھے۔ اماں کہاں ہے

بچّوں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ راجا کئی دِن تک بے قرار رہا۔ آخر رفتہ رفتہ ماں کی یاد اُس کے دِل سے مِٹ گئی۔

اِس طرح تین مہینے گذر گئے۔ ایک روز شام کے وقت راجا اپنے دروازے پر کھیل رہا تھا کہ برندا آتی ہوئی دِکھائی دی۔ راجا نے اُس کی طرف غور سے دیکھا۔ ذرا جھجکا۔ پھر دوڑ کر اُس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اور بولا۔ "اماں آئی۔ امّاں آئی"۔

برندا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اُس نے راجا کو گود میں اُٹھا لیا اور کلیجے سے لگا کر بولی۔ "بیٹا! ابھی میں نہیں آئی پھر کبھی آؤں گی"۔

راجا اس کا مطلب نہ سمجھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا گھر کی طرف چلا۔ ماں کی کشش برندا کو دروازے تک لے گئی۔ مگر چوکھٹ سے آگے نہ لے جا سکی۔ راجا نے بہت کھینچا مگر وہ آگے نہ بڑھی۔ تب راجا کی بڑی بڑی آنکھیں آبگوں ہو گئیں۔ اس کے ہونٹ پھیل گئے اور وہ رونے لگا۔

پریم سنگھ اس کا رونا سُن کر باہر نِکل آیا۔ دیکھا تو برندا کھڑی ہے۔ چونک کر بولا۔ "برندا" مگر برندا کچھ جواب نہ دے سکی۔

پریم سنگھ نے پھر کہا۔ "باہر کیوں کھڑی ہو۔ اندر آؤ۔ اب تک کہاں تھیں؟"

برندا نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اندر نہ آؤں گی"۔

پریم سنگھ۔ آؤ۔ آؤ۔ اپنے بوڑھے باپ کی باتوں کا بُرا نہ مانو۔

برندا۔ نہیں دادا۔ میں اندر قدم نہیں رکھ سکتی۔

پریم سنگھ۔ کیوں؟

برندا۔ پھر کبھی بتاؤں گی۔ میں تمہارے پاس وہ تیغہ لینے آئی ہوں۔

پریم سنگھ نے حیرت میں آکر پوچھا۔ "اُسے لے کر کیا کرو گی؟"

برندا۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں گی۔

پریم سنگھ۔ کس سے؟
برندا۔ رنجیت سنگھ سے۔

پریم سنگھ زمین پر بیٹھ گیا۔ اور برندا کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ پھر بولا۔
برندا! تمہیں موقع کیوں کر ملے گا؟"
برندا۔ کبھی کبھی خاک کے ساتھ اُڑ کر چیونٹی بھی آسمان تک جا پہنچتی ہے"۔
پریم سنگھ۔ مگر تیری تیر سے کیونکر لڑے گی؟
برندا۔ اسی تیغے سے۔
پریم سنگھ۔ اس تیغے نے کبھی چھپ کر خون نہیں کیا۔
برندا۔ دادا یہ دکھیا دت کا تیغہ ہے اس نے ہمیشہ دُکھیاروں کی مدد کی ہے۔
پریم سنگھ نے تیغہ لا کر برندا کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ برندا اُسے پہلو میں چھپا کر جس طرف سے آئی تھی اُسی طرف چلی گئی۔ سورج ڈوب گیا تھا۔ مغرب کے اُفق میں روشنی کا کچھ کچھ نشان باقی تھا۔ اور گائیں اپنے بچھڑوں کو دیکھنے کے لئے مرغزار سے دوڑتی پُرشوق آواز سے ممیاتی چلی آتی تھیں اور برندا اپنے نیچے کو روتا چھوڑ کر شام کے تاریک خوف ناک جنگل کی طرف جا رہی تھی۔

(۹)

جمعرات کا دن ہے۔ رات کے دس بج چکے ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی عشرت گاہ میں رونق افروز ہیں۔ ایک سات بتیوں والا جھاڑ روشن ہے۔ گویا عروس تیمع اپنی سہیلیوں کے ساتھ شبنم کا نقاب مُنہ پر ڈالے ہوئے محو ناز ہے۔ مہاراجہ کے سامنے برندا گیروے رنگ کی ساری پہنے ہوئے بیٹھی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بین ہے۔ اسی پر وہ ایک دلاویز نغمہ الاپ رہی ہے۔

مہاراج بولے۔ "شاما! میں تمہارا گانا سُن کر بہت خوش ہوا۔ تمہیں کیا انعام

دُوں۔؟"

شاما نے ایک انداز سے سر جھکا کر کہا۔ "حضور کے اختیار میں سب کچھ ہے"

رنجیت سنگھ۔ جاگیر لوگی ؟

شاما۔ ایسی چیز دیجئے جس سے آپ کا نام ہو جائے۔

مہاراج نے برندا کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی سادگی کہہ رہی تھی کہ وہ مال و زر کو کچھ نہیں سمجھتی۔ اس کی نگاہ کی پاکیزگی اور انداز کی متانت صاف بتا رہی تھی کہ وُہ نازِ فرش نہیں ہے۔ پھر پوچھا کوہ نور لوگی ؟

شاما۔ وُہ حضور کے تاج میں زیادہ زیب دیتا ہے۔

مہاراج متحیّر ہو کر بولے۔ "تم خود مانگو"

شاما۔ ملے "گا ؟"

رنجیت سنگھ۔ ہاں۔

شاما۔ مجھے خونِ انصاف عطا ہو۔

مہاراج رنجیت سنگھ چونک پڑے۔ برندا کی طرف پھر غور سے دیکھا اور سوچنے لگے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ انصاف تو خون کا پیاسا نہیں ہوتا۔ یہ عورت ضرور کسی ظالم رئیس راجہ کے دست بیداد سے نالاں ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس کا شوہر کہیں کا راجہ ہو۔ ضرور ایسا ہی ہے۔ اُسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔ انصاف کو خون کی پیاس اُسی حالت میں ہوتی ہے۔ اسی وقت انصاف خونخوار جانور ہو جاتا ہے۔ مَیں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جو کچھ مانگے گی وُہ دُوں گا۔ اُس نے ایک بیش قیمت چیز مانگی ہے۔ خونِ انصاف وُہ اُسے ملنا چاہیئے۔ مگر کس کا خُون ؟

راجہ نے پھر پہلو بدل کر سوچا۔ کس کا خون؟ یہ سوال میرے دل میں نہ پیدا ہونا چاہیئے۔ انصاف جس کا خون مانگے، اُس کا خُون مجھے دینا چاہیئے۔ انصاف کے نزدیک

سب کا خون برابر ہے۔ مگر انصاف خون کا مستحق ہے؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ کینے کے بخار سے بھرے ہوئے انسان کے ہاتھ میں اس کا فیصلہ نہیں رہنا چاہیئے۔ اکثر ایک کڑی بات ایک دِل جلا دینے والا طعنہ انسان کے دل میں خون کی پیاس پیدا کر دیتا ہے۔ اس طعنہ دلسوز کی آگ اُس وقت تک نہیں بجھتی جب تک اس پر خون کے چھینٹے نہ دیئے جائیں۔ میں نے زبان دے دی ہے۔ غلطی ہوئی۔ پوری روداد سُنے بغیر میں ہرگز اس امر کا مجاز نہیں کہ خون انصاف کا وعدہ کروں۔ ان خیالات نے راجہ کو کئی منٹ تک محو رکھا۔ آخر وہ بولے "شاما! تم کون ہو؟"

برندا۔ ایک بے کس عورت۔

راجہ۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟

برندا۔ ماہ نگر میں۔

رنجیت سنگھ نے برندا کو پھر غور سے دیکھا۔ کئی مہینے پہلے رات کے وقت ماہ نگر میں ایک بھولی بھالی عورت کی جو تصویر دل میں کھنچی تھی، وہ اس عورت سے بہت کچھ ملتی تھی۔ اُس وقت نگاہیں اتنی بیباک نہ تھیں اُس وقت آنکھوں میں شرم کی آب تھی۔ اب شوخی کی جھلک ہے۔ تب سچا موتی تھا۔ اب جھوٹا ہو گیا ہے۔

مہاراج بولے "شاما! انصاف کس کا خون چاہتا ہے؟"

برندا۔ جیسے آپ قصوروار ٹھہرائیں۔ جس دن حضور نے رات کو ماہ نگر میں پڑاؤ کیا تھا۔ اسی رات کو آپ کے سپاہی مجھے بزور کھینچ کر ڈیرہ پر لائے۔ اور مجھے اس قابل نہیں رکھا کہ لوٹ کر اپنے گھر جا سکوں۔ مجھے ان کی ناپاک نگاہوں کا نشانہ بننا پڑا۔ ان کی بیباک زبانوں نے ان کے شرمناک اشاروں نے میری عزت خاک میں ملا دی۔ آپ وہاں موجود تھے۔ اور آپ کی بے کس رعیت پر یہ ظلم کیا جا رہا تھا۔ کون مجرم ہے؟ انصاف کس کا خون چاہتا ہے؟ اس کا فیصلہ آپ کریں۔

رنجیت سنگھ زمین پر آنکھیں گاڑے سُنتے رہے۔ بیرندا نے ذرا دم لے کر پھر کہنا شروع کیا۔ میں بیوہ عورت ہوں۔ میری عزّت کے پاسبان، میری آبرو کے محافظ آپ ہیں۔ پتی بیوگ کے ساڑھے تین سال میں نے تپسوی بن کر کاٹے تھے۔ مگر آپ کے آدمیوں نے میری تپسیا خاک میں ملا دی۔ میں اِس قابل نہیں کہ لوٹ کر اپنے گھر جا سکوں۔ اپنے بچے کیلئے میری گردن نہیں کھلتی۔ اپنے بوڑھے باپ کے سامنے میری گردن نہیں اُٹھتی۔ میں اب اپنے گاؤں کی عورتوں سے آنکھیں چراتی ہوں۔ میری عزّت لٹ گئی۔ عورت کی عزت کتنی قیمتی چیز ہے۔ اسے کون نہیں جانتا۔ ایک عورت کی عزت کے پیچھے لنکا کا شاندار راج مٹ گیا۔ ایک ہی عورت کی عزّت کیلئے کورو نبس کا ناس ہو گیا۔ عورتوں کی عزت کیلئے ہمیشہ خون کی ندیاں بہی ہیں۔ اور راج اُلٹ گئے ہیں۔ میری عزّت آپ کے آدمیوں نے لی ہے اس کا جواب دہ کون ہے۔ انصاف کس کا خون چاہتا ہے۔ اس کا فیصلہ آپ کریں۔

بیرندا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک دہقان عورت کا یہ حوصلہ، یہ خیال اور یہ جوشیلی تقریر دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔ کانچ کا ٹکڑا ٹوٹ کر تیز دھار والا چھرا ہو جاتا ہے۔ وہی کیفیت انسان کے ٹوٹے ہوئے دل کی ہے۔

آخر مہاراج نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور حسرت ناک لہجے میں بولے "شاما! انصاف جس کا خون چاہتا ہے وہ میں ہوں"۔

اتنا کہنے کے ساتھ مہاراج رنجیت سنگھ کا چہرہ بھبک اُٹھا اور ان پر ایک جذبہ کا عالم طاری ہو گیا۔ فوری جذبات سے مخمور ہو کر انسان کا دل عرش کی بلندیوں تک جا پہنچتا ہے۔ کانٹے کے چُبھنے سے کراہنے والا انسان اسی نشے سے مست ہو کر خنجر کی نوک سینے میں چبھو لیتا ہے۔ پانی کی بوچھاڑ سے ڈرنے والا انسان گلے گلے پانی میں اکڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اس عالم میں انسان کا دل ایک غیر معمولی قوت اور بے انتہا جوش محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسی عالم میں انسان سے ادنٰے ترین حرکتیں سرزد ہوتی ہیں اور اسی عالم میں

انسان اپنے قول و فعل کی بلندی سے دیوتاؤں کو بھی شرمندہ کر دیتا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ بیتاب ہو کر اُٹھ کھڑے ہُوئے اور بلند آواز سے بولے "شاما! انصاف جس کا خون چاہتا ہے وُہ میں ہوں! تمہارے ساتھ جو ظُلم ہوا ہے، اُس کا جواب دِہ میں ہوں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ ایشور کے نزدیک راجہ اپنے ملازموں کی سختی و زبردستی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

یہ کہکر راجہ نے تیزی کے ساتھ اچکن کے بند کھول دیئے اور برندا کے سامنے گھُٹنوں کے بل سینہ پھیلا کر بیٹھتے ہُوئے بولے۔

"شاما! تمہارے پہلو میں تلوار چھپی ہوئی ہے، وہ درگا ماتا کی تلوار ہے۔ اُس نے کتنی ہی بار انصاف کی حمائیت کی ہے۔ آج ایک بدقسمت راجہ کے خون سے اس کی پیاس بجھا۔ وہ بے شک وہ راجہ بدنصیب ہے، جس کے راج میں بے کسوں پر ظُلم ہوتا ہے۔

برندا کے دِل میں اب ایک زبردست تبدیلی پیدا ہُوئی، جوشِ انتقام نے محبّت اور احترام کو جگہ دی۔ رنجیت سنگھ نے اپنی ذمہ داری تسلیم کر لی۔ وہ اُس کے سامنے ایک مجرم کی حیثیت میں تیغِ انصاف کا نشانہ بننے کیلئے کھڑے ہیں، ان کی جان اب اُس کی مُٹھی میں ہے۔ اُنہیں مارنا یا جلانا اب اُس کا اختیار ہے۔

یہ خیالات اس کا جوشِ انتقام ٹھنڈا کر دینے کے لئے کافی تھے۔ ثروت اور عشمت جب اپنے تخت زر نگار سے اُتر کر دستِ ترحّم کی خواستگار ہوتی ہے تو کون ایسا دِل ہے جو پسیج نہ جائے گا؟ برندا نے دِل پر جبر کر کے پہلو سے خنجر نکالا، مگر وار نہ کر سکی، تلوار اس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر گر پڑی۔

مہاراج رنجیت سنگھ سمجھ گئے۔ کہ عورت کی ہمّت دغا دے گئی۔ وہ بڑی تیزی سے لپکے اور تیغے کو ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ یکایک داہنا ہاتھ مجذوبانہ جوش کے ساتھ اُوپر کو اُٹھا وہ ایک بار زور سے بولے "واہ گُرو کی جے"، اور قریب تھا کہ سینہ تلوار کے ہم

آغوش ہو۔ بجلی کوند کر سینہ ابر میں گھسنے ہی والی تھی، کہ برندا ایک چیخ مار کر اُٹھی اور راجہ کے اُوپر ہوئے ہاتھ کو اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا۔ رنجیت سنگھ نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑانا چاہا، مگر کمزور عورت نے اُن کے ہاتھ کو اس طرح جکڑ رکھا، جیسے محبّت دِل کو جکڑ لیتی ہے۔ بے بس ہو کر بولے "شاما! انصاف کو اپنی پیاس بجھانے دو۔"

شاما نے کہا۔ "مہاراج! اس کی پیاس بجھ گئی، یہ تلوار اس کی گواہ ہے۔"

مہاراج نے تیغہ کو دیکھا۔ اس وقت اس میں دوزخ کے چاند کی چمک نہ تھی بلکہ انصاف کے چمکتے ہوئے سورج نے اس چاند کو منوّر کر دیا تھا۔

بڑے گھر کی بیٹی

(۱)

بینی مادھو سنگھ موضع گوری پور کے زمیندار اور نمبردار تھے۔ ان کے بزرگ کسی زمانے میں بڑے صاحب ثروت تھے۔ پختہ تالاب اور مندر انہیں کی یادگار تھی۔ کہتے ہیں اس دروازے پر پہلے ہاتھی جھومتا تھا۔ اس ہاتھی کا موجودہ نعم البدل ایک بوڑھی بھینس تھی۔ جس کے بدن پر گوشت تو نہ تھا، مگر شاید دودھ بہت دیتی تھی۔ کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لئے اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ بینی مادھو سنگھ نے نصف سے زائد جائداد وکیلوں کی نذر کی۔ اور اب ان کی سالانہ آمدنی ایک ہزار سے زائد نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب کے دو بیٹے تھے بڑے کا نام سری کنٹھ سنگھ تھا۔ اس نے ایک مدت دراز کی جانکاہی کے بعد بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اور اب ایک دفتر میں نوکر تھا۔ چھوٹا لڑکا لال بہاری سنگھ دوہرے بدن کا سجیلا جوان تھا۔ بھرا ہوا چہرہ، چوڑا سینہ، بھینس کا دو سیر تازہ دودھ ناشتہ کر جاتا تھا۔ سری کنٹھ اس سے بالکل متضاد تھے۔ ان ظاہری خوبیوں کو انہوں نے دو انگریزی حروف بی۔ اے پر قربان کر دیا تھا۔ انہیں دو حرفوں نے ان کے سینے کی کشادگی، قد کی بلندی، چہرے کی چمک سب ہضم کر لی تھی۔ یہ حضرت اب اپنا وقت فرصت طب کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ آیورویدک دواؤں پر زیادہ عقیدہ تھا۔ شام سویرے ان کے کمرے سے اکثر کھرل کی خوشگوار پیہم صدائیں سنائی دیا کرتی تھیں۔ لاہور اور کلکتہ کے ویدوں سے بہت خط و کتابت رہتی تھی۔

سری کنٹھ اس انگریزی ڈگری کے باوجود انگریزی معاشرت کے بہت مدّاح نہ تھے، بلکہ اس کے برعکس وہ اکثر بڑی شدّ و مد سے اس کی مذمّت کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے گاؤں میں اُن کی بڑی عزّت تھی۔ دسہرے کے دنوں میں وہ بڑے جوش سے رام لیلا میں شریک ہوتے۔ اور خود ہر روز کوئی نہ کوئی روپ بھرتے۔ اُنہیں کی ذات سے گوری پور میں رام لیلا کا وجود ہوا۔ پرانے رسم و رواج کا اُن سے زیادہ پُرجوش وکیل مشکل سے کوئی ہوگا۔ خصوصاً مشترکہ خاندان کے وہ زبردست حامی تھے۔ آج کل بہوؤں کو اپنے کنبے کے ساتھ مل جل کر رہنے میں جو وحشت ہوتی ہے اُسے وہ ملک اور قوم کے لئے فال بد خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں کی بہوئیں اُنہیں مقبولیت کی نگاہ سے نہ دیکھتی تھیں۔ بعض بعض شریف زادیاں تو انہیں اپنا دشمن سمجھتیں۔ خود انہیں کی بیوی اُن سے اس مسئلہ پر اکثر زور شور سے بحث کرتی تھیں۔ مگر اس وجہ سے نہیں کہ اُسے اپنے ساس سسر دیور جیٹھ سے نفرت تھی۔ بلکہ اس کا خیال تھا کہ اگر غم کھانے اور طرح دینے پر بھی کنبے کے ساتھ نباہ نہ ہو سکے تو آئے دن کی تکرار سے زندگی تلخ کرنے کے بجائے یہی بہتر ہے کہ اپنی کھچڑی الگ پکائی جائے۔

آنندی ایک بڑے اونچے خاندان کی لڑکی تھی۔ اس کے باپ ایک چھوٹی سی ریاست کے تعلقہ دار تھے۔ عالیشان محل، ایک ہاتھی، تین گھوڑے، پانچ وردی پوش سپاہی، فٹن بہلیاں، شکاری کتے، باز، بحری، شکرے، جُرّے، فرش فروش، شیشہ آلات، آنریری مجسٹریٹی اور قرض جو ایک معزز تعلقہ دار کے لوازم ہیں، وہ اُن سے بہرہ ور تھے۔ بھوپ سنگھ نام تھا۔ فراخ دل، حوصلہ مند آدمی تھے۔ مگر قسمت کی خوبی۔ لڑکا ایک بھی نہ تھا۔ سات لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوئیں۔ اور ساتوں زندہ رہیں۔ اپنے برابر یا زیادہ اُونچے خاندان میں ان کی شادی کرنا اپنی ریاست کو مٹی میں ملانا تھا۔ پہلے جوش میں تو اُنہوں نے تین شادیاں دل کھول کر کیں۔ مگر جب پندرہ بیس ہزار کے مقروض ہو گئے تو آنکھیں کھلیں۔ ہاتھ پیر پیٹ

لیا۔ آنندی چوتھی لڑکی تھی۔ مگر اپنی سب بہنوں سے زیادہ حسین اور نیک۔ اسی وجہ سے ٹھاکر بھوپ سنگھ اُسے بہت پیار کرتے تھے۔ حسین بچے کو شاید اس کے ماں باپ بھی زیادہ پیار کرتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب بڑے پس و پیش میں تھے کہ اس کی شادی کہاں کریں نہ تو یہی چاہتے تھے کہ قرض کا بوجھ بڑھے اور نہ یہی منظور تھا کہ اُسے اپنے آپکو بد قسمت سمجھنے کا موقع ملے۔ ایک روز سری کنٹھ ان کے پاس کسی چندے کیلئے روپیہ مانگنے آئے شاید ناگری پرچار کا چندہ تھا۔ بھوپ سنگھ ان کے طور و طریق پر ریجھ گئے۔ کھینچ تان کر زائچے ملائے گئے۔ اور شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔

آنندی دیوی اپنے نئے گھر میں آئیں تو یہاں کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہی دیکھا۔ جن دلچسپیوں اور تفریحوں کی وہ بچپن سے عادی ہو رہی تھی اُن کا یہاں وجود بھی نہ تھا۔ ہاتھی گھوڑوں کا تو کیا ذکر کوئی سجی ہوئی خوبصورت بہلی بھی نہ تھی۔ ریشمی سلیپر ساتھ لائی تھی مگر یہاں باغ کہاں مکان میں کھڑکیاں تک نہ تھیں۔ نہ زمین پر فرش نہ دیواروں پر تصویریں۔ یہ ایک سیدھا سادہ دہقانی مکان تھا۔

آنندی نے تھوڑے ہی دنوں میں ان تبدیلیوں سے اپنے تئیں اس قدر مانوس بنا لیا۔ گویا اُس نے تکلفات کبھی دیکھے ہی نہیں۔

(۲)

ایک روز دوپہر کے وقت لال بہاری سنگھ دو مرغابیاں لئے ہوئے آئے اور بھاوج سے کہا جلدی سے گوشت پکا دو۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ آنندی کھانا پکا کر ان کی منتظر بیٹھی تھی۔ گوشت پکانے بیٹھی مگر ہانڈی میں دیکھا تو گھی پاؤ بھر سے زیادہ نہ تھا بڑے گھر کی بیٹی۔ کفایت شعاری کا سبق ابھی اچھی طرح نہ پڑھی تھی۔ اُس نے سب گھی گوشت میں ڈال دیا۔ لال بہاری سنگھ کھانے بیٹھے تو دال میں گھی نہ تھا۔ بولے "دال میں گھی کیوں نہیں چھوڑا؟"

آنندی نے کہا "گھی سب گوشت میں پڑ گیا۔"

لال بہاری۔ ابھی پرسوں گھی آیا ہے۔ اس قدر جلد اُٹھ گیا۔

آنندی۔ آج تو کل پاؤ بھر تھا۔ وہ میں نے گوشت میں ڈال دیا۔

جس طرح سوکھی لکڑی جلدی سے جل اُٹھتی ہے اسی طرح بھوک سے باؤلا انسان ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتا ہے۔ لال بہاری سنگھ کو بھاوج کی یہ زبان درازی بہت بُری معلوم ہوئی، تیکھا ہو کر بولا "میکے میں تو جیسے گھی کی ندی بہتی ہو۔"

عورت گالیاں سہتی ہے، مار سہتی ہے مگر میکے کی نندا اس سے نہیں سہی جاتی آنندی منہ پھیر کر بولی۔ "ہاتھی مرا بھی تو نو لاکھ کا۔ وہاں اتنا گھی روز نائی کہار کھا جاتے ہیں۔"

لال بہاری جل گیا، تھالی اُٹھا کر پٹک دی اور بولا۔ "جی چاہتا ہے کہ تالو سے زبان کھینچ لے۔"

آنندی کو بھی غصہ آ گیا۔ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ بولی۔ "وہ ہوتے تو آج اس کا مزہ چکھا دیتے۔"

اب نوجوان اُجڈ ٹھاکر سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس کی بیوی ایک معمولی زمیندار کی بیٹی تھی جب جی چاہتا تھا۔ اُس پر ہاتھ صاف کر لیا کرتا تھا۔ کھڑاؤں اُٹھا کر آنندی کی طرف زور سے پھینکی۔ اور بولا۔ "جس کے گمان پر بھولی ہوئی ہو، اُسے بھی دیکھوں گا۔ اور تمہیں بھی۔"

آنندی نے ہاتھ سے کھڑاؤں روکی۔ سر بچ گیا۔ مگر اُنگلی میں سخت چوٹ آئی۔ غصے کے مارے ہوا کے ہلتے ہوئے پتے کی طرح کانپتی ہوئی۔ اپنے کمرے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ عورت کا زور اور حوصلہ، غرور اور عزت شوہر کی ذات سے ہے اُسے شوہر ہی کی طاقت اور ہمت کا گھمنڈ ہوتا ہے۔ آنندی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

(۳)

سری کنٹھ سنگھ ہر شنبہ کو اپنے مکان آیا کرتے تھے۔ جمعرات کا یہ واقعہ تھا۔ دو دن

تک آنندی نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ ان کی راہ دیکھتی رہی۔ آخر شنبہ کو حسبِ معمول شام کے وقت وہ آئے۔ اور باہر بیٹھ کر کچھ ملکی و مالی خبریں۔ کچھ نئے مقدمات کی تجویزیں اور فیصلے بیان کرنے لگے۔ اور یہ سلسلۂ تقریر دس بجے رات تک جاری رہا۔ دو تین گھنٹے آنندی نے بے انتہا اضطراب کے عالم میں کاٹے۔ بارے کھانے کا وقت آیا۔ پنچایت اُٹھی۔ جب تخلیہ ہوا، تو لال بہاری نے کہا۔ "بھیّا! آپ ذرا گھر میں سمجھا دیجئے گا۔ کہ زبان سنبھال کر بات چیت کیا کریں۔ ورنہ ناحق ایک دن خون ہو جائے گا۔"

بینی مادھو سنگھ نے شہادت دی۔ "بہو بیٹیوں کی یہ عادت اچھی نہیں۔ کہ مردوں کے منہ لگیں۔"

لال بہاری۔ وہ بڑے گھر کی بیٹی ہیں۔ تو ہم لوگ بھی کوئی کرمی کہار نہیں ہیں۔

سری کنٹھ۔ آخر بات کیا ہوئی؟

لال بہاری۔ کچھ بھی نہیں۔ یوں ہی آپ ہی آپ اُلجھ پڑیں۔ میکے کے سامنے ہم لوگوں کو تو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔

سری کنٹھ کھا پی کر آنندی کے پاس گئے۔ وہ بھی بھری بیٹھی تھی۔ اور یہ حضرت بھی کچھ تیکھے تھے۔

آنندی نے پوچھا۔ "مزاج تو اچھا ہے؟"

سری کنٹھ بولے۔ "بہت اچھا ہے۔ یہ آج کل تم نے گھر میں کیا طوفان مچا رکھا ہے؟"

آنندی کے تیوروں پر بل پڑ گئے۔ اور جھنجھلاہٹ کے مارے بدن میں پسینہ آ گیا۔ بولی "جس نے تم سے یہ آگ لگائی ہے اُسے پاؤں تو منہ جھلس دوں۔"

سری کنٹھ۔ اس قدر تیز کیوں ہوتی ہو۔ کچھ بات تو کہو۔

آنندی۔ کیا کہوں۔ قسمت کی خوبی ہے۔ ورنہ ایک گنوار لونڈا جسے چپراس گری

کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ مجھے کھڑاؤں سے مار کر یوں نہ اکڑتا پھرتا۔ بوٹیاں نچوا لیتی۔ اس پر تم پوچھتے ہو کہ گھر میں طوفان کیوں مچا رکھا ہے۔

ہری کنٹھ۔ آخر کچھ کیفیت تو بیان کرو۔ مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں۔

آنندی۔ پرسوں تمہارے لاڈلے بھائی نے مجھے گوشت پکانے کو کہا۔ گھی پاؤ بھر سے کچھ زیادہ تھا۔ میں نے سب گوشت میں ڈال دیا۔ جب کھانے بیٹھا تو کہنے لگا دال میں گھی کیوں نہیں۔ بس اسی پر میرے میکے کو بُرا بھلا کہنے لگا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکی بولی کہ وہاں اتنا گھی نائی کہار کھا جاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ بس اتنی سی بات پر اس ظالم نے مجھ پر کھڑاؤں پھینک ماری۔ اگر میں ہاتھ سے نہ روک لیتی تو سر پھٹ جاتا۔ اس سے پوچھو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے یا جھوٹ؟

ہری کنٹھ کی آنکھیں لال ہو گئیں۔ بولے "یہاں تک نوبت پہنچ گئی۔ یہ لونڈا تو بڑا شریر نکلا۔"

آنندی رونے لگی۔ جیسے عورتوں کا قاعدہ ہے۔ کیونکہ آنسو ان کی پلکوں پر رہتا ہے۔ عورت کے آنسو مرد کے غصّے پر روغن کا کام کرتے ہیں۔ ہری کنٹھ کے مزاج میں تحمّل بہت تھا۔ انہیں شاید کبھی غصّہ آیا ہی نہ تھا۔ مگر آنندی کے آنسوؤں نے آج زہریلی شراب کا کام کیا۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ سویرا ہوتے ہی اپنے باپ کے پاس جا کر بولے۔ "دادا! اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا۔"

یہ اور اسی معنی کے دوسرے جملے زبان سے نکالنے کے لئے ہری کنٹھ سنگھ نے اپنے کئی ہمجولیوں کو بارہا آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ جب ان کا کوئی دوست ان سے ایسی باتیں کہتا تو وہ مضحکہ اُڑاتے اور کہتے۔ تم لوگ بیویوں کے غلام ہو۔ انہیں قابو میں رکھنے کے بجائے خود اُن کے قابو میں ہو جاتے ہو۔ مگر ہندو مشترکہ خاندان کا یہ پُرجوش وکیل آج اپنے باپ سے یہ کہہ رہا تھا۔ "دادا! اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہوگا۔" ناصح کی زبان

اُسی وقت تک چلتی ہے، جب تک وہ عشق کے کرشموں سے بے خبر رہتا ہے۔ آزمائش کے بیچ میں آکر ضبط اور حلم رخصت ہو جاتے ہیں۔

بینی مادھو سنگھ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور بولے کیوں۔

سری کنٹھ۔ اس لئے کہ مجھے بھی اپنی عزت کا کچھ تھوڑا بہت خیال ہے۔ آپ کے گھر میں اب ہٹ دھرمی کا برتاؤ ہوتا ہے۔ جن کو بڑوں کا ادب ہونا چاہیئے وہ اُن کے سر چڑھتے ہیں میں تو دوسرے کا غلام ٹھہرا، گھر پر رہتا نہیں اور یہاں میرے پیچھے عورتوں پر کھڑاؤں اور جوتوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔ کڑی بات تک مضائقہ نہیں کوئی ایک کی دو کہہ لے یہاں تک میں ضبط کر سکتا ہوں۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے اُوپر لات اور گھونسے پڑیں اور میں دم نہ ماروں۔

بینی مادھو سنگھ کچھ جواب نہ دے سکے۔ سری کنٹھ ہمیشہ اُن کا ادب کرتے تھے ان کے ایسے تیور دیکھ کر بوڑھا ٹھاکر لاجواب ہو گیا۔ صرف اتنا بولا "بیٹا تم عقلمند ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو۔ عورتیں اسی طرح گھر تباہ کر دیتی ہیں۔ ان کا مزاج بہت بڑھانا اچھی بات نہیں۔"

سری کنٹھ۔ اتنا میں جانتا ہوں۔ آپ کی دعا سے ایسا احمق نہیں ہوں۔ آپ خود جانتے ہیں کہ اس گاؤں کے کئی خاندانوں کو میں نے علیحدگی کی آفتوں سے بچا دیا ہے۔ مگر جس عورت کی عزت اور آبرو کا میں ایشور کے دربار میں ذمہ وار ہوں۔ اُس عورت کے ساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ میں نہیں سہہ سکتا۔ آپ یقین مانئے میں اپنے اُوپر بہت جبر کر رہا ہوں، کہ لال بہاری کی گوشمالی نہیں کرتا۔

اب بینی مادھو سنگھ بھی گرمائے، یہ کفر زیادہ نہ سُن سکے بولے۔ "لال بہاری تمہارا بھائی ہے اُس سے جب کبھی بھول چوک ہو۔ تم اُس کے کان پکڑو۔ مگر........

سری کنٹھ۔ لال بہاری کو میں اب اپنا بھائی نہیں سمجھتا۔

بینی مادھو۔ عورت کے پیچھے

سری کنٹھ۔ جی نہیں! اُس کی گستاخی اور بے رحمی کے باعث

دونوں آدمی کچھ دیر تک خاموش رہے۔ ٹھاکر صاحب لڑکے کا غصہ دھیما کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ لال بہاری سے کوئی گستاخی یا بے رحمی وقوع میں آئی اسی اثنا میں کئی اور آدمی حُقّہ تمباکو اُڑانے کیلئے آ بیٹھے۔ کئی عورتوں نے جب سُنا کہ سری کنٹھ بیوی کے پیچھے باپ سے آمادہٗ جنگ ہیں تو اُن کا دل بہت خوش ہوا۔ اور طرفین کی شکوہ آمیز باتیں سُننے کے لئے اُن کی رُوحیں تڑپنے لگیں۔ کچھ ایسے حاسد بھی گاؤں میں تھے جو اس خاندان کی سلامت روی پر دل ہی دل میں جلتے تھے۔ سری کنٹھ باپ سے دبتا تھا۔ اسلئے وہ خطاوار ہے۔ اس نے اتنا علم حاصل کیا۔ یہ بھی اسی کی خطا ہے۔ بینی مادھو سنگھ بڑے بیٹے کو بہت پیار کرتے ہیں۔ یہ بُری بات ہے۔ وہ بلا اس کی صلاح کے کوئی کام نہیں کرتے۔ یہ اُن کی حماقت ہے۔ ان خیالات کے آدمیوں کی آج اُمیدیں بھر آئیں۔ حقّہ پینے کے بہانے سے کوئی لگان کی رسید دکھانے کے حیلے سے آ آکر بیٹھ گئے۔ بینی مادھو سنگھ پرانا آدمی تھا۔ سمجھ گیا۔ کہ آج یہ حضرات پھولے نہیں سماتے اُس کے دل نے یہ فیصلہ کیا کہ اُنہیں خوش نہ ہونے دوں گا۔ خواہ اپنے اُوپر کتنا ہی جبر ہو۔ یکایک لہجہ تقریر نرم کرکے بولے۔ "بیٹا! میں تم سے بالکل باہر نہیں ہوں۔ تمہارا جو جی چاہے کرو۔ اب تو لڑکے سے خطا ہو گئی"۔

الٰہ آباد کا نوجوان جھلایا ہوا گریجوایٹ اس گھات کو نہ سمجھا۔ اپنے ڈیبیٹنگ کلب میں اس نے اپنی بات پر اَڑنے کی عادت سیکھی تھی۔ مگر عملی مباحثوں کے داؤپیچ سے واقف نہ تھا۔ اس میدان میں وہ بالکل اناڑی نکلا۔ باپ نے جس مطلب سے پہلو بدلا تھا وہاں تک اُس کی نگاہ نہ پہنچی۔ بولا۔ میں لال بہاری سنگھ کے ساتھ اب اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔"

باپ. بیٹا! تم عقلمند ہو اور عقلمند آدمی گنواروں کی بات پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ بے سمجھ لڑکا ہے اس سے جو کچھ خطا ہوئی ہے اُسے تم بڑے ہو کر معاف کر دو۔

بیٹا۔ اس کی یہ حرکت میں ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔ یا تو وہی گھر میں رہے گا یا میں ہی رہوں گا۔ آپ کو اگر اس سے زیادہ محبت ہے تو مجھے رخصت کیجئے میں اپنا بوجھ آپ اُٹھاؤں گا۔ اگر مجھے رکھنا چاہتے ہو تو اس سے کہئے جہاں چاہے چلا جائے بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

لال بہاری سنگھ دروازے کی چوکھٹ پر چپ چاپ کھڑا بڑے بھائی کی باتیں سُن رہا تھا۔ وہ اُن کا بہت ادب کرتا تھا اُسے کبھی اتنی جرأت نہ ہوئی تھی۔ کہ سری کنٹھ کے سامنے چارپائی پر بیٹھ جائے یا حقہ پی لے یا پان کھالے۔ اپنے باپ کا بھی اتنا پاس و لحاظ نہ کرتا تھا۔ سری کنٹھ کو بھی اس سے دلی محبت تھی اپنے ہوش میں اُنہوں نے کبھی اُسے گُھر کا تک نہ تھا۔ جب الہ آباد سے آتے تو ضرور اس کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لاتے مگدر کی جوڑی اُنہیں نے بنوا دی تھی۔ پچھلے سال جب اس نے اپنے سے ڈیوڑھے جوان کو ناگ پنچمی کے دنگل میں پچھاڑ دیا۔ تو اُنہوں نے خوش ہو کر اکھاڑے ہی میں جا کر اُسے گلے سے لگا لیا تھا۔ اور پانچ روپے کے پیسے لُٹائے تھے۔ ایسے بھائی کے منہ سے آج ایسی جگر دوز باتیں سُن کر لال بہاری سنگھ کو بڑا ملال ہُوا۔ اُسے ذرا بھی غصّہ نہ آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے فعل پر آپ نادم تھا۔ بھائی کے آنے سے ایک دن پہلے ہی سے اس کا دل ہر دم دھڑکتا تھا۔ کہ دیکھوں بھیا کیا کہتے ہیں۔ میں اُن کے سامنے کیسے جاؤں گا۔ میں اُن سے کیسے بولوں گا۔ میری آنکھیں اُن کے سامنے کیسے اُٹھیں گی۔ اُس نے سمجھا تھا کہ بھیا مجھے بلا کر سمجھا دیں گے۔ اس اُمید کے خلاف آج وہ اُنہیں اپنی صورت سے بیزار پاتا تھا۔ وہ جاہل تھا۔ مگر اس کا دل کہتا تھا۔ کہ بھیا میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ اگر سری کنٹھ اُسے اکیلا بلا کر

کر دو چار سخت باتیں کہتے بلکہ دو چار طمانچے بھی لگا دیتے تو شاید اُسے اتنا ملال نہ ہوتا مگر بھائی کا یہ کہنا کہ اب مَیں اس کی صورت سے نفرت رکھتا ہوں۔ لال بہاری سے نہ سہا گیا۔ وہ روتا ہوا گھر میں آیا اور کوٹھڑی میں جا کر کپڑے پہنے۔ آنکھیں پونچھیں جس میں کوئی یہ نہ سمجھے کہ روتا تھا۔ تب آنندی دیوی کے دروازے پر آ کر بولا۔ "بھابی! بھیّا نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ میرے ساتھ اس گھر میں نہ رہیں گے۔ وہ اب میرا مُنہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس لئے اب میں جاتا ہوں۔ انہیں پھر مُنہ نہ دکھاؤں گا مجھ سے جو کچھ خطا ہوئی ہے اُسے مُعاف کرنا۔"

یہ کہتے کہتے لال بہاری کی آواز بھاری ہو گئی۔

(۴)

جس وقت لال بہاری سنگھ سر جھکائے آنندی کے دروازے پر کھڑا تھا اسی وقت سری کنٹھ سنگھ بھی آنکھیں لال کئے باہر سے آئے۔ بھائی کو کھڑا دیکھا تو نفرت سے آنکھیں پھیر لیں۔ اور کترا کر نکل گئے۔ گویا اُس کے سایہ سے بھی پرہیز ہے۔

آنندی نے لال بہاری سنگھ کی شکایت تو شوہر سے کی۔ مگر اب دل میں پچھتا رہی تھی۔ وہ طبعاً نیک عورت تھی۔ اور اُس کے خیال میں بھی نہ تھا۔ کہ یہ معاملہ اس قدر طول کھینچے گا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے شوہر کے اوپر جھنجھلا رہی تھی۔ کہ اس قدر گرم کیوں ہو رہے ہیں۔ یہ خوف کہ کہیں یہ مجھے الٰہ آباد چلنے کو نہ کہنے لگیں۔ تو پھر مَیں کیا کروں گی۔ اس کے چہرے کو زرد کئے ہوئے تھے اسی حالت میں جب اس نے لال بہاری کو دروازے پر کھڑے یہ کہتے سُنا کہ اب مَیں جاتا ہوں۔ مجھ سے جو کچھ خطا ہوئی ہے معاف کرنا۔" تو اس کا رہا سہا غصّہ بھی پانی ہو گیا وہ رونے لگی۔ دلوں کا مَیل دھونے کے لئے آنسو سے زیادہ کارگر کوئی چیز نہیں ہے۔

سری کنٹھ کو دیکھ کر آنندی نے کہا۔ "لالہ باہر کھڑے ہیں۔ بہت رو رہے ہیں"
سری کنٹھ۔ تو میں کیا کروں ؟
آنندی۔ اندر بُلا لو۔ میری زبان کو آگ لگے۔ مَیں نے کہاں سے یہ جھگڑا اُٹھایا
سری کنٹھ: میں نہیں بُلانے کا۔
آنندی۔ پچھتاؤ گے۔ اُنہیں بہت گلان آگئی ہے۔ ایسا نہ ہو۔ کہیں چل دیں۔
سری کنٹھ نہ اُٹھے۔ اتنے میں لال بہاری نے پھر کہا۔ بھابی! بھیّا سے میرا سلام کہہ دو۔ وہ میرا مُنہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس لئے میں بھی اپنا مُنہ اُنہیں نہ دکھاؤں گا۔

لال بہاری سنگھ اتنا کہہ کر لَوٹ پڑا۔ اور تیزی سے باہر کے دروازہ کی طرف جانے لگا۔ یکایک آنندی اپنے گھر سے نکلی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لال بہاری نے پیچھے کی طرف تاکا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ "مجھے جانے دو۔"
آنندی۔ کہاں جاتے ہو ؟
لال بہاری۔ جہاں کوئی میرا مُنہ نہ دیکھے۔
آنندی۔ مَیں نہ جانے دوں گی۔
لال بہاری۔ مَیں تم لوگوں کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہُوں۔
آنندی۔ تمہیں میری قسم۔ اب ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا۔
لال بہاری۔ جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو جائے گا کہ بھیّا کے دل میں میری طرف سے صاف ہو گیا یا نہیں۔ تب تک مَیں اس گھر میں ہرگز نہ رہوں گا۔
آنندی۔ مَیں ایشور کی سوگند کھا کر کہتی ہوں کہ تمہاری طرف سے میرے دل میں ذرا بھی میل نہیں ہے۔
اب سری کنٹھ کا دل پگھلا۔ انہوں نے باہر آکر لال کو گلے لگا لیا۔ اور دونوں

بھائی خوب پھُوٹ پھُوٹ کر رو دُئے۔ لالہ بہاری نے سسکتے ہوئے کہا "بھیّا اب کبھی نہ کہنا۔ کہ تمہارا مُنہ نہ دیکھوں گا۔ اس کے سوا جو سزا آپ دیں گے وہ میں خوشی سے قبول کروں گا۔"

سری کنٹھ نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا "للو ان باتوں کو بالکل بھُول جاؤ۔ ایشور چاہے گا تو اب ایسی باتوں کا موقع نہ آئے گا۔"

بینی مادھو سنگھ باہر سے آ رہے تھے۔ دونوں بھائیوں کو گلے ملتے دیکھ کر خوش ہو گئے اور بول اُٹھے۔ بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بگڑتا ہُوا کام بنا لیتی ہیں"۔

گاؤں میں جس نے یہ واقعہ سُنا۔ ان الفاظ میں آنندی کی فیاضی کی داد دی۔

"بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں"

رانی سارندھا

(۱)

اندھیری رات کے سناٹے میں دھسان ندی چٹانوں اور سنگ ریزوں سے ٹکراتی ہوئی مُہانی آواز پیدا کرتی تھی۔ گویا چکّیاں گھمر گھمر کرتی ہوں۔ ندی کے داہنے کنارے پر ایک ٹیکرا ہے اُس پر ایک پُرانا قلعہ بنا ہُوا ہے۔ جس کی فصیلوں کا گھاس اور کائی نے محاصرہ کر رکھا ہے ٹیکرے سے پورب کی طرف ہٹ کر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہ قلعہ اور گاؤں دونوں ایک بندیل سردار کی یادگار ہیں۔ صدیاں گذر گئیں۔ بندیل کھنڈ میں سلطنتیں بنیں اور بگڑیں۔ مسلمان آئے اور گئے۔ بندیل راجے اُٹھے اور گرے۔ کوئی دیہہ کوئی علاقہ ایسا نہ تھا۔ جس پر ان سوک گردیوں کے داغ نہ لگے ہوں۔ مگر قلعے پر کسی غنیم کو پھریرا نہ لہرایا اور اس گاؤں میں کبھی غنیم کے قدم نہ آئے۔ یہ اُس کی خوش نصیبی تھی۔

انردھ سنگھ دلیر راجپوت تھا۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا۔ جب ہر شخص کو ضرورتاً دلیر اور جانباز بننا پڑتا تھا۔ ایک طرف مسلمان فوجیں پرا جمائے کھڑی رہتی تھیں دوسری طرف زبردست بندیل راجے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ہوسناک نگاہوں سے دیکھتے رہتے تھے۔ انردھ سنگھ کے پاس سواروں اور پیادوں کی مختصر مگر آزمودہ کار جماعت تھی۔ اس سے وہ اپنے خاندان کا وقار اپنے بزرگوں کی عزت قائم رکھتا تھا۔ اُسے کبھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوتا تھا۔ تین سال ہوئے۔ اُس کی شادی شیتلا دیوی سے ہوئی تھی۔ مگر انردھ سنگھ آرزوؤں کے دن اور اُمیدوں کی راتیں کوہ و بیابان میں کاٹتا تھا۔ اور غریب شیتلا دیوی اُس کی

جان کی خیر منانے میں۔ وہ کتنی دفعہ شوہر سے کہہ چکی تھی۔ وہ کتنی بار اُس کے قدموں پر گر کر روئی تھی۔ کہ تم میرے آنکھوں کے سامنے سے کہیں نہ جاؤ۔ مجھے ہر دوارے چلو۔ بندرابن لے چلو۔ مجھے تمہارے ساتھ جنگل میں رہنا منظور ہے۔ مگر یہ بیوگ اب نہیں سہا جاتا۔ اس نے پیار سے کہا۔ ضد سے کہا۔ منت سے کہا۔ مگر انردھ سنگھ منڈھیل تھا۔ ستیلا اپنے کسی ہتھیار سے اس پر فتح نہ پا سکی۔

اندھیری رات تھی۔ ساری دُنیا سوتی تھی۔ مگر تارے آسمان پر گھور رہے تھے۔ ستیلا دیوی پلنگ پر پڑی ہوئی کروٹیں بدل رہی تھی۔ اور اُس کی نند سارندھا فرش پر بیٹھی ہوئی دلکش لہجے میں گاتی تھی۔

"بن رگھوبیر کٹت نہیں رین"

ستیلا نے کہا "جی نہ جلاؤ۔ کیا تمہیں بھی نیند نہیں آتی؟

سارندھا۔ تمہیں لوری سُنا رہی ہوں۔

ستیلا۔ میری آنکھوں سے تو نیند غائب ہو گئی۔

سارندھا۔ کسی کو ڈھونڈنے گئی ہو گی۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک لمبے قد کا سجیلا جوان اندر داخل ہوا۔ یہ انردھ تھا۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ اور بدن پر کوئی ہتھیار نہ تھا۔ ستیلا چارپائی سے اُتر کر زمین پر بیٹھ گئی۔ سارندھا نے پوچھا۔

"بھیّا یہ کپڑے بھیگے کیوں ہیں۔"

انردھ۔ ندی تیر کر آیا ہوں۔

سارندھا۔ ہتھیار کیا ہوئے؟

انردھ۔ چھن گئے۔

سارندھا۔ اور ساتھ کے آدمی؟

انردھ. سب کے سب میدان میں کام آئے۔

سینلا نے دبی زبان سے کہا۔ "ایشور نے بڑی خیر کی"۔

مگر سارندھا کے تیوروں پر بل پڑ گئے۔ اور غرور کی سرخی سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی۔ بھیّا! تم نے خاندان کی رسم کھو دی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

سارندھا بھائی پر جان دیتی تھی۔ اُس کے منہ سے یہ جلا ہوا فقرہ سُن کر انردھ سنگھ شرم سے عرق عرق ہو گیا۔ اور وہ مردانہ جوش جسے محبت نے ذرا دیر کے لئے دبا رکھا تھا۔ آگ کی طرح بھڑک اٹھا۔ وہ اُلٹے قدم لوٹا۔ اور یہ کہہ کر کہ "سارندھا! تم نے مجھے عمر بھر کے لئے خبردار کر دیا۔ یہ باتیں مجھے کبھی نہ بھولیں گی۔" باہر چلا گیا۔

اندھیری رات تھی آسمان پر تارے گھور رہے تھے۔ انردھ سنگھ قلعے سے باہر نکلا۔ اور ذرا دیر میں ندی کے اُس پار جا پہنچا۔ اور پھر تاریکی کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو گیا۔ سینلا اُس کے پیچھے پیچھے فصیل تک آئی۔ مگر جب انردھ جست مار کر باہر کود پڑا۔ تو وہ بیرہن ایک چٹان پر بیٹھ کر رونے لگی۔

اتنے میں سارندھا بھی وہیں آ پہنچی۔ سینلا نے ناگن کی طرح بل کھا کر کہا۔ "رسم آپ کو پیاری ہے۔"

سارندھا۔ ہاں۔

سینلا۔ اپنی پتی ہوتا تو کلیجے میں چھپا رکھتی۔

سارندھا۔ نہ کلیجے میں خنجر چبھو دیتی۔

سینلا نے طیش کھا کر کہا۔ "ڈولی میں چھپاتی پھرو گی۔ میری بات گرہ میں باندھ لو۔"

سارندھا۔ جس روز یہ نوبت آئے گی۔ میں اپنا قول پورا کر دکھاؤں گی۔

اِس واقعہ کے تین ماہ بعد انردھ سنگھ مہرونی کا قلعہ فتح کرکے لوٹا۔ اور سال بھر کے بعد سارندھا کی شادی اورچھا کے راجہ چمپت رائے سے ہو گئی۔ مگر اُس دن کی باتیں دونوں عورتوں کے دل میں کھٹکتی رہیں۔

(۲)

راجہ چمپت رائے بڑا ذی حوصلہ اولوالعزم راجپوت تھا۔ ساری بندیلہ قوم اُسے مایۂ ناز سمجھتی تھی۔ اُس کے ابرو کے اشارے پر فوجیں آراستہ اور ریاستیں تباہ ہو جاتی تھیں۔ مسندِ حکومت پر آتے ہی اُس نے مغل بادشاہوں کو خراج دینا بند کر دیا۔ اور زورِ شمشیر سے اپنا دائرہ سلطنت وسیع کرنے لگا۔ اسلامی فوجیں بار بار حملہ آور ہوتیں اور پسپا ہو جاتیں۔ اُس کے نام پر سارا بندیل کھنڈ فدا ہونے کو تیار تھا۔ یہی زمانہ تھا۔ جب انردھ سنگھ نے اپنی بہن اُس کے آغوشِ محبت میں دی۔ سارندھا نے مُنہ مانگی مُراد پائی۔ اُس کی یہ آرزو کہ میرا شوہر سب بندیلوں کا سرتاج ہو۔ پوری ہو گئی۔ اگرچہ چمپت رائے کے رنواس میں پانچ رانیاں تھیں۔ ایک سے ایک حسین دمہ جبین۔ مگر چمپت رائے کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ وہ عورت جو دل میں میری پرستش کرتی ہے۔ سارندھا ہے۔

مگر اتفاقات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ چمپت رائے کو دربارِ دہلی کا حلقہ بگوش ہونا پڑا۔ اُس نے اپنا ملک و مال اپنے بھائی پہاڑ سنگھ کو سونپا اور خود دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ یہ عہدِ شاہجہانی کا آخری دور تھا۔ ولی عہد کی آنکھوں میں مروّت اور دل میں شرافت تھی۔ اُنہوں نے چمپت رائے کی معرکہ آرائیوں کی داستانیں سُنی تھیں۔ اُس کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور کالپی کی بیش بہا جاگیر اُسے عنایت کی جس کے محاصل نو لاکھ سالانہ تھے۔

یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ چمپت رائے کو آئے دن کی صف آرائیوں سے نجات ملی۔ رعب و شان کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ فراغت کے ساتھ امارت کے جو نخلے آ پہنچے

عشرت محفلیں سجاتی اور مسرت کے نغمے الاپتی۔ راجہ نشۂ عیش میں متوالے ہوئے رانیاں زیورات مرصع کی چمک دمک پر ریجھیں۔ کامرانی کے نشے نے سب کو مدہوش کر دیا۔ مگر سارندھا ان دنوں بہت مغموم و پژمردہ خاطر رہتی۔ وہ خوشی کی محفلوں میں بہت کم بیٹھتی اور مسرت کی زمزمہ سنجیاں اُسے بہت کم پسند آتیں۔

ایک روز چمپت رائے نے سارندھا سے کہا "سارن! تم اُداس کیوں رہتی ہو۔ میں تمہیں کبھی ہنستے نہیں دیکھتا۔ کیا مجھ سے ناراض ہو!"

سارندھا آبدیدہ ہو کر بولی "سوامی! آپ کیوں ایسا خیال کرتے ہیں۔ آپ کی خوشی میری خوشی ہے۔ جب آپ خوش ہیں۔ تو میں بھی خوش ہوں"۔

چمپت رائے۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں۔ میں نے تمہارے چہرے پر وہ دلاویز مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھی۔ جو میرا من ہر لیا کرتی تھی۔ تم نے کبھی اپنے ہاتھوں سے مجھے بیڑا نہیں کھلایا۔ کبھی میری پاگ نہیں سنواری۔ کبھی میرے بدن پر ہتھیار نہیں سجائے۔ یہ تباؤ۔ کیا بات ہے؟ کیا میں یہ خیال کر لوں۔ کہ میں اب وہ تازگی نہیں رہی"۔

سارندھا۔ پران ناتھ۔ آپ مجھ سے ایسی بات پوچھتے ہیں۔ جس کا جواب میں نہیں دے سکتی۔ بیشک ان دنوں میری طبیعت شگفتہ نہیں رہتی۔ میں بہت چاہتی ہوں۔ کہ خوش رہوں۔ مگر ایک بوجھ سا دل کو دبائے رہتا ہے۔

چمپت رائے (تیوری چڑھا کر) مجھے اس دل گرفتگی کا کوئی خاص سبب نظر نہیں آتا۔ ایشور نے تمہیں کیا نہیں دیا۔ آخر اورچھا میں کیا سکھ تھا۔؟

سارندھا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ بولی "میں کچھ کہوں۔ آپ ناراض تو نہ ہوں گے"۔

چمپت رائے۔ نہیں شوق سے کہو۔

سارندھا۔ اورچھا میں میں ایک راجہ کی رانی تھی۔ یہاں میں ایک جاگیر دار کی لونڈی ہوں اورچھا میں میں وہ تھی جو اودھ میں کوشلیا تھیں۔ مگر یہاں میں ایک شاہی نمک خوار

کی کنیز ہوں۔ جس بادشاہ کے روبرو آپ آج سرِ نیاز خم کرتے ہیں وہ کل آپ کا نام سُن کر تھرّاتا تھا۔ رانی سے باندی ہو کر خوش رہنا میرے بس میں نہیں آپ نے یہ فراغت اور یہ مفلسی بڑی گراں قیمت دے کر خریدی ہیں۔

چمپت رائے کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ وہ اب تک سارندھا کی روحانی عظمت سے بے خبر تھے۔ جیسے یتیم بچہ ماں کا تذکرہ سُن کر رونے لگتا ہے اُسی طرح اورچھا کی یاد سے چمپت رائے کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اُس عقیدت سے جو ایک سچے اُپاسک کو دیوی سے ہوتی ہے اُنہوں نے سارندھا کے قدم چوم لئے آج سے اُنہیں پھر اُسی اُجڑے دیار میں لیجانے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ جہاں سے ہوس پرستیوں کی تمنا کھینچ لائی تھی۔

(۳)

جس طرح ماں اپنے کھوئے ہوئے نادان بچے کو پاکر نہال ہو جاتی ہے اُسی طرح چمپت رائے کے آنے سے بندھیل کھنڈ نہال ہو گیا۔ وہ بندیل قوم کا طرّۂ دستار تھا۔ قلعہ جیر چھہ کے سوئے ہوئے نصیب جاگے نوبتیں بجنے لگیں اور ایک بار سارندھا کی نرگسی آنکھوں میں تبسّم کی جھلک نظر آنے لگی۔

یہاں رہتے کئی ماہ گذر گئے۔ اسی اثناء میں شاہجہان بیمار پڑا۔ شہزادوں میں پہلے ہی سے چشمک تھی۔ اس خبر کے پھیلتے ہی عناد و فساد کا شعلہ بھڑک اُٹھا۔ صف آرائیوں کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مُراد اور محی الدین اپنے دَل سجا کر دکن سے چلے۔

برسات کے دن تھے ندی نالے اُمنڈے ہوئے تھے کوہ و بیابان ہری ہری گھاسوں سے لہرا رہے تھے۔ نامیہ رنگ برنگ روپ بھر کر اپنی اداؤں کے کرشمے دکھا رہی تھی۔ مُراد اور محی الدین عاشقانہ بے صبری سے قدم بڑھاتے چلے آتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ دھولپور کے قریب دریائے چمبل کے کنارے آ پہنچے مگر یہاں عین معبر پر فوج

شاہی اپنے خیر مقدم کیلئے آراستہ پائی۔

شہزادے اب بڑی تشویش میں مبتلا ہوئے۔ سامنے دریائے ذخار بہتا تھا راز عرفان کی طرح وسیع۔ معبر پر ایک آہنی دیوار کھڑی تھی۔ کسی درویش کے استغنا کی طرح مستحکم بے بسی کے عالم میں چمپت رائے کے پاس پیغام بھیجا کہ خدا کے لئے آکر ان کشتی شکستہ گان کا بیڑا پار لگائیے۔

راجہ نے رنواس میں جا کر سارندھا سے پوچھا "اس پیغام کا کیا جواب دوں"۔

سارندھا۔ آپ کو مدد کرنی ہوگی۔

چمپت رائے۔ ان کی مدد کرنا دارا شکوہ سے بیر مول لینا ہے۔

سارندھا۔ بے شک، مگر ہاتھ پھیلانے والے کی لاج رکھنا بھی تو ضروری ہے۔

چمپت رائے۔ (سوچ کر) سارن! تم نے غور کر کے جواب نہیں دیا۔

سارندھا۔ پران ناتھ! میں خوب جانتی ہوں، کہ منزل دشوار ہے۔ اور ہمیں اپنے سپاہیوں کا خون پانی کی طرح بہانا پڑے گا۔ مگر ہم اپنا خون بہائیں گے اپنے جانبازوں کے سر کٹوائیں گے۔ اور چمبل پر لاشوں کا گھاٹ تیار کر دیں گے۔ یقین مانیئے، جب تک چمبل کی دھارا بہتی رہے گی۔ ہمارے سرفروشوں کے خون لعل بن بن کر درخشاں رہیں گے اور جب تک بندیلوں کا ایک نام لیوا بھی زندہ رہے گا۔ یہ خون اُس کے ماتھے پر کیسر کا تلک بن کر چمکے گا۔

آسمان پر بادلوں کے سمندر موجیں مار رہے تھے۔ بیر چھے کے قلعے سے سرفروش بندیلوں کی ایک کالی گھٹا اُٹھی اور دریائے چمبل کی طرف چلی۔ ہر سپاہی بیر رس سے جھوم رہا تھا۔ رانی سارندھا نے دونوں راجکماروں کو گلے سے لگا لیا اور چمپت رائے کو پان کا بیڑا دے کر بولی۔ "بندیلوں کی لاج تمہارے ہاتھ ہے، ایشور تمہاری تلواروں کو اندر کا بجر بنا دے۔"

آج خوشی سے اُس کا ایک ایک عضو مسکرا رہا ہے۔ اور دل سینے کے حباب میں پھولا نہیں سماتا۔

جس طرح ریگستان کا جاں بہ لب مسافر نخلستان کا سواد دُور سے دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو جاتا ہے اسی طرح بندیلوں کی یہ پُر خروش گھٹا دیکھ کر شہزادوں کے مسرّت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ راجہ وہاں کی چپہ چپہ زمین سے واقف تھا۔ اُس نے بندیلوں کو تو کمین گاہ میں چھُپنے کا اشارہ کیا اور شہزادوں کو منتشر فوج کو آراستہ کر کے دریا کے کنارے مغرب کی طرف چلا۔ دارا شکوہ کو گمان ہُوا کہ حریف کسی دوسرے گھاٹ اُتر جانا چاہتا ہے فوراً بیڑے سے مورچے ہٹا لئے۔ کمین گاہ میں بیٹھے ہوئے بندیلے اسی موقع کے منتظر تھے۔ باہر نکل پڑے اور دریا میں گھوڑے ڈال دیئے۔ چمپت رائے نے شہزادہ دارا شکوہ کو بھلاوا دے کر اپنی فوج گھما دی اور بندیلوں کے نقش قدم پر چلتا ہُوا اُسے اُتار لیا۔ اس نقل و حرکت میں اُسے قریب سات گھنٹوں کا توقف ہُوا۔ مگر جا کر دیکھا تو سات سَو بندیلے جانبازوں کی لاشیں پھڑک رہی تھیں۔

راجہ کو دیکھتے ہی بندیلوں کی ہمتیں بندھ گئیں۔ محی الدین کی فوج نے بھی اللہ ہُو اکبر کا نعرہ بلند کیا اور جس طرح طوفان پُر شور سمندر کو زیر و زبر کر دیتا ہے اُسی طرح اُن کے پُر زور حملے سے شاہی فوج میں ہلچل پڑ گئی۔ بندیلوں نے پہلے ہی اُن کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا اس دھاوے نے اُن کی صفیں توڑ دیں۔ دست بدست جنگ کی نوبت پہنچی۔ خنجر میانوں سے نکل پڑے اور خون کے فوّارے چلنے لگے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ آسمان شفق سے سُرخ ہُوا اور زمین خون سے۔

اندھیرا ہو گیا۔ تلواریں دم لینے کیلئے بیقرار ہو رہی تھیں۔ دفعتاً اُفق مغرب سے سپاہیوں کا ایک دل اُٹھا۔ اور دیکھتے دیکھتے فوج شاہی کی پُشت پر آ پہنچا۔ اور کچھ اس جوش و خروش اور اس سرگرمی سے حملہ آور ہُوا کہ فوج شاہی کے قدم اُکھڑ گئے۔ سارا شیرازہ بکھر گیا۔ لوگ متحیر تھے کہ یہ امداد غیب کہاں سے آئی۔ اکثر عقیدت مندوں کو خیال گذرا کہ شاید یہ

فتح کے فرشتے ہیں۔ شہزادوں کی حمایت کو آئے ہیں۔ جب راجہ دریافت حال کے نزدیک گیا تو اُن کے سردار نے گھوڑے سے اتر کر اُس کے روبرو سر تعظیم خم کر دیا۔ راجہ غرور کے نشے سے متوالا ہو گیا۔ یہ سارندھا تھی۔

میدانِ جنگ اس وقت مرقعِ عبرت بنا ہوا تھا۔ چند گھنٹے پہلے سپاہیوں کا ایک پہاڑ کھڑا تھا وہاں بے جان لاشیں پھڑک رہی تھیں۔ حضرت انسان نے ابتدائے آفرینش سے کتنی جانیں قربان کر دی ہیں اور کس بے دردی سے۔

اب فتح نصیب فوج کے سپاہی مالِ غنیمت پر ٹوٹے۔ پہلے زندوں کی زندوں سے جنگ تھی۔ اب زندوں کی مُردوں سے جنگ شروع ہوئی۔ وہ شجاعت اور مردانگی کا نظارہ تھا، یہ حرص اور سفلہ پن کی دل خراش تصویر۔ اس وقت انسان حیوان بنا ہوا تھا۔ اب وہ حیوان سے شیطان بنا ہوا نظر آتا تھا۔

اس نوچ کھسوٹ میں لوگوں کو فوجِ شاہی کے سپہ سالار ولی بہادر خاں کی لاش نیم جان خاک و خون میں آلودہ نظر آئی۔ اُس کے قریب اُس کا گھوڑا دُم سے اُس کی مکھیاں اُڑا رہا تھا۔

راجہ کو گھوڑوں کا شوق تھا۔ اُسے دیکھ کر فریفتہ ہو گیا۔ یہ ایک عراقی نژاد اصیل جانور تھا۔ ایک ایک عضو سانچے میں ڈھلا ہوا، شیر کا سا سینہ، چیتے کی سی کمر، دو آنکھیں جانداری کی دو تصویریں۔ اس کی محبت اور وفاداری دیکھ کر لوگ عش عش کرنے لگے۔ راجہ نے حکم دیا کہ اس زندہ وفا پر کوئی ہتھیار نہ چلائے۔ اسے زندہ گرفتار کر لو۔ یہ میرے اصطبل کی زینت ہوگا۔ جو شخص اسے میرے روبرو لائے گا اُس کا دامنِ مراد زر و جواہر سے بھر دوں گا۔

سوارانِ آزمودہ کار چاروں طرف سے گھوڑے پر پل پڑے مگر کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس کے قریب جا سکے۔ کوئی چمکارتا، کوئی کمند ڈالنے کی فکر کرتا۔ مگر کوئی تدبیر راس نہ آتی۔ ذرا دیر میں وہاں سپاہیوں کا ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا۔ تب سارندھا اپنے خیمے سے نکلی وہ

بے خوف گھوڑے کے قریب چلی گئی۔ اُس کی آنکھوں میں جادُو تھا۔ گھوڑے نے سر جھکا دیا۔ مہارانی نے اُس کی گردن پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اُس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ اسپ وفاشعار ایک بے کسانہ انداز سے اُس کے آنچل میں منہ چھپا کر یوں کھڑا ہو گیا۔ گویا بچّہ گوسفند ہے اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہنے لگی رانی نے مادرانہ شفقت سے اُس کے آنسو پونچھے اور اس کی راس پکڑ کر اپنے خیمے کی طرف چلی۔ گھوڑا خاموش اُس کے پیچھے پیچھے چلا گویا مدتوں کا نمک خوار ہے۔ لوگ تاثیر شفقت کا معجزہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

مگر بہت بہتر ہوتا کہ گھوڑے نے اُس سے بھی بے التفاتی کی ہوتی۔ یہ خوبصورت گھوڑا آگے چل کر اس خاندان کے حق میں آہوئے زرنگار ثابت ہُوا۔

(۵)

دُنیا ایک معرکہ کارزار ہے اس میدان میں اُسی سپہدار کو فتح نصیب ہوتی ہے جس کی آنکھیں موقع شناس ہوتی ہیں۔ وہ موقع دیکھ کر جتنی سرگرمی اور جوش سے آگے بڑھتا ہے اُتنے ہی جوش اور سرگرمی سے خطرے کے مقام پر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ یہ مرد میدان سلطنتیں قایم کرتا اور قومیں بناتا ہے۔ اور تاریخ اس کے نام پر عظمت کے پھول نثار کرتی ہے۔

مگر اس میدان میں کبھی کبھی ایسے سپاہی بھی آجاتے ہیں۔ جو موقع پر قدم بڑھانا جانتے ہیں مگر خطرے پر پیچھے ہٹنا نہیں جانتے۔ یہ سپاہی فتح کے اصولوں پر قربان کر دیتا ہے۔ وہ اپنی فوج کا نام و نشان مٹا دے گا۔ مگر جہاں ایک بار پہنچ گیا ہے وہاں سے قدم پیچھے نہ ہٹائے گا۔ اس ناموقع شناس شخص کو دنیا دی فتح شاذ ہی حاصل ہوتی ہے۔ مگر بسا اوقات اس کی شکست فتوحات سے زیادہ اہم اور زیادہ شاندار ہوتی ہے۔ اگر موقع شناس سپہ سالار سلطنتیں قایم کرتا اور قومیں بناتا ہے۔ تو یہ آن پر جان دینے والا۔ یہ قدم پیچھے نہ ہٹانے والا سپاہی قوموں کے اخلاق کو سُدھارتا اور ان کے دلوں پر اخلاقی عظمت

کا نقش جما تا ہے اُسے دنیا میں کبھی فروغ نہیں مگر جب کسی مجلس یا تقریر میں اُس کا نام زبان پر آجاتا ہے تو حاضرین ہم آہنگ ہو کر اس پر اعزاز کے نعرے بلند کرتے ہیں اور اُس کے نام کے گرد ہمیشہ کیلئے روحانی جلال کا ایک پُر نور ہالہ قائم ہو جاتا ہے۔ سارندھا ہنیں آن پہ جان دینے والے سپاہیوں میں تھی۔

شہزادہ محی الدین چمبل کے کنارے سے آگرہ کی طرف چلا تو اقبال اس کے سر پر مورچھل ہلاتا تھا اور نصرت کامرانی کا نقارہ بجاتی تھی۔ جب وہ آگرہ پہنچا تو شوکت نے اس کے لیے تخت شاہی سجا دیا۔

اورنگ زیب میں قدر شناسی کا احساس کم نہ تھا۔ اُس نے سرداران شاہی کی خطائیں معاف کر دیں۔ اور اُن کے مناصب بحال کئے۔ راجہ چمپت رائے کو اُس کی جاں بازانہ خدمات کے صلے میں منصب دوازدہ ہزاری پر سرفراز کیا۔ اور اورچھا سے بنارس اور بنارس سے جمنا تک جاگیر عطا کی۔ بندیل راجہ نے پھر شاہی اطاعت کا طوق پہنا۔ عشرت کی محفلیں آراستہ ہو گئیں اور ساغر عیش کے دور چلنے لگے ایک بار پھر نغمہ دلپذیر کی صدا بلند ہوئی۔ اور رانی سارندھا پھر فکر و ملال سے گھلنے لگی۔

ولی بہادر خاں بڑا چرب زبان شخص تھا۔ اس کی لطافت زبانی نے بہت جلد شاہ عالمگیر کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ بارگاہ سلطانی میں اُس پر اعزاز کی نگاہیں پڑنے لگیں۔ خاں صاحب کے دل میں اپنے گھوڑے کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم کانٹے کی طرح کھٹکا کرتا تھا۔ ایک روز کنور چھتر سال اُسی گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کو گیا تھا۔ خاں صاحب کے محل کی طرف جا نکلا۔ ولی بہادر خاں ایسے ہی موقع کا منتظر تھا۔ فوراً اپنے آدمیوں کو اشارہ کر دیا۔ راج کمار تنہا کیا کر سکتا تھا۔ پیادہ پا اپنے مکان پر آیا۔ اور سارندھا سے ساری کیفیت بیان کی۔ راج کماری کا چہرہ تمتما گیا بولی "مجھے اس بات کا غم نہیں کہ گھوڑا ہاتھ سے گیا۔ بلکہ غم اس بات کا ہے کہ تو اُسے کھو کر زندہ کیوں لوٹا۔ کیا تیری رگوں میں بندیلوں کا

کا خون نہیں ہے ؟ کوئی پرواہ نہ تھی، اگر تجھے گھوڑا نہ ملتا۔ مگر تجھے ثابت کر دینا چاہیئے تھا کہ بندیل لڑکے سے اُس کا گھوڑا چھین لینا ہنسی نہیں ہے۔"

یہ کہکر اُس نے اپنے پچیس جانبازوں کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ خود سپاہیانہ بانا سجایا اور سپاہیوں کو لے کر دلی بہادر خاں کے مکان پر جا پہنچی۔ خاں صاحب اُسی گھوڑے پر سوار ہو کے دربار چلے گئے تھے۔ سارندھا نے فوراً دربار کی طرف رُخ کیا۔ اور ہوا کی طرح سنسناتی ہوئی دربار شاہی کے مقابل جا پہنچی۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی ارکان دربار میں ہل چل مچ گئی۔ ملازمین شاہی اِدھر اُدھر سے آکر جمع ہو گئے۔ شاہ عالمگیر صحن دربار میں نکل آئے اُمرا اپنے اپنے تیغے اور تلواریں سنبھال کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور چاروں طرف شور مچ گیا۔ کتنی ہی آنکھوں نے اسی دربار میں امر سنگھ کے آبدار تیغے کی جھلک دیکھی تھی۔ اُن کی آنکھوں میں وہی سا نچہ کھینچ گیا۔

سارندھا نے بلند آواز میں کہا، "خاں صاحب بڑے شرم کی بات ہے کہ آپ نے وہ مردانگی جو دریائے چمبل کے کنارے دکھانی چاہیئے تھی۔ آج ایک طفلِ شیرخوار کے مقابلے میں دکھائی ہے۔ کیوں کیا یہ مناسب تھا کہ آپ لڑکے سے گھوڑا چھین لیتے۔"

دلی بہادر خاں کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ تند لہجے میں بولے "کسی غیر کو کیا اختیار ہے کہ میری چیز اپنے تصرّف میں لائے۔"

رانی۔ وہ آپ کی چیز نہیں وہ میری چیز ہے۔ اُسے مَیں نے رن بھوم میں پایا ہے۔ اور اتنی آسانی سے آپ اُسے میرے ہاتھ سے نہیں چھین سکتے۔ مَیں اس کے پیچھے ایک ہزار سواروں کا خون بہا دوں گی۔

خاں صاحب۔ وہ گھوڑا میں نہیں دے سکتا۔ اس کے عوض مَیں اپنا اصطبل خالی کر سکتا ہُوں۔

رانی۔ مَیں اپنا گھوڑا لوں گی۔

خاں صاحب۔ میں اس کے ہموزن زر و جواہر دے سکتا ہوں۔ مگر گھوڑا نہیں دے سکتا
رانی۔ اس کا فیصلہ تلواریں کریں گی۔

بندیل نوجوانوں نے میان سے تلواریں کھینچیں اور قریب تھا کہ کشت و خون کا بازار گرم ہو۔ عالمگیر نے بیچ میں آکر فرمایا۔ "رانی صاحبہ! آپ اپنے سپاہیوں کو روکیں۔ گھوڑا آپ کو مل جائے گا۔ مگر اس کی قیمت بہت گراں ہوگی۔

رانی۔ میں اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔

عالمگیر۔ جاگیر اور منصب بھی؟

رانی۔ جاگیر اور منصب کوئی چیز نہیں۔

عالمگیر۔ اپنا راج بھی؟

رانی۔ اس کی بھی میرے نزدیک کچھ ہستی نہیں ہے۔

عالمگیر۔ ایک گھوڑے کے مقابلے میں؟

رانی۔ جی نہیں۔ اس چیز کے مقابلے میں جو دنیا میں سب سے زیادہ پیاری ہے۔

عالمگیر۔ وہ کیا ہے؟

رانی۔ اپنی آن!

اس طرح رانی سارندھا نے ایک گھوڑے کے لئے اپنی وسیع جاگیر، اونچا منصب اور شاہی اعزاز سب ہاتھ سے کھو دیا۔ اور صرف اتنا ہی نہیں، آئندہ کے لئے شاہی عتاب کو بیعانہ دیا۔ اس گھڑی سے دمِ آخر تک چمپت رائے کو اطمینان نصیب نہ ہوا۔

(۶)

راجہ چمپت رائے نے پھر قلعہ چیر کھیر میں بود و باش اختیار کی۔ اُن کو منصب و جاگیر کے ہاتھ سے نکل جانے کا ملال ضرور ہوا۔ مگر حرفِ شکایت لبوں پر نہیں لائے وہ سارندھا کے مزاج سے خوب واقف تھے۔ کچھ دنوں تک عافیت سے گزری مگر عالمگیر سارندھا کے

سخت الفاظ بھولا نہ تھا۔ جوں ہی بھائیوں کی طرف سے اطمینان ہوا۔ اُس نے ایک فوج جرار چمپت رائے کی سرزنش کے لئے روانہ کی اور بائیس سپہداران آزمودہ کار اس مہم پر مامور ہوئے۔ بسبھ کرن بندیلہ شاہی صوبہ دار تھا۔ چمپت رائے کے بچپنے کا کھلاڑ اور ہم نوالہ دوست۔ اُس نے چمپت رائے کو خاک میں ملانے کا بیڑا اُٹھایا اور بھی کتنے ہی بندیل سردار راجہ سے منحرف ہو کر شاہی صوبہ دار سے آملے اور ایک خونریز معرکہ ہوا۔ الطاف شاہی نے بھائیوں کی تلواریں بھائیوں کے خون سے رنگین کرادیں۔ گو اس مہم میں راجہ کو فتح نصیب ہوئی مگر اُس کی طاقت ہمیشہ کیلئے زائل ہو گئی۔ گردو پیش کے بندیل رؤسا جو اس کی لپشت پناہ تھے عنایات خسروی کے دام میں پھنس گئے۔ رفقاء جان نثار کچھ تو کام آئے کچھ دغا کر گئے۔ اعزہ آنکھیں چرانے لگے۔ مگر ان مشکلات کے باوجود چمپت رائے کے حوصلے لیست نہیں ہوئے۔ اُس نے جبر جمہ کو جیر باد کہی اور تین سال تک بندیل کھنڈ کے کوہ و بیابان میں گھومتا رہا۔ شاہی فوجیں شکاری جانور کی طرح سارے ملک میں منڈلا رہی تھیں۔ راجہ کو آئے دن کسی نہ کسی سے سابقہ پڑ جاتا تھا۔ ان موقعوں پر اُس کی دلیری معجزے دکھاتی تھی۔ سارندھا ہمیشہ اس کے پہلو میں رہتی اور اُس کا حوصلہ بڑھایا کرتی۔ بڑے بڑے سخت معرکوں میں بھی کہ صبر رخصت ہو جاتا اور اُمید ساتھ چھوڑ دیتی۔ خودداری کا فرض اس کے پیش نظر رہتا۔ تین سال تک یہی کیفیت رہی۔ آخر صوبہ داران شاہی نے تنگ آکر شاہ عالمگیر کو عرضداشت بھیجی کہ اس شیر کا شکار حضور کے سوا اور کسی سے نہ ہو گا۔ جواب آیا کہ فوجیں ہٹا لو۔ اور محاصرے اُٹھالو۔ راجہ نے سمجھا کہ ان بلاؤں سے نجات ہوئی اور جھا کے قلعے میں آبسا۔ مگر جس طرح برسات کے دنوں میں آفتاب ذرا دیر کے لئے ابر سیہ فام کے پردے سے نکل کر پھر غائب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح چند مہینوں کے امن کے بعد راجہ کو پھر آوارہ دشت غربت ہونا پڑا۔

(۷)

تین ہفتوں سے شاہی فوج نے اودچھا کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ جس طرح کلمۂ سخت جگر کو چھلنی کر دیتا ہے۔ اسی طرح توپ کے گولوں نے فصیلوں کی حالت کر رکھی ہے قلعے میں بیس ہزار آدمی محصور ہیں۔ مگر ان میں سے نصف سے زائد عورتیں اور ان سے کچھ ہی کم بچے ہیں، مردوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ آمد و رفت کے راستے چاروں طرف سے بند ہیں، ہوا کا بھی گذر نہیں، رسد کا ذخیرہ بہت کم رہ گیا ہے۔ عورتیں اپنے مردوں اور بچوں کو زندہ رکھنے کیلئے خود فاقے کرتی ہیں، اس خوف نے کہ چند دنوں میں ہم آب و دانہ بغیر تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے، لوگوں کو نیم جان کر رکھا ہے۔ عورتیں سورج دیوتا کی طرف ہاتھ اٹھا کر غنیم کو کوستی ہیں۔ بچے جھنجلا جھنجلا کر فصیلوں کی آڑ سے اُن پر پتھر پھینکتے ہیں، جو مشکل سے دیوار کے اس پار جاتے ہیں۔ سوء اتفاق سے راجہ چمپت رائے بھی مرض بخار میں مبتلا ہیں۔ کئی دن ہوئے ضعف نے انہیں پلنگ سے اُٹھنے نہیں دیا۔ انہیں دیکھ کر یاس زدہ دلوں کو تسکین ہوتی تھی۔ مگر ان کی بیماری نے سارے قلعے میں قیامت برپا کر رکھی ہے۔

راجہ نے سارندھا سے کہا "سارن! آج دشمن ضرور قلعے کے اندر گھس آئیں گے"

سارن۔ ایشور نہ کرے کہ ان آنکھوں سے وہ دن دیکھنا پڑے

راجہ:۔ مجھے بڑی فکر ان غریب عورتوں اور بچوں کی ہے، گیہوں کے ساتھ یہ بے گناہ گھن کی طرح پیسے جاتے ہیں۔

سارن:۔ ہم لوگ یہاں سے نکل جائیں تو کیا؟

راجہ:۔ ان بے کسوں کو چھوڑ کر

سارن:۔ ان پر یہ آفت ہماری لائی ہوئی ہے۔ ہم نہ ہوں گے تو شاید دشمن ان کے ساتھ رحم سے پیش آئے۔

راجہ:۔ نہیں یہ لوگ مجھ سے نہ چھوڑے جائیں گے۔ جن مردوں نے ہمارے اوپر اپنی جان نثار کر دی ہے اُن کی عورتوں اور بچوں کو میں اِس طرح نہیں چھوڑ سکتا

سارندھا:۔ مگر یہاں رہ کر ہم اُن کی کچھ مدد بھی تو نہیں کر سکتے۔

راجہ:۔ ان کے ساتھ مر تو سکتے ہیں۔ میں ان کی حفاظت میں اپنی جان لڑا دوں گا۔ میں اُن کے لئے شاہی فوج سے منتیں کروں گا۔ قید کی مصیبتیں جھیلوں گا۔ مگر اس آفت میں چھوڑ نہیں سکتا۔

سارندھا نے ندامت سے گردن جھکا لی۔ اور سوچنے لگی۔ بے شک اپنے رفیقوں کو آگ کی آنچ میں چھوڑ کر اپنی جان بچانا دلیری نہیں۔ میں ایسی خود غرض کیوں ہو گئی ہوں۔ مگر اپنے شوہر کو اطاعت کی ذلت سے بچانے کی فکر جذبۂ انسانیت پر غالب آ گئی تھی۔ پھر بولی۔ "اگر آپ کو یقین ہو جائے کہ ان آدمیوں کے ساتھ ظلم نہ کیا جائے گا۔ تب تو آپ کو چلنے میں کوئی عذر نہ ہو گا؟"

راجہ (سوچ کر) کون یقین دلائے گا؟

سارندھا۔ شاہی سپہ سالار کی تحریر۔

راجہ۔ ہاں تب میں چلوں گا۔ مگر ایک شرط پر۔ جب یہ لوگ بھی مجھے بخوشی رخصت کر دیں۔

سارندھا خیال میں ڈوب گئی۔ شاہی سپہ سالار سے یہ معاہدہ کس طرح لوں۔ کون پیغام لے جائے گا۔ اور یہ ظالم ایسا معاہدہ کرنے ہی کیوں لگے۔ انہیں تو یقین کامل ہے کہ دو چار روز میں ہمیں فتح ہو جائے گی۔ اور ہماری طرف سے اطاعت کا پیغام کیوں نہ قبول کریں گے اور جب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ ہمارے ساتھ دغا کی گئی ہے۔ تب تو ان غریبوں کے سر یہ آفت آ جائے گی۔ میرے یہاں ایسا چرب زبان۔ معاملہ فہم کون ہے۔ جو یہ مشکل آسان کر دے چھتر سال شاید یہ کام پورا کر دکھائے۔

یہ خیال کر کے رانی نے چھتر سال کو بلایا۔ یہ اس کے چاروں بیٹوں میں سب سے زیادہ دلیر، حسین اور شیریں زبان تھا۔ رانی اُسے سب لڑکوں سے زیادہ پیار کرتی تھی جس وقت چھتر سال نے آکر اُسے پرنام کیا۔ تو رانی کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں اور کلیجے سے ایک سرد آہ نکل گئی۔

چھتر سال: ماتا جی۔ میرے لئے کیا حکم ہوتا ہے؟

رانی۔ آج لڑائی کی کیا کیفیت ہے؟

چھتر سال۔ ہمارے پچاس آدمی اب تک مر چکے ہیں۔

رانی۔ بندیلوں کی لاج اب ایشور کے ہاتھ میں ہے۔

چھتر سال۔ آج ہم لوگ رات کو شب خون مارنے کی فکر میں ہیں۔

رانی نے چند لفظوں میں اپنی تجویز اس سے بیان کی اور پھر پوچھنے لگی "یہ کام کس کے سپرد کیا جائے۔"

چھتر سال۔ میرے۔

رانی۔ تم اسے پورا کر آؤ گے؟

چھتر سال۔ ہاں مجھے یقین ہے۔

چھتر سال جب یہاں سے چلا تو رانی نے اُسے سینے سے لگا لیا اور دعا دے کر بولی! ایشور تمہاری صورت جلد دکھائے اور پھر دیر تک روتی رہی اس کے بعد آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ "ایشور! میں نے اپنا جوان۔ دلیر۔ ہونہار بیٹا بندیلوں کی آن کے بھینٹ کر دیا۔ اب اس آن کو نباہنا تیرا کام ہے۔ میں نے بڑی پیاری چیز بھینٹ کی ہے اسے قبول کر۔"

(۸)

دوسرے روز صبح کے وقت سارندھا اشنان کر کے تھال میں پوجا کا سامان لئے مندر

کو چلی، اُس وقت اس کا چہرہ زرد تھا، اور آنکھوں میں اندھیرا چھایا جاتا تھا۔ نیند کا سکون بخش جادو فکرمند دلوں پر نہیں چلتا۔ وہ مندر کے دروازے پر پہنچی تھی کہ اُس کے تھال میں ایک تیر آ کر گرا۔ اس کی نوک پر ایک کاغذ کا پُرزہ لپٹا ہُوا تھا۔ سارندھا نے تھال مندر کے چبوترہ پر رکھ دیا اور کاغذ کے پُرزے کو دیکھا۔ تو چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ مگر یہ شگفتگی ذرا دیر کی مہمان تھی۔ "آہ! اس کاغذ کے پُرزے کے لئے میں نے ایک جوان بیٹا ہاتھ سے کھویا ہے۔ کاغذ کے ٹکڑے کو اتنی گراں قیمت پر کس نے خریدا ہوگا۔"

سارندھا مندر سے لوٹ کر راجہ چمپت رائے کے پاس گئی۔ اور بولی۔ "جیون ناتھ! آپ نے رات کو جو وعدہ کیا تھا۔ وہ اب پورا کرنا ہوگا۔"

راجہ نے چونک کر پوچھا "تم نے اپنا وعدہ پورا کر لیا؟"

رانی نے وہ تحریری معاہدہ راجہ کو دے دیا۔ چمپت رائے نے اُسے بغور دیکھا بعد ازاں بولے۔ "ہاں مجھے اطمینان ہو گیا۔ اب میں چلوں گا۔ اور ایشور نے چاہا۔ تو ایک دفعہ پھر ان دشمنوں کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھاؤں گا۔ مگر سارن! سچ بتانا۔ اس کاغذ کا کیا مول ہے؟"

رانی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "بہت گراں۔"

راجہ۔ آخر؟

رانی۔ ایک جوان بیٹا۔

راجہ کو سکتہ سا ہو گیا۔ چیخ کر بولے "کون۔ انگد رائے؟"

رانی۔ نہیں۔

راجہ۔ رتن ساہ۔

رانی۔ نہیں۔

راجہ۔ چھتر سال؟

رانی۔ ہاں۔

جس طرح طائر بسمل اُوپر اچھلتا ہے۔ اور بے جان ہو کر گر پڑتا ہے۔ اُسی طرح چمپت رائے پلنگ سے اُچھلے اور پھر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ چھتر سال اُنہیں بہت پیارا تھا۔ اور ان کی زندگی کے سارے حوصلے اُسی سے وابستہ تھے۔ جب آدھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا تو بولے۔ سارن۔ مجھے پہلے معلوم ہوتا تو چھتر سال ہاتھ سے نہ جانے پاتا۔ چھتر سال مارا گیا تو مندیل بنس کا چراغ گل ہو جائے گا۔

وہ رات قلعہ والوں کے لئے غم و ماتم کی رات تھی۔ عورتیں سارندھا کے پاؤں پر گر گر کہتیں کہ ہمیں بھول نہ جانا۔ مرد راجہ سے منتیں کرتے کہ ہم نے سائے کی طرح آپ کا ساتھ دیا ہے۔ ہم کو بھی لیتے چلئے۔ ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ سارندھا نے عورتوں کو گلے لگایا چمپت رائے مردوں سے رخصت ہوئے اور ہزاروں مردوں عورتوں کو روتے چھوڑ کر پالکی میں بیٹھ گئے۔ سب آدمیوں کے دل کہہ رہے تھے کہ اب تمہاری آنکھیں چمپت رائے کو پھر نہ دیکھیں گی۔ یہ آخری ملاقات ہے۔ اس لئے خوب جی بھر کر رو لو۔ کسے گمان تھا کہ یہ سکھپال نہیں جنازہ ہے۔

اندھیری رات تھی۔ آسمان کے تاروں کے بے شمار چراغ جلا رکھے تھے۔ مگر شمع مزار کی طرح ان کی روشنی بہت دھندلی تھی۔ قلعے کے در و دیوار پر حسرت برس رہی تھی آہ و زاری کی دلخراش صدائیں آرہی تھیں اور رانی سارندھا سپاہیانہ لباس پہنے گھوڑے پر سوار چمپت رائے کو پالکی میں بٹھائے قلعے کے زمین دوز راستے سے نکلی جاتی تھی۔

آج سے بہت دن پہلے ایک دن ایسی ہی اندھیری اور غمناک رات تھی جب سارندھا کا دل مزہ الفت سے غیر مانوس تھا۔ شیتلا دیوی کی زبان سے اس وقت جو بچن نکلے وہ آج پورے ہوئے۔ کیا سارندھا کا وہ جواب بھی پورا ہوگا؟

(۹)

دوپہر کا وقت تھا۔ آفتاب نصف النہار پر آکر آگ کے تیرالے برسا رہا تھا۔ ملتان کے جھلسنے والی تند تیز شور ہوا شعلہ سوزاں کی طرح وادی و صحرا میں آگ لگاتی پھر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اگن دیوتا کی ساری فوج گرجتی ہوئی چلی آتی ہے زمین سے لیکر آسمان تک غبار آتشین کا ابر چھایا ہوا تھا۔ رانی سارندھا گھوڑے پر سوار چمپت رائے کو لئے مغرب کی طرف چلی جا رہی تھی۔ اورچھا دس کوس پیچھے چھوٹ چکا تھا اور یہ خیال کہ اب ہم خطرے کے دائرے سے باہر نکل آئے۔ غالب آتا جاتا تھا۔ راجہ پالکی میں بے سُدھ پڑے ہُوئے تھے۔ اور کہار پسینے میں تر ابور تھے۔ پالکی کے پیچھے پانچ سوار گھوڑے بڑھائے چلے آتے تھے۔ پیاس کے مارے سب کے قافلے کا بُرا حال تھا۔ کلیجے لبوں پر آ رہے تھے۔ سایہ دار درخت اور کنوؤں کی تلاش میں نگاہیں دوڑ رہی تھیں۔

دفعتاً سارندھا نے پیچھے کی طرف پھر کر دیکھا تو اُسے سواروں کی ایک جماعت نظر آئی۔ اُس کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں۔ یہ لوگ ضرور ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ پھر خیال گذرا کہ شاید میرے راجکمار آدمیوں کو لیکر میری مدد کو آ رہے ہیں۔ عالم یاس میں بھی اُمید کا رشتہ نہیں ٹوٹتا۔ ذرا دیر تک وہ اسی اُمید و بیم کی حالت میں رہی۔ یہاں تک کہ وہ جماعت قریب آ گئی۔ اور سپاہیوں کا لباس صاف نظر آنے لگا رانی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور سر پیٹ لیا۔ یہ لوگ شاہی فوج کے سپاہی تھے۔

سارندھا نے کہاروں سے کہا۔ ڈولی روک لو۔ بندیل سپاہیوں نے بھی تلواریں کھینچ لیں۔ راجہ ضعف و نقاہت کے مارے نیم جان ہو رہے تھے۔ مگر جس طرح دبی ہوئی آگ ہوا لگتے ہی مشتعل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یہ کیفیت دیکھتے ہی ان کے تن بے جان میں جان آ گئی۔ پالکی کا پردہ اُٹھا کر باہر نکل آئے۔ تیر و کمان ہاتھ میں لے لی۔ مگر وہ

کمان جو اُن کے ہاتھ میں پیام مرگ بن جاتی تھی۔ اس وقت شاخ بید کی طرح خم کھا گئی، سر میں چکّر آیا۔ پاؤں تھرّانے لگے اور زمین پر گر پڑے یقین ہو گیا کہ ہمارے اقبال کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اُس طائر بے پر کی طرح جو سانپ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اوپر کو اُچکتا اور پھر زمین پر گر پڑتا ہے۔ راجہ چمپت رائے پھر اُٹھے اور پھر گر پڑے، سارندھا نے اُنہیں سنبھال کر بٹھایا۔ اور آبدیدہ ہو کر بولی۔ "پران ناتھ!" اس کے آگے اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا۔ ایسے موقع پر خموشی فصاحت سے بھی زیادہ فصیح ہو جاتی ہے۔ غریب سارندھا اس وقت عام عورتوں کی طرح کمزور نظر آرہی ہے۔ لیکن ایک خاص حد تک کمزوری عورتوں کی خصلت کا سنگار ہے۔

چمپت رائے نے کہا۔ "سارن! دیکھ ہمارا ایک سپاہی اور موت کا شکار ہوا۔ افسوس جس ذلت سے زندگی بھر بچتا رہا۔ وہ آج مرتے دم نصیب ہوئی۔ میری آنکھوں کے سامنے دشمن تمہارے پاک جسم کو ہاتھ لگائیں گے اور میں جگہ سے نہ ہل سکوں گا۔ ہائے وقت کب آئے گی؟"

یہ کہتے کہتے اُنہیں ایک خیال آگیا۔ تیغے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر ہاتھ بے جان ہو رہے تھے تب سارندھا سے، "سارن! تم نے بہت موقعوں پر میری آن نبا ہی ہے۔"

اتنا سنتے ہی سارندھا کی کمزوری رخصت ہو گئی۔ آنسو خشک ہو گئے اور مرجھائے ہوئے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ یہ اُمید کہ ابھی میں اپنے پران ناتھ کے کچھ کام آسکتی ہوں اُسے ہوش میں لے آئی۔ راجہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ "ایشور نے چاہا تو مرتے دم تک نباہوں گی۔"

رانی نے سمجھا۔ شاید راجہ مجھ سے میری جان مانگ رہے ہیں۔

چمپت رائے: میں نے جو کچھ کہا ہے اُسے تم نے ہمیشہ مانا ہے۔

سارندھا، مرتے دم تک مانوں گی۔

چمپت رائے۔ شاید یہ میری آخری درخواست ہو۔ اسے ردّ نہ کرنا۔

سارندھا نے تیغہ نکال کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اور بولی " یہ آپ کی درخواست نہیں، یہ میری آرزو ہے کہ مروں تو سر آپ کے قدموں پر ہو "

چمپت۔ تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔ کیا تم مجھے اس لئے دشمنوں کے ہاتھ میں چھوڑ جاؤ گی کہ بیڑیاں پہنے ہوئے دلّی کی گلیوں میں نشانہ تضحیک ہوں۔؟

رانی نے متحیّر ہو کر راجہ کی طرف دیکھا۔ اُن کا مطلب نہ سمجھی۔

چمپت۔ میں تم سے ایک بر داں مانگتا ہوں۔

رانی۔ شوق سے مانگئے۔

چمپت۔ یہ میری آخری التجا ہے۔ جو کچھ کہوں گا کرو گی؟

رانی۔ سر کے بل کروں گی۔ شوق سے فرمائیے۔

راجہ۔ دیکھو تم نے زبان دی ہے۔ انکار نہ کرنا

رانی۔ (کانپ کر) فرمائیے۔

راجہ۔ اپنا تیغہ میرے سینے میں چبھو دو۔

رانی کے دل پر بجلی سی گر پڑی۔ بولی۔ پران ناتھ! ایسا کبھی ہوا ہے

راجہ۔ میں بیڑیاں پہننے کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا۔

رانی۔ مجھ سے کیسے ہو گا؟

پانچواں اور آخری سپاہی زخم کھا کر گرا۔ راجہ نے جھنجلا کر کہا۔ اسی جگر پر آن نبھانے کا دعوے تھا۔

شاہی سپاہی راجہ کی طرف لپکے کہ اتنے میں رانی نے اپنا تیغہ آب دار نکال کر راجہ کے سینے میں چبھو دیا۔ پریم کی ناؤ پریم کے ساگر میں غوطہ لگا گئی۔ راجہ کے کلیجے سے خون نکل رہا تھا۔ اور چہرے پہ تبسّم تھا۔

کیا عبرت ناک نظارہ ہے۔ وہ عورت جو اپنے شوہر پر قربان ہوتی تھی آج اس کی قاتلہ ہے جس سینے سے لپٹ کر اس نے شباب کی بہاریں لوٹیں جو سینہ اس کی امیدوں کا کاشانہ اور اس کی آرزوؤں کا آشیانہ تھا۔ جو سینہ اس کی عزت کا پاسباں اور اس کی محبت کا گنجینہ تھا۔ اس سینے کو آج سارندھا کی تلوار چوم رہی ہے اس بحر الفت میں آج پریم کی ناؤ تیر رہی ہے ہاں یہ تلوار فرض کی کٹار ہے۔ یہ تلوار پریم کی برچھی ہے۔ کس عورت کی تلوار سے ایسا کام ہوا ہے؟

آہ خودداری کا کیسا حسرت ناک انجام ہے اودے پور اور مارواڑ کے کارناموں میں بھی خودداری اور علو ہمت کی ایسی مثال نہیں ملتی۔ عورت کے لئے اپنی جان دے دینا بہت آسان ہے مگر یہ وہ کام ہے جو سارندھا کے سوا کبھی کسی عورت سے نہیں ہوا۔ نفس کے بہکانے سے دل کی جلن سے عورتوں نے اپنے مردوں کی جانیں لی ہیں مگر ادائے فرض پتی برت اور آن پروری نے ایسی شاندار قربانی کبھی نہیں پائی۔

شاہی سپاہی سارندھا کی یہ جرأت اور اوسان دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ عداوت نے احترام کو جگہ دی۔ سردار نے آگے بڑھ کر کہا۔ "رانی صاحبہ خدا گواہ ہے ہم سب آپ کے بندۂ بے درم ہیں۔ آپ کا جو حکم ہو بسر و چشم بجا لائیں گے۔"

سارندھا نے ہنس کر کہا۔ "اگر ہمارے بیٹوں میں سے کوئی زندہ ہو تو دونوں لاشیں اسے سونپ دینا۔" یہ کہہ کر وہی خون آلودہ تیغہ اپنے سینے میں گھونپ لیا۔ جب وہ زمین پر گری۔ تو اس کا سر راجہ چمپت رائے کے سینے پر تھا۔

راج ہٹ

(۱)

دسہرے کے دن تھے۔ اچل گڑھ میں جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دربار عام میں مشیران سلطنت کے بجائے اپسرائیں جلوہ افروز تھیں۔ دھرم شالوں اور سراؤں میں گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ ریاست کے ملازم کیا چھوٹے بڑے رسد پہنچانے کے حیلے سے دربار عام میں جمے رہتے۔ کسی طرح ہٹائے نہ ہٹتے تھے۔ دربار خاص میں پنڈت اور پجاری اور مہنت لوگ آسن جمائے پاٹھ کرتے ہوئے نظر آتے تھے وہاں کسی ملازم سرکار کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی۔ گھی اور پوجا کی سامگری نہ ہونے کے باعث صبح کی پوجا شام کو ہوتی تھی۔ رسد نہ ملنے کی وجہ سے پنڈت لوگ ہون کے گھی اور میوہ جات کو بھوگ کے اگن کنڈ میں ڈالتے۔ دربار عام میں انگریزی انتظام تھا۔ اور دربار خاص میں ریاست کا۔

راجہ دیومل بڑے صاحب حوصلہ رئیس تھے۔ اس سالانہ جشن میں وہ بے دریغ روپیہ خرچ کرتے جن دنوں قحط پڑا، ریاست کے آدمی آدھے سے زائد بھوک سے تڑپ کر مر گئے۔ بخار، ہیضہ اور پلیگ میں ہزاروں آدمی ہر سال لقمۂ مرگ بن جاتے تھے۔ ریاست مفلس تھی، اس لئے نہ وہاں مدرسے تھے نہ شفاخانے نہ سڑکیں۔ برسات میں رنواس میں دلدل ہو جاتا اور اندھیری راتوں میں شام سے گھروں کے دروازے بند ہو جاتے اندھیری سڑکوں پر چلنا جان جوکھم تھا۔ یہ سب اور ان سے بھی زیادہ تکلیف دہ باتیں گوارا تھیں مگر یہ غیر ممکن، دشوار محال تھا۔ کہ درگا دیوی کا سالانہ جشن نہ ہو۔ اس سے شان ریاست

میں بٹہ لگنے کا خوف تھا، ریاست مٹ جائے، محلوں کی اینٹیں بک جائیں مگر یہ جشن ضرور ہو۔ قرب و جوار کے راجہ رئیس مدعو کئے جاتے اُن کے شامیانوں سے میلوں تک سنگ مرمر کا ایک شہر بس جاتا۔ ہفتوں تک خوب چہل پہل دھوم دھام رہتی اسی کی بدولت اچل گڑھ کا نام اٹل ہو گیا تھا۔

(۲)

مگر کنور اندرمل کو راجہ صاحب کی ان رندانہ سرگرمیوں سے بالکل عقیدت نہ تھی۔ وہ خلقتہً ایک بہت متین اور سادہ منش نوجوان تھا۔ یوں غضب کا دلیر، موت کے سامنے بھی خم ٹھونک کر اتر پڑے۔ مگر اس کی شجاعت خون کی پیاس سے پاک تھی۔ اس کے وار بے پر کے طائروں یا بے زبان جانوروں پر نہیں پڑتے تھے۔ اس کی تلوار کمزوروں پر نہیں اٹھتی تھی۔ درماندوں کی حمایت، بیکسوں کی سفارشیں، غربا کی دست گیری اور فلک زدوں کی زخم شوئی، ان کاموں سے اسے روحانی مناسبت تھی۔ دو سال ہوئے وہ اندور کالج سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا کر لوٹا تھا۔ اور تب سے اس کا یہ جوش راہ اعتدال اور مصلحت کی حدود سے متجاوز ہو گیا تھا۔ چوبیس سال کا قوی ہیکل جوان نازو نعمت میں پلا ہوا۔ جیسے فکر کی کبھی ہوا تک نہ لگی۔ اگر کبھی رلایا تو ہنسی نے۔ وہ ایسا نیک شعار ہو۔ اس کے مردانہ چہرے سے غور و خوض کی زردی اور تصور کی جھریاں نظر آئیں۔ یہ غیر معمولی بات تھی۔ جشن مبارک کا دن قریب آ پہنچا تھا۔ صرف چار دن باقی تھے۔ جشن کا انتظام مکمل ہو چکا تھا۔ صرف اگر کسر تھی تو کہیں کہیں نظر ثانی کی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ راجہ صاحب رنواس میں بیٹھے ہوئے چند منتخب اپسراؤں کا گانا سن رہے تھے۔ اُن کی سُریلی تانوں سے جو خوشی ہو رہی تھی اُس سے بدرجہا حظ اس خیال سے ہوتا تھا کہ یہ ترانہ ریزیاں پولیٹکل ایجنٹ کو پھڑکا دیں گی۔ وہ آنکھیں بند کر کے سُنے گا۔ اور فرط مسرت سے اُچھل اُچھل پڑے گا۔

اس خیال سے جو لطف اور نشہ تھا وہ تان سین کی تانوں میں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ آہ! اس کی زبان سے بے ساختہ داد نکل پڑے گی۔ عجب نہیں اُٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملا لے اور میرے انتخاب کی داد دے۔ اتنے میں کنور اندر مل بہت سادہ کپڑے پہنے خدمت میں باریاب ہوئے اور سرِ نیاز خم کیا۔ راجہ صاحب کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ مگر کنور صاحب کی بے موقع مداخلت ناگوارِ خاطر ہوئی۔ اربابِ نشاط کو وہاں سے اُٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

کنور اندر مل بولے "مہاراج! کیا میری منت سماجت پر بالکل دھیان نہ دیا جائے گا۔"

راجہ صاحب ولیعہد کی عزت کرتے تھے اور محبت تو قدرتی بات تھی۔ تاہم انہیں یہ بے موقع ہٹ ناگوار ہوتی۔ وہ اتنے کم نظر نہ تھے، کہ کنور صاحب کے نیک مشوروں کی قدر نہ کریں۔ خرچ ریاست زیرِ بار ہوتی جاتی تھی، اور رعایا پر بہت ظلم کرنا پڑتا تھا۔ میں اندھا نہیں ہوں کہ ایسی موٹی موٹی باتیں نہ سمجھ سکوں۔ مگر اچھی باتیں بھی موقع اور محل دیکھ کر کی جاتی ہیں۔ آخر نام و نمود عزت و آبرو بھی تو کوئی چیز ہے۔ ریاست میں سنگ مرمر کی سڑکیں بنوا دوں۔ گلی گلی مدرسے کھول دوں۔ گھر گھر کنوئیں کھدوا دوں۔ دواؤں کی نہریں جاری کر دوں۔ مگر دسہرہ کی دھوم دھام سے ریاست کی جو عزت اور شہرت ہے وہ ان باتوں سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بتدریج یہ خرچ گھٹا دوں مگر یکبارگی ایسا کرنا نامناسب ہے اور ناممکن۔ جواب دیا۔ "آخر تم کیا چاہتے ہو۔ کیا دسہرہ بالکل بند کر دوں؟"

اندر مل نے راجہ صاحب کے تیور بدلے ہوئے دیکھے، مؤدبانہ انداز سے بولے "میں نے کبھی دسہرے کے جشن کے خلاف زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ یہ ہمارا قومی نشان ہے، یہ فتح و نصرت کا مبارک دن ہے۔ رقص و سرود سے اس دن کی متانت اور عظمت ڈوب جاتی ہے۔

راجہ صاحب نے طنزیہ لہجے میں فرمایا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ رو رو کر جشن منائیں۔ ماتم کریں۔"

اندرمل نے تیکھے ہو کر کہا "یہ آئینِ انصاف کے خلاف ہے کہ ہم تو جشن منائیں اور ہزاروں آدمی اس کی بدولت ماتم کریں۔ بیس ہزار مزدور ایک مہینے سے مفت میں کام کر رہے ہیں کیا ان کے گھروں میں بھی جشن ہو رہا ہے۔ جو پسینہ بہائیں وہ روٹیوں کو ترسیں اور جنہوں نے حرامکاری کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ وہ ہماری محفلوں کی زینت بنیں۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ جور و ستم نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس عذاب میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ منہ چھپا کر کہیں نکل جاؤں۔ ایسے راج میں رہنا میں اپنے اصول کے خلاف اور شرمناک سمجھتا ہوں۔"

اندرمل نے طیش میں یہ گستاخانہ باتیں کہیں۔ مگر الفت پدری کو جگانے کی کوشش نے راج ہٹ کے سوئے ہوئے دیو سیاہ کو جگا دیا۔ راجہ صاحب پُر غضب نگاہوں سے دیکھ کر بولے "ہاں میں بھی یہی بہتر سمجھتا ہوں۔ تم اپنے اصول کے پکے ہو تو میں بھی اپنی دھن کا پورا ہوں۔"

اندرمل نے مسکرا کر راجہ صاحب کو سلام کیا۔ اس کا مسکرانا زخم پر نمک ہو گیا۔ اشکبار آنکھوں کی چند بوندیں شاید مرہم کا کام دیتیں۔

(۳)

راج کمار نے ادھر پیٹھ پھیری۔ ادھر راجہ صاحب نے پھر میراثیوں کو بلایا اور پھر نغمہ جاں نواز کی صدائیں بلند ہو گئیں۔ ان کا دریائے نغمہ سنجی کبھی اتنے زور و شور سے نہیں امڈا تھا۔ واہ واہ کی رَو آئی ہوئی تھی۔ تالیوں کا تلاطم برپا تھا۔ اور سر کی کشتی اس دریائے پُر شور میں ہنڈولے کی طرح جھول رہی تھی۔

یہاں تو عیش و طرب کا ہنگامہ گرم تھا اور رنواس میں نالۂ دلگیر تھا۔ رانی بھان کنور درگا کی پوجا کر کے لوٹ رہی تھی۔ کہ ایک لونڈی نے آ کر اس سانحۂ دلخراش کی اطلاع دی۔ رانی نے آرتی کا تھال زمین پر پٹک دیا۔ وہ ایک ہفتہ سے درگا کا برت رکھتی

تھیں۔ مرگ چھالے پر موتی اور دودھ کا اہار کرتی تھیں، یا پاؤں تھراتے زمین پر گر پڑیں مُرجھایا ہُوا پھول ہوا کے جھونکے کو نہ سہہ سکا۔ چیریاں سنبھل گئیں اور رانی کے چاروں طرف حلقہ باندھ کر چھاتی اور سر پیٹنے لگیں۔ بین اور بکا کی پُر جوش صدائیں بُلند ہوئیں آنکھوں میں آنسُو نہ تھے، آنچلوں سے اُن کا پردہ چُھپا ہُوا تھا۔ مگر گلے میں آواز تو تھی۔ اسوقت اس کی ضرورت تھی۔ اسی کی بلندی اور گرج میں اس وقت بخت رسا کی جھلک نمودار تھی۔

لونڈیاں تو یوں محو وفا تھیں۔ اور تھان کنور اپنے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کنور سے ایسی بے ادبی کیونکر ہوئی؟ یہ خیال میں نہیں آتا۔ اُس نے کبھی میری باتوں کا جواب نہیں دیا۔ ضرور راجہ کی زیادتی ہے۔

اس نے ناچ رنگ کی مخالفت کی ہوگی۔ کیا ہی چاہئے۔ انہوں کیا۔ جو کچھ بیتے بگڑے گی اس کے ذمے لگے گی۔ یہ غصہ ور ہیں ہی جھلّا گئے ہوں گے۔ اُسے سخت سُست کہا ہو گا۔ بات کی اُسے برداشت کہاں؟ دُرگا! تم میرے لال کی رکشا کرنا۔ میں اُسے تمہارے سپُرد کرتی ہوں۔ افسوس یہ غضب ہو گیا۔ میرا راج سونا ہو گیا۔ اور انہیں اپنے راگ رنگ کی سُوجھی ہوئی ہے۔ یہ سوچتے سوچتے رانی کے بدن میں رعشہ آگیا۔ اُٹھ کر غُصّے سے کانپتی ہُوئی وہ بے محابا عیش محفل کی طرف چلی۔ قریب پہنچی تو سُریلی تانیں سُنائی دیں۔ ایک برچھی سی جگر میں چُبھ گئی۔ آگ پر تیل پڑ گیا۔

رانی کو دیکھتے ہی مطربوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ کوئی کہیں گوشے میں جا چھپی کوئی گرتی پڑتی دروازے کی طرف بھاگی۔ راجہ صاحب نے رانی کی طرف گھُور کر دیکھا غیظ و غضب کا شعلہ سامنے دہک رہا تھا۔ ان کے تیوروں پر بھی بل پڑ گئے۔ جو نیار نگاہیں باہم ملیں، موم نے لوہے کا سامنا کیا۔

رانی تھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میرا اندرسن کہاں گیا؟"
یہ کہتے کہتے اُس کی آواز رُک گئی، اور ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

راجہ نے بے رُخی سے جواب دیا: "مَیں نہیں جانتا۔"

رانی سسکیاں بھر کر بولی: "آپ نہیں جانتے کہ وہ کل سہ پہر سے غائب ہے اور اُس کا کہیں پتہ نہیں۔ آپ کی ان زہریلی ناگنوں نے یہ بس بویا ہے۔ اگر اس کا بال بھی بیکا ہُوا۔ تو اُس کے آپ ذمہ دار ہوں گے۔"

راجہ نے تُرشی سے کہا: "وہ سرکش، خود سر اور مغرور ہو گیا ہے۔ میں اُس کا مُنہ نہیں دیکھنا چاہتا۔"

رانی کچلے ہُوئے سانپ کی طرح اینٹھ کر بولی: "راجہ! تمہاری زبان سے یہ باتیں نکل رہی ہیں۔ ہائے میرا لال، میری آنکھوں کی پتلی، میرے جگر کا ٹکڑا، میرا سب کچھ یوں الوپ ہو جائے اور اس بے رحم کا دل ذرا بھی نہ پسیجے، میرے گھر میں آگ لگ جائے اور یہاں اندر کا اکھاڑا سجایا ہے۔ مَیں، مَیں خون کے آنسو روؤں اور یہاں خوشی کے راگ الاپے جائیں۔" راجہ کے نتھنے پھڑکنے لگے، کڑک کر بولے: "رانی بھان کنور! اب زبان بند کرو۔ مَیں اس سے زیادہ نہیں سن سکتا۔ بہتر ہو گا کہ تم محل میں چلی جاؤ۔"

رانی نے بپھری شیرنی کی طرح گردن اُٹھا کر: "ہاں میں خود جاتی ہوں۔ مَیں حضور کے عیش میں مخل نہیں ہونا چاہتی۔ مگر آپ کو اس کا خمیازہ اُٹھانا پڑے گا۔ اچل گڑھ میں یا تو بھان کنور رہے گی۔ یا آپ کی زہریلی بسیلی پریاں۔"

راجہ پر اس دھمکی کا مطلق اثر نہ ہُوا۔ گینڈے کی ڈھال پر تُکّے ہوئے کا اثر کیا ہو سکتا ہے۔ جی میں تو آیا۔ کہ صاف صاف کہہ دیں۔ بھان کنور چاہے رہے یا نہ رہے یہ پریاں ضرور رہیں گی۔ لیکن ضبط کر کے بولے: "تم کو اختیار ہے۔ جو مناسب سمجھو وہ کرو۔"

رانی چند قدم چل کر پھر لوٹی اور بولی: "تو یا نٹ رہے گی۔ یا راج ہٹ؟"

راجہ نے مستقل لہجے میں جواب دیا: "اس وقت تو راج ہٹ ہی رہے گی۔"

(۴)

رانی بھان کنور کے چلے جانے کے بعد راجہ دیو مل پھر اپنے کمرے میں آ بیٹھے مگر پژمردہ اور دل گرفتہ۔ رانی کی سخت باتوں سے دل کے نازک ترین حصّوں میں خلش ہو رہی تھی۔ پہلے تو وہ اپنے اوپر جھنجلائے۔ کہ میں نے اس کی باتوں کو کیوں اس قدر تحمّل سے سُنا۔ مگر جب ذرا غصّے کی آگ دھیمی ہوئی۔ اور دماغی توازن پھر اصلی حالت پر آیا تو ان واقعات پر اپنے دل میں غور کرنے لگے۔ انصاف پسند طبیعتوں کے لئے غصہ ایک تازیانہ ہے۔ جس سے انہیں اپنے قول و فعل کے حسن و قبح کو جانچنے اور آئندہ کے لئے مزید احتیاط کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس دارو ئے تلخ سے اکثر تجربے کو تقویت، نگاہ کو وسعت اور فکر کو بیداری حاصل ہوتی ہے۔ راجہ سوچنے لگے۔ بے شک ریاست کے اندرونی حالات کے لحاظ سے یہ بزم آرائیاں بے موقع ہیں۔ بے شک وہ رعایا کے ساتھ اپنا فرض نہیں ادا کر رہے تھے۔ وہ اِن مصارف اور اس اخلاقی دھبّے کو مٹانے پر آمادہ تھے۔ مگر اس طرح کہ نکتہ چیں نگاہیں اس میں کچھ اور معنی نہ نکال سکیں۔ شانِ ریاست قائم رہے۔ اتنا اندرمل سے اُنہوں نے صاف کہہ دیا تھا۔ کہ اگر اتنے پر بھی وہ اپنی سخت گیریوں سے باز نہیں آتا تو یہ اس کی خودسری ہے۔ ہر ایک ممکن پہلو سے غور کرنے پر راجہ صاحب کے اس فیصلے میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ کنور کا یوں غائب ہو جانا ضرور تشویشناک ہے اور ریاست کے لئے خطرناک نتائج سے مملو۔ مگر وہ اپنے آپ کو ان نتائج کی ذمہ داریوں سے بالکل بری سمجھتے تھے۔ وہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ اندرمل کے چلے جانے کے بعد ان کا بزم نشاط آراستہ کرنا بے موقع اور شعلہ انگیز تھا۔ مگر اس کا کنور کے آخری فیصلے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ کنور ایسا نادان۔ خام کار اور بزدل تو نہیں ہے کہ خودکشی پر آمادہ ہو جائے ہاں دو چار دن اِدھر اُدھر آوارہ گھومے گا۔ اور اگر ایشور نے کچھ بھی انصاف عطا کیا ہے۔ تو وہ پشیمان اور متاسف ہو کر ضرور چلا آئے گا۔ میں خود اُسے ڈھونڈ نکالوں گا۔

وہ ایسا ناسعادتمند نہیں ہے کہ اپنے بوڑھے باپ کی معذرت پر دھیان نہ دے۔

اندرمل سے فارغ ہو کر راجہ صاحب کا دھیان رانی کی طرف پہنچا اور جب اُس کے کلمات آتشیں یاد آئے۔ تو غصّے سے بدن میں پسینہ آگیا۔ اور وہ ایک عالم بیتابی میں اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ بیشک میں اُس کے ساتھ بے رحمی سے پیش آیا۔ ماں کو اپنی اولاد ایمان سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ اور اس کی خفگی بجا تھی۔ مگر ان دھمکیوں کے کیا معنی۔ اس کے سوا کہ وہ روٹھ کر میکے چلی جائے اور مجھے بدنام کرے۔ وہ میرا اور کیا کر سکتی ہے؟ عقلمندوں نے کہا ہے کہ عورت کی ذات بے وفا ہوتی ہے۔ وہ میٹھے پانی کی چنچل چلبلی چکیلی دھارا ہے۔ جس کے آغوش ناز میں جھکتی اور جھپٹتی ہے۔ اُسے تو وہ رنگ بنا کر چھوڑتی ہے یہی بھان کنور ہے۔ جس کی ناز برداریاں عشق کا درجہ رکھتی ہیں۔ آہ! کیا وہ پچھلی باتیں فراموش کر جاؤں۔ کیا اُنہیں قصہ سمجھ کر دل کو تسکین دوں۔ اسی اثنا میں ایک لونڈی نے آکر کہا کہ مہارانی نے ہاتھی منگوایا ہے اور نہ جانے کہاں جا رہی ہیں۔ کچھ بتاتی نہیں۔ راجہ نے سُنا اور منہ پھیر لیا۔

(۵)

شہر اندور سے تین میل شمال کی طرف گھنے درختوں کے بیچ میں ایک تالاب ہے جس کے رُخ سیمیں سے کائی کا سبز مخملی گھونگھٹ کبھی نہیں اُٹھتا۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں اُس کے چاروں طرف پختہ گھاٹ بنے ہوئے تھے۔ مگر اسوقت تو صرف روایت باقی ہے۔ اور عالم اسباب میں یہ اکثر سنگ وحشت کی یادگاروں سے زیادہ دیرپا ہوا کرتی ہے۔

تالاب کی پوربی جانب ایک پرانا مندر ہے۔ اس میں شیوجی راکھ کی دھونی رمائے خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ ابابیلیں اور جنگلی کبوتر اُنہیں اپنی میٹھی بولیاں سُنایا کرتے۔ مگر اس ویرانے میں بھی اُن کے معتقدوں کی کمی نہ تھی۔ مندر کے اندر بھرا ہوا پانی اور باہر عفونت انگیز کیچڑ اس عقیدتمندی کے شاہد تھے۔ وہ مسافر جو اس تالاب میں نہاتا

اس کے ایک لوٹے پانی سے اپنے معبود کی پیاس بجھاتا تھا۔ شیو جی کھاتے کچھ نہ تھے مگر پانی بہت پیتے تھے۔ ان کی نہ بجھنے والی پیاس کبھی نہ بجھتی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ کوار کی دھوپ تیز تھی۔ کنور اندرمل اپنے بادرفتار گھوڑے پر سوار اندور کی طرف سے آئے اور ایک درخت کے سایہ میں ٹھہر گئے۔ وہ بہت اُداس تھے۔ اُنہوں نے گھوڑے کو درخت سے باندھ دیا اور خود زین پوش بچھا کر لیٹ گئے۔ اُنہیں اچل گڑھ سے نکلے آج تیسرا دن ہے۔ مگر تفکرات نے پلک تک نہیں جھپکنے دی۔ رانی بھان کنور اس کے دل سے ایک لمحہ کیلئے بھی دُور نہ ہوتی تھی۔ اس وقت ٹھنڈی ہوا لگی تو نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھنے لگا۔ گویا رانی آئی ہیں اور اُسے گلے لگا کر رو رہی ہیں۔ چونک کر آنکھیں کھولیں تو سچ مچ رانی سامنے کھڑی اس کی طرف آنسوں آنکھوں سے تاک رہی تھیں۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور ماں کے قدموں کو بوسہ دیا۔ مگر رانی نے فرطِ شفقت سے اُسے اُٹھا کر گلے لگا لینے کی بجائے اپنے پاؤں ہٹا لئے اور مُنہ سے کچھ نہ بولی۔

اندرمل نے کہا۔ "ماں جی! آپ مجھ سے ناراض ہیں؟"

رانی نے رُکھائی سے جواب دیا۔ "میں تمہاری کون ہوتی ہوں۔"

کنور:- آپ کو یقین آئے یا نہ آئے میں جب سے اچل گڑھ سے چلا ہوں۔ ایک لمحہ بھی آپ کا خیال دل سے دُور نہیں ہُوا۔ ابھی آپ ہی کو خواب میں دیکھ رہا تھا۔

ان الفاظ نے رانی کا غصّہ ٹھنڈا کیا۔ کنور کی طرف سے بے فکر ہو کر اب وہ راجہ کا دھیان کر رہی تھی۔

رانی:- کنور سے پُوچھا۔ "تم تین دن کہاں رہے؟"

کنور:- جواب دیا۔ کیا بتاؤں کہاں رہا۔ اندور چلا گیا تھا۔ وہاں پولیٹیکل ایجنٹ سے ساری داستان بیان کی۔

رانی نے یہ کیفیت سُنی۔ تو ماتھا پیٹ کر بولی۔ "تم نے غضب کر دیا۔ آگ

لگادی

اندرمل :- کیا کروں، خود پچھتا تا ہوں۔ اسوقت یہی دُھن سوار تھی۔"

رانی :- مجھے جن باتوں کا ڈر تھا۔ وہ سب ہو گئیں۔ اب کون منہ لے کر اچل گڑھ جائیں گے؟

اندرمل :- میرا جی چاہتا ہے کہ اپنا گلا گھونٹ لوں۔

رانی :- غصہ بُری بلا ہے۔ تمہارے آنے کے بعد میں نے رار مچائی اور کچھ یہی ارادہ کر کے اندور جا رہی تھی۔ راستے میں تم مل گئے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے سے بہلیوں اور سانڈنیوں کی ایک لمبی قطار آتی ہوئی دکھائی دی۔ سانڈنیوں پر مرد سوار تھے۔ سرنگیں آنکھوں والے پیچ دار زلفوں والے۔ بہلیوں میں حسن کے جلوے تھے۔ شوخ نگاہیں بے باک چتونیں یہ ارباب نشاط کا قافلہ تھا جو اچل گڑھ سے ناشاد و نامراد چلا آتا تھا۔

انہوں نے رانی کی سواری دیکھی اور کنور کا گھوڑا پہچان لیا۔ متکبرانہ انداز سے سلام کئے مگر بولے نہیں۔ جب وہ دُور نکل گئے۔ تو کنور نے زور سے قہقہہ مارا یہ فتح کا نعرہ تھا۔

رانی نے استعجاب کیا۔ "یہ کیا کایا پلٹ ہو گئی۔ یہ سب اچل گڑھ سے لوٹے آتے ہیں اور عین دسہرے کے دن؟"

اندرمل پُر غرور انداز سے بولے۔ "یہ پولٹیکل ایجنٹ کے انکاری تار کے کرشمے ہیں۔ میری چال بالکل ٹھیک پڑی۔"

رانی کا شبہ دُور ہو گیا۔ ضرور یہی بات ہے۔ یہ انکاری تار کی کرامات ہے وہ بہت دیر تک ایک محویت کے عالم میں زمین کی طرف تاکتی رہی۔ اور

اس کے دل میں باربار یہ سوال پیدا ہوتا تھا۔

"کیا اسی کا نام راج ہٹ ہے؟"

آخر اندرمل نے پھر سکوت توڑی۔ "کیا آج چلنے کا ارادہ ہے کہ کل؟"

رانی: "کل شام تک ہم کو اچل گڑھ پہنچنا ہے۔ مہاراج گھبراتے ہوں گے۔"

راجہ ہردول

(۱)

بندیل کھنڈ کے کارناموں میں چمپت رائے کی زندۂ جاوید رانی سارندھا جس قدر ممتاز ہے شاید اس سے زیادہ عقیدت لوگوں سے ہردول سے ہے۔ آج بندیل کھنڈ کا کوئی موضع ایسا نہیں، جہاں ہردول کا چبوترہ نہ ہو۔ شادی بیاہ اور دیگر تقریبوں کے موقعہ پر عورتیں بناؤ سنگار [illegible] اس چبوترے پر آتی ہیں اور ہردول کے نام پر عقیدت کے پھولوں کے ساتھ پیش کے چونا چڑھاتی ہیں۔ جب تک سہاگ کے چاول اور سہاگ کی ہلدی میں ہردول کو حصہ نہ مل جائے۔ شادی کی رسم پوری نہیں ہو سکتی۔ دیوتا ہر ایک خاندان اور فرقہ کے جدا ہیں۔ کوئی مہادیو کو بھنگ چڑھاتا ہے۔ کوئی مہابیر جی کی ملیدے سے مدارات کرتا ہے۔ کوئی قربانی کا بکرا چڑھا کر دیوی کی پیاس بجھاتا ہے۔ مگر ہردول ہے کہ ہر کس و ناکس سے اس کی بساط کے موافق عقیدت کا خراج لیتا ہے۔ کسی موضع میں جاؤ اور ایک بچے سے بھی پوچھو۔ تو وہ فوراً ہردول کے چبوترے کا نشان بتا دے گا۔ مگر اس فرد بشر نے وہ کونسا کام کیا جس سے آج اس کا نام پر عقیدت نثار ہوتی ہے اور عظمت موتی لٹاتی ہے۔ اس نے کوئی ملک نہیں فتح کیا۔ کوئی سلطنت نہیں قائم کی۔ کوئی ایجاد نہیں کی۔ کوئی تصنیف نہیں لکھی۔ وہ دیوتا نہ تھا۔ پرتاپی راجہ نہ تھا۔ وہ ایک وہمی مزاج بھائی کے شکوک کا نشانہ تھا۔ ایک عورت کے نام پر سے بے وفائی کا جھوٹا داغ مٹانے کے لئے اس نے زہر کا پیالہ پینا گوارا کیا۔ اپنے خون سے ایک عفیفہ کے دامن

مدگمانی کو دھو دیا۔ اور یہی فعل مردانہ ہے۔ جس نے تین صدیاں گذر جانے پر بھی اس کے نام کے چاروں طرف تقدس اور احترام کا ایک منور ہالہ قائم کر دیا ہے۔ سنگ و خشت کی یادگاریں اور تاریخی فتوحات انسان سے ثنا و صفت کی داد لیتی ہیں۔ مگر مردانہ جانبازی دلوں میں مذہبی ارادت پیدا کر دیتی ہے۔ حق یہ ہے کہ جب تک کوئی فرد بشر ایسا عظیم الشان کام نہ کرے جو انسان کے حیطۂ امکان سے باہر ہو۔ اس وقت تک عوام الناس کا دربار اُسے دیوتاؤں کی پدوی نہیں دیتا۔ فاتح اور شاعر، سخی اور عادل دماغ کے مندر میں جگہ پاتے ہیں۔ مگر حمیت کے نام پر قربان ہونے والا انسان دل کے مندر میں جلوہ افروز ہوتا ہے آج جو ایک دیوتا کی عزت ہے۔ وہی عزت ہردول کی ہے۔ اِس نام پر کبیشروں نے کبیتا کے موتی نثار کئے ہیں۔ اس کی داستان آج بھی غیرتمندوں میں دلاوری اور جانبازی کا جوش پیدا کرتی ہے اور نیک بیویاں آج بھی اس سے عبرت کے سبق لیتی ہیں۔

(۲)

ہردول جو جھار سنگھ کا چھوٹا بھائی تھا۔ یہ اورچھا کے راجہ تھے۔ اورچھا بندیلوں کا گہوارہ ہے۔ انہیں پہاڑوں کی گود میں بندیل قوم نے پرورش پائی ہے۔ اورچھا کا راجہ آج بھی بندیلی مجلس کا صدر نشین ہے۔ جو جھار سنگھ بڑا دلیر اور دانا شخص تھا۔ شاہجہاں اس زمانے میں دہلی کا بادشاہ تھا۔ جب خانجہاں لودی نے علم بغاوت بلند کیا۔ اور علاقہ شاہی کو خاک سیاہ کرتا ہُوا اورچھا کی طرف آنکلا تو راجہ جو جھار سنگھ نے اس سے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ شاہجہان راجہ کی اس جانبازانہ سرفروشی سے بہت خوش ہوا۔ انسانی جوہر کا باکمال جوہری تھا۔ راجہ کو فوراً صوبہ دکن میں ایک اہم خدمت پر مامور کر دیا۔ اس دن اورچھا میں خوب جشن منایا گیا۔ شاہی سفیر خلعت و سند اختیار لے کر راجہ کے پاس آیا۔ جو جھار سنگھ کو بڑے بڑے کام کرنے کا موقع ہاتھ

آیا۔ سفر کی تیاریاں ہونے لگیں۔ راجہ نے ہردول کو بلا کر کہا۔ بھیّا! میں چاہتا ہوں، اب یہ راج پاٹ تمہارے سپرد ہے۔ میری رعایا مجھے بہت پیاری ہے۔ تم بھی ان کو دل سے پیار کرنا۔ انصاف راجہ کا سب سے زبردست مددگار ہے۔ انصاف کی شہر پناہ میں کوئی دشمن شگاف نہیں کر سکتا۔ چاہے وہ راون کی فوج اور اندر کا زور لے کر آئے مگر انصاف وہی سچا ہے جسے رعایا بھی انصاف سمجھے تمہارا کام صرف انصاف کرنا نہ ہوگا۔ بلکہ رعایا کو اپنے انصاف کا یقین بھی دلانا ہوگا اور میں تمہیں کیا سمجھاؤں، تم خود دانشمند ہو۔" یہ کہہ کر اپنی پگڑی اُتاری اور ہردول کے سر پر رکھ دی۔ ہردول روتا ہوا ان کے قدموں پر گر پڑا۔

تب راجہ اپنی رانی کلیننا سے رخصت ہونے کے لئے رنواس میں آئے۔ رانی دروازے پر کھڑی رو رہی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی پاؤں پر گر پڑی۔ جوجھار سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بولے "پیاری! یہ رونے کا وقت نہیں ہے۔ بندیلوں کی عورتیں ایسے موقعوں پر رویا نہیں کرتیں۔ ایشور نے چاہا تو ہم تم علیحدہ نہیں گے۔ مجھ پر ایسی ہی محبت کی نگاہ رکھنا۔ میں نے راج پاٹ ہردول کو سونپا ہے۔ وہ ابھی لڑکا ہے۔ اس نے ابھی زمانے کا نیک و بد نہیں دیکھا۔ اپنی صلاحوں سے اس کی مدد کرتی رہنا۔" ذوقِ گریہ سے رانی کی زبان بند ہو گئی۔ ہائے! یہ کہتے ہیں کہ بندیلوں کی عورتیں ایسے موقعوں پر رویا نہیں کرتیں۔ شاید ان کے سینے میں دل نہیں ہوتے یا اگر ہوتا ہے تو دردِ محبت سے نا آشنا۔ رانی دل پر جبر کر کے آنسو پی گئی۔ اور ہاتھ باندھ کر راجہ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ مگر کیا وہ مسکراہٹ تھی؟ جس طرح اندھیرے گھُپ میدان میں مشعل کی روشنی تاریکی کو اور بھی اتھاہ کر دیتی ہے۔ اسی طرح یہ مسکراہٹ کی روشنی رانی کے دل کے اتھاہ غم کو اور بھی روشن کر رہی تھی۔

(۳)

جُجھار سنگھ کے چلے جانے کے بعد ہردول راج کرنے لگے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُس کے انصاف و رعیت پروری نے رعایا کو اس کا گرویدہ بنالیا۔ لوگ جُجھار سنگھ کو بھول گئے۔ جُجھار سنگھ کے دوست بھی تھے، دشمن بھی تھے۔ مگر ہردول کے اخلاق نے سب کو اپنا دوست بنالیا۔ وہ ایسا ہنس مکھ وجیہہ۔ ایسا شیریں زبان تھا۔ کہ جو اس سے دو دو باتیں کر لیتا۔ وہ زندگی بھر کے لئے اُس کا معتقد ہو جاتا۔ ریاست میں ایسا کوئی فرد بشر نہ تھا۔ جسے اس کے حضور میں رسائی حاصل کرنی مشکل ہو۔ رات اور دن اس کے دربار کا دروازہ کھُلا رہتا تھا۔ اورچھا کو کبھی ایسا ہر دلعزیز راجہ نہ نصیب ہوا تھا۔ وہ فیاض تھا، منصف تھا، علم و ہنر کا قدردان تھا۔ مگر سب سے بڑی صفت جو اس میں تھی۔ وہ اس کی مردانگی تھی۔ اس کی ذات میں یہ جوہر کمال کو پہنچ گیا تھا۔ وہ قوم جس کی زندگی کا دارومدار تلوار پر ہے۔ اپنے بادشاہ کے کسی وصف پر اتنا ناز نہیں کرتی جتنا اس کی دلاوری پر۔ ہردول سچی شجاعت کا پتلا تھا۔ اور بندیلے تلوار کے دھنی ہردول ان کے دلوں پر راج کرنے لگا۔ جو ملک و مال پر راج کرنے سے بہت مشکل تھا۔ اس طرح سال بھر گذر گیا۔ جُجھار سنگھ نے اُدھر دکن میں اپنے حُسنِ انتظام سے چاروں طرف شاہی تسلط جما دیا۔ اِدھر اورچھے میں ہردول نے رعایا پر موہنی منتر پھونک دیا۔

پھاگن کا مہینہ تھا۔ عبیر اور گلال سے زمین سُرخ ہو رہی تھی اور پھاگ کے پُرجوش نغمے نیاز معشوقوں کے دلوں میں تمنا اور اشتیاق کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ ربیع نے کھیتوں میں سنہرا فرش بچھا دیا تھا۔ اور کھلیانوں میں خوشۂ زریں کے محل کھڑے کر دیئے تھے۔ آسودگی اس سنہرے فرش پر اٹھلاتی پھرتی

تھی، اور فراغت اس سنہرے محل میں اپنی تانیں الاپ رہی تھی۔ انہیں دنوں میں دہلی کا نامور پھکیت قادر خاں ایرچھ میں آیا۔ بڑے بڑے آزمودہ کار پہلوان اُس کی تلوار کا لوہا مان گئے تھے۔ دہلی سے ایرچھ تک صدہا نشہ مردانگی کے متوالے اُس کے سامنے آئے۔ مگر کوئی اس سے بازی نہ لے گیا۔ اُس سے لڑنا قسمت سے نہیں بلکہ موت سے لڑنا تھا۔ اور وہ کبھی انعام و اکرام کا بھوکا نہ تھا۔ وہ جیسا دل کا دلیر تھا۔ ویسا ہی طبیعت کا غنی تھا۔ عین ہولی کے دن اس نے صدہا اُڑتے گو کے ساتھ ایرچھ میں اعلان کر دیا کہ "خدا کا شیر۔ دلّی کا قادر خاں ایرچھ آ پہنچا ہے جسے اپنی تقدیر کا دعویٰ ہو۔ آکر اپنی قسمت کا فیصلہ کرلے۔"

ایرچھ کے منچلے مندیل سورما یہ آوازۂ پُر غرور سنتے ہی گرم ہو کر اُٹھے دف اور پھاگ کی صدائے دلنواز کے بدلے ڈھول کی مردانہ گونج سنائی دینے لگی۔ ہر دل کا اکھاڑہ ایرچھ کے قادر انداز وں اور پھکیتوں کا مرکز تھا۔ شام کو یہاں سارے شہر کے سورما جمع ہوئے۔ کالدیو اور بھالدیو مندیلوں کی ناک تھے۔ سینکڑوں میدان مارے ہوئے۔ یہی دونوں پہلوان قادر خاں کا غرور توڑنے کے لئے چُنے گئے۔

دوسرے دن قلعے کے سامنے تالاب کے کنارے وسیع میدان میں ایرچھ کے برنا و پیر جمع ہوئے۔ کیسے کیسے سجیلے البیلے جوان تھے۔ سروں پر خوش رنگ بانکی پگڑیاں۔ ہاتھوں پر صندل کے ٹیکے۔ آنکھوں میں مردانگی کا سرور۔ کمروں میں خنجر آبدار۔ اور کیسے کیسے بوڑھے تھے۔ تنی ہوئی مونچھیں۔ سادہ مگر ترچھی پاگ۔ کانوں سے بندھی ہوئی داڑھیاں شکل کے بوڑھے مگر دل کے جوان۔ عمر کے بارگراں کو ہیچ سمجھنے والے۔ ان کی مردانہ آن بان نوجوانوں کو شرماتی تھی۔ ہر شخص کی زبان پر سپہ گری کے چرچے تھے۔ نوجوان کہتے تھے۔ دیکھنا چاہئے آج ایرچھ کی [illegible] رہتا ہے یا نہیں۔ مگر بوڑھے کہتے تھے کہ ایرچھ کی ہار کبھی نہیں ہوئی اور

نہ ہوگی۔ دلاوروں کا یہ جوش دیکھ کر ہر دول نے بہ آواز بلند کہہ دیا تھا۔ کہ خبردار! بندیلوں کی لاج رہے یا نہ رہے مگر اُن کی آن میں ہرگز فرق نہ آنے پائے۔ اگر کسی نے غیروں کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ ایرچھ والوں کی تلوار سے پیش نہ چلی تو دھاندلی کر بیٹھے۔ وہ اپنے آپ کو قوم کا دشمن سمجھے۔

آفتاب نکل آیا تھا۔ یکایک نقارے پر چوٹ پڑی۔ اور امید و بیم نے لوگوں کے دلوں کو اچھال کر لبوں تک پہنچا دیا۔ کالدیو اور قادر خاں دونوں لنگوٹے کسے دو شیروں کی طرح اکھاڑے میں اُترے۔ اور باہم گلے مل گئے۔ تب دونوں طرف سے تلواریں نکلیں اور باہم بغلگیر ہو گئیں اور پھر بادل کے دو ٹکڑوں سے بجلیاں کوندنے لگیں۔ کامل تین گھنٹے تک یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ دو شعلہ دہن اژدہے سرگرم پیکار ہیں۔ ہزاروں آدمی کھڑے محو تماشا تھے۔ اور میدان میں آدھی رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہاں جب کبھی کالدیو کوئی گرہ دار ہاتھ چلاتا یا کوئی پیچیدار وار بچا جاتا۔ تو لوگوں کی گردنیں خود بخود اُٹھ جاتیں۔ مگر کیا مجال کہ زبان سے ایک لفظ بھی نکلے۔ اکھاڑے کے اندر تلواروں کی کھینچ تان تھی۔ مگر صاحب نظر کے لئے اکھاڑے کے باہر میدان میں زیادہ قابل دید کشمکش تھی۔ بار بار قومی آن کے خیال سے انسانی دل کے جذبات کو روکنا اور خوشی یا رنج کی آوازوں کو زبان سے باہر نہ نکلنے دینا۔ تلواروں کے وار بچانے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ یکایک قادر خاں نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا گویا بادل گرج اُٹھا۔ اور اُس کے گرجتے ہی کالدیو کے سر پر بجلی گر پڑی۔

(۴)

کالدیو کے گرتے ہی بندیلوں کا ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ ہر ایک چہرہ غرور پامال غصّہ اور خفت کی تصویر بن گیا۔ ہزاروں آدمی مجنونانہ جوش کے ساتھ اکھاڑے کی طرف دوڑے۔ مگر ہر دول نے بہ آواز بلند کہا۔ "خبردار! اب کوئی آگے نہ بڑھے!" اس آواز نے پاؤں

سامنے زنجیر کا کام کیا۔ تماشائیوں کو رنگ کر جب وہ اکھاڑے میں گئے اور کالدیو کو دیکھا تو آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ زخمی شیر زمین پر تڑپ رہا تھا۔ اس کے رشتہ حیات کی طرح اس کی تلوار کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ آج کا دن گذرا۔ رات آئی۔ مگر سندیلوں کی آنکھوں میں نیند کہاں۔ لوگوں نے پہلو بدل بدل کر رات کاٹی شاید درد جانگزا سے کراہتا ہوا مریض بھی سپیدۂ صبح کا اتنی بے صبری سے انتظار نہیں کرتا۔ لوگ رہ رہ کر آسمان کی طرف دیکھتے۔ اور اس کی رفتار سست پر جھنجھلاتے۔ اُن کے قومی غرور کو کاری زخم لگا تھا۔ دوسرے دن جب آفتاب نکلا، تو تین لاکھ سندیلوں نے تالاب کے کنارے اُس کا خیر مقدم کیا۔ اور جس وقت بھالدیو دلیرانہ اکھاڑے کی طرف چلا تو دلوں میں دھڑکن سی ہونے لگی۔ کل جب کالدیو اکھاڑے میں اترا تھا۔ تو سندیلوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ مگر آج یہ کیفیت نہ تھی۔ دلوں پر اُمید کی بجائے خوف غالب آگیا تھا۔ جب قادر خاں کوئی مہلک وار کرتا تو لوگوں کے دل اُچھل کر لبوں تک آجاتے تھے۔ سورج سر پر چڑھتا چلا آتا تھا۔ اور لوگوں کے دل بیٹھے جاتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھالدیو اپنے بھائی کی بہ نسبت زیادہ چابکدست تھا۔ اور اُس نے کئی بار قادر خاں کو زچ کر دیا۔ مگر دہلی کا آزمودہ کار پہلوان ہر بار سنبھل جاتا۔ کامل تین گھنٹے تک دونوں دلاوروں میں تیغے چلتے رہے۔ یکایک کھٹاکے کی آواز آئی۔ اور بھالدیو کی تلوار کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ راجہ ہردول اکھاڑے کے سامنے کھڑے تھے۔ بھالدیو کی طرف تیزی سے تلوار پھینکی بھالدیو تلوار اُٹھانے کے لئے جھکا تھا کہ قادر خاں کی تلوار اس کی گردن پر آ پڑی۔ زخم مہلک نہ تھا۔ محض ایک چرکہ تھا۔ مگر اُس نے لڑائی کا فیصلہ کر دیا۔

اب دل شکستہ سندیلے اپنے گھروں کو لوٹے۔ اگرچہ بھالدیو اب بھی مقابلے کیلئے آمادہ تھا۔ اور سندیلے کسی طرح ہار ماننے پر تیار نہ تھے۔ مگر ہردول نے اُنہیں سمجھا کر کہا

بھائیو! ہماری ہار اُسی وقت ہو گئی. جب ہماری تلوار نے جواب دے دیا۔ اگر ہم قادر خاں کی جگہ ہوتے تو نہتے آدمی پر وار نہ کرتے اور اُس وقت تک ہاتھ نہ اُٹھاتے جب تک ہمارے رقیب کے ہاتھ میں تلوار آجاتی۔ مگر قادر خاں فیاضی کا سبق نہیں پڑھا۔ اکثر زبردست دشمن کے مقابلے میں فیاضی کو بالائے طاق رکھنا پڑتا ہے۔ تاہم ہم نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ فنِ تیغ میں ہم اُس کے مدِّ مقابل ہیں اور اب ہم کو یہ ثابت کرنا باقی ہے کہ ہماری تلوار میں بھی ویسا ہی جوہر ہے۔

اس طرح لوگوں کو تشفی دے کر راجہ ہردول رنواس کو گئے۔ رانی کلینتا نے پوچھا "بھیا! آج دنگل کا کیا رہا؟"

ہردول نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "آج بھی وہی کل کی کیفیت ہوئی۔"

کلینتا۔ "کیا بھالدیو مارا گیا؟"

ہردول "نہیں جان سے تو نہیں گیا مگر ہار ہو گئی۔"

کلینتا۔ تو اب کیا کرنا ہوگا؟

ہردول۔ میں خود اسی سوچ میں ہوں۔ آج تک اورچھہ کو کبھی نیچا نہیں دیکھنا پڑا۔ ہمارے دولت نہ تھی۔ بڑا راج نہ تھا۔ مگر اپنی سپہ گری کے سامنے ہم راج اور دولت کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ ہم اب کس مُنہ سے اپنی سپہ گری پر ناز کریں گے۔ اورچھہ کی اور بندیل قوم کی لاج اب جاتی ہے۔

کلینتا۔ کیا اب کوئی آس نہیں ہے؟

ہردول۔ ہمارے پہلوانوں میں ایسا کوئی نہیں ہے۔ جو اُس سے بیش لے جائے۔ بھالدیو کی ہار نے بندیلوں کے حوصلے پست کر دیئے ہیں۔ آج سارے شہر میں ماتم ہو رہا ہے سینکڑوں گھروں میں آگ نہیں جلی۔ چراغ نہیں روشن ہوا۔ ہمارے ملک اور قوم کی وہ چیز اب دم توڑ رہی ہے۔ جس سے ہماری عزت تھی۔ بھالدیو میرا اُستاد تھا۔ اُس کے ہار چکنے

کے بعد میرا میدان میں آنا ایک بے ادبی کی بات ہے۔ مگر بندیلوں کی ساکھ جاتی ہے تو میرا
سر بھی اُس کے ساتھ جائے گا۔ قادر خاں بے شک اپنے ہنر میں یکتا ہے۔ مگر ہمارا بھالدیو
ہرگز اُس سے کم نہیں۔ قادر خاں کی جیت صرف اس وجہ سے ہوئی۔ کہ اُس کی تلوار پختہ اور آبدار
تھی قادر خاں کی تلوار اگر بھالدیو کے ہاتھ میں ہوتی تو ضرور میدان اُس کے ہاتھ رہتا۔ اورچھہ
میں صرف ایک تلوار ہے۔ جو قادر خاں کی تلوار کا منہ موڑ سکتی ہے۔ وہ بھیّا کی دامن تلوار ہے
اگر تم اورچھہ کی ناک رکھنا چاہتی ہو تو وہ تلوار مجھے دے دو۔ یہ ہماری آخری کوشش ہو
گی اگر اب کے بھی ہم ناکام رہے تو اورچھہ کا نام ہمیشہ کے لئے ڈوب جائے گا۔

کلینتا سوچنے لگی۔ کہ تلوار ان کو دوں یا نہ دوں۔ راجہ منع کر گئے ہیں۔ اُن کا حکم تھا۔
کہ کسی غیر کا اُس پر سایہ بھی نہ پڑنے پائے۔ کیا ایسی حالت میں مَیں اُن کے حکم کے خلاف کروں
تو وہ ناراض ہوں گے۔ ہرگز نہیں۔ جب وہ سُنیں گے کہ مَیں نے کیسے نازک موقعہ پر تلوار نکالی
ہے تو انہیں سچّی خوشی حاصل ہوگی۔ بندیلوں کی آن کس کو اتنی پیاری ہے۔ اُن سے زیادہ
اورچھہ کا اور کون شیدائی ہوگا؟ اس وقت ان کے حکم کو توڑنا ہی حکم کی تعمیل ہے۔ یہ سوچ
کر کلینتا نے تلوار ہردول کو دے دی۔

(۵)

صبح ہوتے ہی یہ خبر پھیل گئی کہ راجہ ہردول قادر خاں سے مقابلہ کرنے کے لئے جا
رہے ہیں۔ اتنا سُنتے ہی گویا ہر شخص کو نوید جنگ مل گئی۔ چونک کر لوگ اُٹھ بیٹھے اور
دیوانوں کی طرح اکھاڑے کی طرف دوڑے۔ ہر شخص کہتا تھا۔ کہ جب تک ہم جیتے ہیں ہمارا راجہ
کو مقابلے میں نہ آنے دیں گے مگر جب لوگ اکھاڑے کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ اکھاڑے
میں بجلیاں کوند رہی ہیں۔ بندیلوں کے دل پر اس وقت جو کچھ گزری اس کا قیاس کرنا مشکل
ہے۔

اس وقت اس وسیع میدان میں جہاں تک نگاہ جاتی تھی۔ آدمی ہی آدمی نظر آتے

تھے۔ مگر چاروں طرف سکوت کا عالم طاری تھا۔ ہر آنکھ اکھاڑے کی طرف لگی ہوئی تھی اور ہر دل ہردول کے لئے دعا خیر کر رہا تھا۔ قادر خاں کا ایک ایک وار ہزاروں دلوں کے ٹکڑے کر دیتا تھا۔ اور ہردول کے ایک ایک کاٹ سے دلوں میں مسرّت کی لہریں اُٹھنے لگتی تھیں۔ اکھاڑے میں دو پہلوانوں کا مقابلہ تھا۔ اور اکھاڑے کے باہر امید و بیم کا۔ آخر گھڑیال نے پہلا پہر بجایا۔ اور دامن برق بن کر قادر خاں کے سر پر گر پڑی۔ یہ دیکھتے ہی بندیلے جوشِ کامرانی سے باؤلے ہو گئے۔ کسی کو کسی کی سُدھ نہ رہی۔ کوئی کسی کے گلے ملتا تھا۔ کوئی اُچھلتا تھا۔ کوئی چھلانگیں مارتا تھا۔ ہزاروں آدمیوں پر مردانگی کا نشہ چھا گیا۔ تو خود بخود تلواریں نکل پڑیں اور نیزے چمکنے لگے۔ فتح کی خوشی میں صدہا جانیں قربان ہو گئیں۔ مگر جب ہردول اکھاڑے سے باہر آئے۔ اور بندیلوں کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ تو آن کی آن میں لوگ سنبھل گئے۔ تلواریں میانوں میں جا چھپیں۔ خیال آ گیا یہ خوشی کیوں؟ یہ مسرّت کا سیلاب کیوں؟ یہ دیوانگی کس لئے؟ بندیلوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ اس خیال نے لوگوں کا دل ٹھنڈا کر دیا۔ ہردول کی اس جانبازی نے ہر بندیل کے دل میں اُسے عقیدت اور محبّت کی اس اونچی جگہ پر جا بٹھایا۔ جہاں انصاف اور فیاضی کی متفقہ کوششیں بھی اُسے نہ پہنچا سکتی تھیں۔ وہ پہلے ہی سے ہر دلعزیز تھا۔ اور اب وہ اپنی قوم کا ہیرو اور بندیل دلاوری کا مایۂ ناز بن گیا۔

(۶)

راجہ جوجھار سنگھ نے دکن میں داد سپہ گری دی۔ اور وہ محض میدانِ کارزار ہی کے مرد نہ تھے۔ بلکہ انصرامِ سلطنت میں یکتا تھے۔ صوبہ دکن کو اپنے حسنِ انتظام سے خطّۂ گلزار بنا دیا۔ اور پورے سال بھر کے بعد وہ بادشاہ سے اجازت لے کر اورچھہ کی طرف چلے۔ اورچھہ کی یاد اُنہیں ہمیشہ بے چین کرتی رہتی تھی۔ آہ! اورچھہ۔ وہ مبارک دن کب آئے گا۔ کہ پھر تیرے درشن ہوں گے۔ راجہ منزلیں مارتے چلے آتے تھے نہ

بھوک تھی نہ پیاس۔ اورچھہ اور اورچھہ والوں کی محبت کھینچے لئے آتی تھی، یہاں تک کہ اورچھہ کے جنگلوں میں آ پہنچے۔ ساتھ کے آدمی پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ گھوڑے سے اُترے اور ایک درخت کے سائے میں جا بیٹھے۔ حسنِ اتفاق سے آج ہردول بھی فتح کی خوشی میں شکار کھیلنے نکلا تھا۔ سیکڑوں بندیل سردار اُس کے ساتھ تھے۔ نشۂ غرور سے جھومتے چلے آتے تھے۔ اُنہوں نے راجہ جوجھار سنگھ کو تنہا بیٹھے دیکھا۔ مگر اپنے زعم میں اس قدر مست تھے، کہ نزدیک تک نہ آئے۔ سمجھے کوئی مسافر ہوگا۔ ہردول کی آنکھوں نے بھی دھوکا کھایا۔ وہ گھوڑے پر سوار اکڑتا ہوا جوجھار سنگھ کے سامنے آیا، اور پوچھنا چاہتا تھا کہ تم کون ہو، کہ بھائی سے آنکھ مل گئی۔ پہچانتے ہی گھوڑے سے کود پڑا۔ اور اُن کے قدم چُھوئے۔ راجہ نے بھی اُٹھ کر ہردول کو سینے سے لگا لیا۔ مگر اُس سینے میں اب بھائی کی محبت نہ تھی۔ محبت کی جگہ حسد نے لے لی تھی۔ اور صرف اس لئے کہ ہردول دور ہی سے پیادہ پا اس کی طرف نہ دوڑا۔ اُس کے سواروں نے دور ہی سے سرِ تعظیم خم نہ کیا۔

شام ہوتے ہوتے دونوں بھائی اورچھہ پہنچے۔ راجہ کے واپس آنے کا حال جوں ہی معلوم ہوا۔ مسرت کے شادیانے بجنے لگے۔ جا بجا نشاط کی محفلیں آراستہ ہوگئیں اور دم کے دم میں سارا شہر جگمگا اُٹھا۔ آج رانی کلینتا نے اپنے ہاتھوں سے جیونار بنایا۔ نو بجے ہوں گے۔ لونڈی نے آ کر کہا۔ "مہاراج! جیونار تیار ہے"۔

دونوں بھائی کھانا کھانے گئے۔ سونے کے تھال میں راجہ کے لئے کھانا پروسا گیا۔ چاندی کے تھال میں ہردول کے لئے کلینتا نے خود جیونار بنایا تھا۔ خود تھال پروسے تھے اور خود ہی سامنے لائی۔ مگر فرطِ نشاط کہو، خواہ نوشتۂ تقدیر کہ اُس نے غلطی سے سونے کا تھال ہردول کے سامنے رکھ دیا۔ اور چاندی

کیا راجہ کے سامنے۔ ہر دل نے اس کا خیال نہ کیا۔ وہ سال بھر سے سونے کے تھال میں کھاتے کھاتے اُس کا عادی ہو گیا تھا۔ مگر جوجھار سنگھ تلملا گئے۔ زبان سے کچھ نہ بولے۔ لیکن تیور بدل گئے۔ اور چہرہ سُرخ ہو گیا۔ رانی کی طرف گھور کر دیکھا اور کھانا کھانے لگے۔ مگر اس وقت ایک ایک لقمہ زہر معلوم ہوتا تھا۔ دو چار لقمے کھا کر اُٹھ آئے۔ رانی اُن کے تیور دیکھ کر دم بخود ہو گئی تھی۔ آج کیسے پریم سے اس نے جیونار بنایا تھا۔ کتنے انتظار کے بعد یہ مبارک دن آیا تھا۔ اُس کی خوشی کی آج کوئی حد نہ تھی۔ راجہ کے تیور دیکھ کر جان سوکھ گئی۔ جب راجہ اُٹھ گئے۔ اور اس نے تھال کو دیکھا۔ تو کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ اور پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُس نے سر پیٹ لیا۔ ایشور! آج رات خیریت سے کٹے۔ مجھے آثار اچھے نظر نہیں آتے۔

(۷)

راجہ جوجھار سنگھ سیج محل میں لیٹے۔ جادوکار نائن نے رانی کا سنگار کیا۔ اور مسکرا کر بولی، "کل مہاراج سے اس کا انعام لوں گی۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ مگر کلینتا وہاں سے نہ اُٹھی۔ وہ گہری سوچ میں پڑی ہوئی تھی۔ اُن کے سامنے کون سا مُنہ لے کر جاؤں! نائن نے ناحق میرا سنگار کر دیا۔ میرا سنگار دیکھ کر وہ خوش بھی ہوں گے؟ مجھ سے اس وقت خطا ہوئی ہے۔ میں خطاوار ہوں۔ مجھے اُن کے پاس اس وقت بناؤ سنگار کر کے جانا زیب نہیں۔ نہیں نہیں۔ آج مجھے اُن کے پاس اس وقت بھکارنی کے بھیس میں جانا چاہیئے۔ میں اُن سے چھما کا دان مانگوں گی۔ میرے لئے اس وقت یہی مناسب ہے۔ یہ سوچ کر رانی قدِ آدم شیشے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ اپسرا معلوم ہوتی تھی۔ حُسن کی کتنی تصویریں اس نے دیکھی تھیں۔ مگر اُسے اس وقت آئینے کی تصویر سب سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ حُسن اور خود پسندی کا ساتھ ہے۔ ہلدی رنگ دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ذرا دیر کے لئے کلینتا نشۂ حسن سے پھول اُٹھی۔ وہ تن کر کھڑی

ہو گئی۔ لوگ کہتے ہیں۔ حسن میں جادو ہے اور وہ جادو جس کا کوئی اُتار نہیں۔ دین اور ایمان، جان اور جہان سب حسن پر فدا ہیں۔ میں حسین نہ سہی۔ ایسی بُری بھی نہیں ہوں۔ کیا میرے حسن میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ مہاراج سے میری خطا معاف کرا دے۔ یہ باہیں جس وقت اُن کے گلے کا ہار ہوں گی۔ یہ آنکھیں جس وقت پریم کے نشے سے سرخ ہو کر اُن کی طرف دیکھیں گی۔ کیا میرے حسن کی رُوح افزا طراوت اُن کے غصے کی آنچ کو ٹھنڈا نہ کر دے گی۔

مگر ذرا دیر میں رانی کو ہوش آ گیا۔ آہ! یہ میں کیا خواب دیکھ رہی ہوں۔ مگر دل میں ایسی باتیں کیوں آتی ہیں۔ میں اچھی ہوں یا بُری ہوں، اُن کی چیری ہوں۔ مجھ سے خطا ہوئی ہے اُن سے چھما مانگنی چاہیئے۔ یہ سنگار اور بناؤ اس وقت بے موقع ہے یہ سوچ کر رانی نے سب گہنے اُتار دیئے۔ شبنمی ریشم کی معطر ساڑی الگ کر دی موتیوں بھری مانگ کھول دی۔ اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ہائے یہ ملاپ کی رات ہے، بچھڑوں کی رات سے بھی زیادہ درد انگیز۔

بھکارنی کا بھیس بنا کر رانی سیج محل کی طرف چلی۔ قدم آگے بڑھتے تھے۔ مگر دل پیچھے رہا جاتا تھا۔ دروازے تک آئی۔ مگر اندر قدم نہ رکھ سکی۔ دل دھڑکنے لگا۔ ایسا معلوم ہوا۔ گویا اُس کے پاؤں تھرا رہے ہیں۔ راجہ جوجھار سنگھ بولے "کون ہے کلینتا؟ اندر کیوں نہیں آتیں؟"

کلینتا نے دل مضبوط کر کے کہا۔ "مہاراج کیسے آؤں۔ میں اپنی جگہ کو خالی نہیں پاتی ہوں۔"

راجہ۔ یہ کیوں نہیں کہتی کہ دل گنہگار ہے۔ اس لئے آنکھیں نہیں ملانے دیتا۔

کلینتا۔ بے شک مجھ سے خطا ہوئی ہے مگر ایک ابلا آپ سے چھما کا دان مانگتی

ہے۔

راجہ۔ اُس کا پرائسچت کرنا ہوگا۔

کلینتا۔ کیسے؟

راجہ۔ ہردول کے خون سے۔

کلینتا سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ بولی۔ "کیا اسی لئے کہ آج میری بھول سے جیونار کے تھالوں میں اُلٹ پھیر ہوگیا۔

راجہ۔ نہیں اس لئے کہ ہردول نے تمہاری محبت میں اُلٹ پھیر کردیا۔

جیسے آگ سے لوہا سُرخ ہوجاتا ہے اُسی طرح رانی کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ ایک منٹ تک اُسے ایسا معلوم ہُوا۔ گویا دل اور دماغ دونوں کھول رہے ہیں مگر اس نے ضبط کی انتہائی کوشش سے آپ کو سنبھالا۔ صرف اتنی بولی "ہردول کو میں اپنا لڑکا اور بھائی سمجھتی ہوں۔"

راجہ اُٹھ بیٹھے اور تیز لہجے میں بولے۔ "نہیں ہردول لڑکا نہیں ہے۔ لڑکا میں ہوں جس نے تمہارے اُوپر اعتبار کیا۔ کلینتا مجھے تم سے ایسی اُمید نہ تھی! مجھے تمہارے اُوپر گھمنڈ تھا۔ میں سمجھتا تھا۔ ہمالیہ ٹل سکتا ہے مگر تمہارا دل نہیں ٹل سکتا۔ لیکن آج مجھے معلوم ہُوا کہ یہ میری نادانی تھی۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ عورت کی محبت پانی کی دھارا ہے۔ جس طرف ڈھال پاتی ہے۔ اُدھر بہہ جاتی ہے۔

سونا گرم ہوکر پگھل جاتا ہے۔ کلینتا رونے لگی۔ جب آواز قابو میں ہوئی۔ تو بولی۔ میں آپ کے اس شبہ کو کیسے دُور کروں؟"

راجہ۔ ہردول کے خون سے۔

رانی۔ میرے خون سے یہ داغ نہ مٹے گا؟

راجہ۔ تمہارے خون سے اور پختہ ہوجائے گا۔

رانی۔ اور کوئی تدبیر نہیں ہے؟

راجہ۔ نہ

رانی۔ یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟

راجہ۔ ہاں یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ دیکھو اس خاصدان میں پان کا بیڑا رکھا ہوا ہے تمہاری عصمت کا ثبوت یہی ہے کہ تم ہردول کو اسے اپنے ہاتھ سے کھلا دو میرے دل سے شبہ اُسی وقت نکلے گا۔ جب اس گھر سے ہردول کی لاش نکلے گی۔

رانی نے نفرت آمیز نگاہوں سے پان کے بیڑے کو دیکھا اور اُلٹے قدم لوٹ آئی۔

(۸)

رانی سوچنے لگی۔ اب میں کیا کروں۔ کیا ہردول کی جان لوں۔ بے خطا، نیک شریف ہردول کے خون سے اپنی عصمت کا ثبوت دوں۔ اُس ہردول کے خون سے اپنے ہاتھ رنگوں، جو مجھے بہن سمجھتا ہے۔ یہ پاپ کس کے سر پڑے گا؟ کیا ایک بے گناہ کا خون رنگ نہ لائے گا۔ آہ! بدنصیب کلینتا! تجھے آج اپنی عصمت کا ثبوت دینے کی ضرورت پڑی ہے اور وہ بھی ایسا مشکل، نہیں یہ پاپ مجھ سے نہ ہوگا۔ وہ اگر مجھے بے وفا سمجھتے ہیں تو سمجھیں، انہیں اگر مجھ پر شبہ ہے تو ہو۔ مجھ سے یہ پاپ نہ ہوگا۔

آخر راجہ کو یہ شبہ کیوں ہوا۔ کیا محض تھالوں کے بدل جانے سے؟ نہیں ضرور اور کوئی بات ہے۔ آج انہیں ہردول شکارگاہ میں مل گیا ہوگا۔ راجہ نے اس کی کمر میں دا، تلوار دیکھی ہوگی۔ کیا عجیب ہے۔ ہردول سے کوئی بے ادبی ہو گئی ہو۔ مگر میری خطا کیا ہے۔ مجھ پر کیوں اتنا بڑا الزام لگایا جاتا ہے۔ محض تھالوں کے بدل جانے سے! اے ایشور! میں کس سے اپنا دُکھ کہوں۔ تو ہی میرا گواہ ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو، مجھ سے یہ پاپ نہ ہوگا۔

رانی نے پھر سوچا۔ راجہ! کیا تمہارا دل ایسا چھوٹا، ایسا تنگ ہے۔ تم مجھ سے ہردول کی جان لینے کو کہتے ہو۔ اگر تم سے اس کا اختیار اور دباؤ نہیں دیکھا جاتا۔ تو کیوں صاف صاف ایسا نہیں کہتے ہو۔ اگر تم سے اس کا اختیار اور دباؤ نہیں دیکھا جاتا تو کیوں صاف نہیں کہتے۔ کیوں مردوں کی لڑائی نہیں لڑتے کیوں خود اسے نہیں قتل کرتے مجھ سے کیوں وہ کام کرنے کو کہتے ہو، جو تم خوب جانتے ہو، میں نہیں کر سکتی۔ اگر تمہارا جی مجھ سے اکتا گیا ہے اگر میں وبال جان ہو گئی ہوں تو مجھے کاشی یا متھرا بھیج دو۔ میں شوق سے چلی جاؤں گی۔ مگر ایشور کے لئے مجھ پر اتنا بڑا الزام نہ رکھو۔ تم میرے مالک ہو، شوق سے بے وفا سمجھو۔ لیکن میں زندہ ہی کیوں رہوں؟ میرے لئے اب زندگی میں کوئی سکھ نہیں ہے۔ میرا مرنا ہی اچھا ہے۔ میں تو جان دے دوں گی۔ مگر یہ پاپ مجھ سے نہ ہوگا۔

خیالات نے پھر پلٹا کھایا۔ کلبنتا! تم کو یہ پاپ کرنا ہوگا۔ اس سے بڑا پاپ شاید آج تک دنیا میں نہ ہوا ہو۔ مگر یہ پاپ تم کو کرنا پڑے گا۔ تمہارے پتی برت پر شبہ کیا جا رہا ہے اور تمہیں اس شبہ کو دور کرنا ہوگا۔ اگر تمہاری جان خطرے میں ہوتی تو مضائقہ نہ تھا۔ تو اپنی جان دے کر ہردول کو بچا لیتی۔ مگر اس وقت تمہارے پتی برت پر آنچ آ رہی ہے اس لئے تمہیں یہ پاپ کرنا ہوگا۔ اور پاپ کرنے کے بعد ہنسنا اور خوش رہنا ہوگا اگر تمہاری طبیعت ذرا بھی گھبرائی۔ اگر تمہارا چہرہ ذرا بھی مدھم ہوا تو اتنا بڑا پاپ کرنے پر بھی تم شبہ کے دور کرنے میں کامیاب نہ ہوگی۔ تمہارے دل پر چاہے جو گزرے۔ تمہیں یہ پاپ کرنا ہوگا۔

مگر کیسے ہوگا۔ کیا میں ہردول کو قتل کر دوں گی؟ یہ سوچ کر رانی کے بدن میں لرزہ آ گیا۔ نہ! میرا ہاتھ اس پر نہیں اٹھ سکتا۔ پیارے ہردول! میں تمہیں زہر نہیں کھلا سکتی۔ میں جانتی ہوں۔ تم میرے لئے شوق سے زہر کا بیڑا اٹھا لوگے۔ ہاں میں جانتی

یوں تم انکار نہ کروگے۔ مگر مجھ سے یہ پاپ نہیں ہو سکتا۔ ایک بار نہیں، ہزار بار نہیں ہو سکتا!

(۹)

ہردول کو ان باتوں کی مطلق خبر نہ تھی۔ آدھی رات کے وقت پنجا لونڈی روتی ہوئی اُس کے پاس آئی۔ اور اُس سے سب حال حرف بحرف کہہ سنایا۔ وہ خاصہ لے کر رانی کے پیچھے پیچھے سیج محل کے دروازے تک گئی تھی۔ اور ساری باتیں سن کر آئی تھی۔ ہردول راجہ کے تیور دیکھ کر پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ کہ کوئی نہ کوئی کانٹا ان کے دل میں کھٹک رہا ہے۔ پنجا کی باتوں نے اس کے شک کی تصدیق کر دی اُس نے لونڈی سے سخت تاکید کر دی کہ خبردار کسی دوسرے آدمی کے کان میں ان باتوں کی بھنک نہ پڑے۔ اور خود مرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

ہردول بندیل کھنڈ کا آفتاب اور بندیلوں کا مایۂ افتخار تھا۔ اس کے ابرو کے ذرا سے اشارے پر تین لاکھ بندیل سورما مرنے مارنے کے لئے جمع ہو سکتے تھے۔ اورچھہ اس پر نثار تھا۔ اگرچہ جھجار سنگھ کھلے میدان میں اس کا مقابلہ کرتا۔ تو یقیناً مُنہ کی کھاتا۔ کیونکہ ہردول بھی بندیل تھا اور بندیل اپنے دشمن کے ساتھ کسی طرح کی رو رعایت روا نہیں رکھتے۔ مرنا مارنا اُن کی زندگی کا دلچسپ شغلہ ہے۔ مگر اس وقت ایک عورت کو اس کے خون کی ضرورت ہے۔ اور مردانہ حمیت اس کی متقاضی تھی کہ خون اُسے دیا جائے اگر بھیا کو یہ شبہ ہوتا کہ میں اُن کے خون کا پیاسا ہوں اور اُنہیں مار کر راج پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ راج کے لئے قتل اور خون، دغا اور فریب جائز سمجھا گیا ہے۔ مگر ان کے اس شبہ کا جواب میری موت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا اس وقت میرا فرض ہے۔ کہ اپنی جان دے کر ان کے شبہ کو دور کر دوں۔ اُن کے دل میں ایسا مہلک، ایسا قاتل شبہ کر کے اگر میں زندہ رہوں اور پاکیزگی سے بھی زیادہ

پاک کلپنا کو حقارت اور ذلت کا نشانہ نہ بناؤں تو یہ میری بے حیائی ہے۔ نہیں اس کار خیر میں زیادہ کشش و پیچ کی ضرورت نہیں۔ میں خوشی سے زہر کا بیڑا کھاؤں گا۔ اس سے زیادہ مردانہ موت اور کیا ہو سکتی ہے۔ غصّہ اور رقابت کے جوش میں۔ دلاوری اور ناموری کے زعم میں مقابلے کی حوصلہ خیز صداؤں اور نقیبا کے آتشیں نعروں سے مشتعل ہو کر موت کا سامنا کرنا ایسا مشکل کام نہیں۔ حمیّت کی تلوار کو سینے پر روکنا ہی سچی دلاوری ہے۔

دوسرے روز ہردول نے علی الصباح اشنان کیا۔ بدن پر ہتھیار سجے اور مسکراتے ہوئے راجہ کے پاس گئے۔ راجہ ابھی سو کر بیدار ہوئے تھے اور کروٹیں بدل کر اٹھے تھے۔ ان کی خمار آلودہ آنکھیں ہردول کی تصویر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سامنے سنگ مرمر کی چوکی پر زہریلا پان طشت زرنگار میں رکھا ہوا تھا۔ راجہ کبھی تصویر کی طرف دیکھتے، کبھی پان کی طرف۔ شاید خیال نے اس پس کی گانٹھ اور اس تصویر میں ایک رشتہ پیدا کر دیا تھا۔ اس وقت جو ہردول یکایک کمرے میں داخل ہوا۔ تو راجہ چونک پڑا۔ اور سنبھل کر پوچھا۔ "اسوقت کہاں چلے؟"

ہردول کا چہرہ بشاش تھا۔ کیونکہ انسان بھر دیا ہے۔ ہنس کر بولا۔ "کل آپ تشریف لائے ہیں۔ اس کی مبارکباد میں آج شکار کھیلنے جاتے ہیں۔ آپ کو ایشور نے اجیت بنایا ہے۔ ہمیں اپنے ہاتھوں سے وجے کا بیڑہ دیجئے۔"

یہ کہکر ہردول نے چوکی پر سے خاصدان اٹھا لیا۔ اور اسے راجہ کے سامنے رکھ کر بیڑہ لینے کے لئے ہاتھ پھیلایا۔ ہردول کا شگفتہ چہرہ دیکھ کر راجہ کے حسد کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ ظالم! میرے زخم پر نمک چھڑکنے آیا ہے۔ میری عزت اور اطمینان کو تباہ کر کے بھی تجھے آسودگی نہیں ہوئی۔ مجھ سے وجے کا بیڑا مانگتا ہے۔ ہاں یہ وجے کا بیڑا ہے۔ مگر تیرے وجے کا نہیں، میرے وجے کا۔

یہ سوچ کر جوجھار سنگھ نے بیڑے کو ہاتھ میں اٹھایا۔ ایک لمحے تک کچھ سوچتا رہا

پھر مسکرا کر ہردول کو بیڑا دے دیا۔ ہردول نے سر جھکا کر بیڑا لیا۔ اُسے ماتھے پر چڑھایا ایک بار حسرت ناک نگاہوں سے در و دیوار کو دیکھا اور بیڑے کو منہ میں رکھ لیا ایک سچّے راجپوت نے مردانہ حمیّت کا حق ادا کر دیا۔ مردانہ جانبازی نے اس سے بہتر داد کبھی نہیں پائی۔ زہر قاتل تھا۔ حلق کے نیچے اُترتے ہی ہردول کے چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ اور آنکھوں کی چمک جاتی رہی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی، دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ اور زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے نمودار ہو گئے۔ اور سانس تیزی سے چلنے لگی۔ مگر چہرے پر سکون اور اطمینان کی تصویر کھنچی ہوئی تھی۔

جُجھار سنگھ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلا۔ اُس کے چہرے پر ایک بے رحمانہ مسکراہٹ نمودار تھی۔ مگر آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ روشنی اور تاریکی کا ملاپ ہو گیا تھا۔

نمک کا داروغہ

(۱)

جب نمک کا محکمہ قائم ہوا۔ اور ایک خداداد نعمت سے فائدہ اُٹھانے کی عام ممانعت کر دی گئی، تو لوگ دروازۂ صدر بند پا کر روزن و شگاف کی فکریں کرنے لگے۔ چاروں طرف خیانت اور غبن اور تحریص کا بازار گرم تھا۔ پٹوار گری کا معزز اور پُرمنفعت عہدہ چھوڑ چھوڑ کر لوگ صیغۂ نمک کی برقندازی کرتے تھے۔ اور اس محکمے کا داروغہ تو وکیلوں کے لئے بھی رشک کا باعث تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب انگریزی تعلیم اور عیسائیت مترادف الفاظ تھے۔ فارسی کی تعلیم سندِ افتخار تھی۔ لوگ حُسن اور عشق کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اعلیٰ ترین مدارجِ زندگی کے قابل ہو جاتے تھے۔ منشی بنسی دھر نے بھی زلیخا کی داستان ختم کی اور مجنوں و فرہاد کے قصّۂ غم کو دریافتِ امریکہ یا جنگِ نیل سے عظیم تر واقعہ خیال کرتے ہوئے روزگار کی تلاش میں نکلے۔ ان کے باپ ایک جہاں دیدہ بزرگ تھے سمجھانے لگے۔ بیٹا! گھر کی حالت زار دیکھ رہے ہو۔ قرضے سے گردنیں دبی ہوئی ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ وہ گنگا جمنا کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ میں کگارے کا درخت ہوں۔ نہ معلوم کب گر پڑوں۔ تمہیں گھر کے مالک و مختار ہو۔ مشاہرے اور عہدے کا مطلق خیال نہ کرنا۔ یہ تو پیر کا مزار ہے۔ نگاہ چڑھاوے اور چادر پر رکھنی چاہئے۔ ایسا کام ڈھونڈنا جہاں کچھ بالائی رقم کی آمد ہو۔ ماہوار مشاہرہ پورنماشی کا چاند ہے جو ایک دن دکھائی دیتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے غائب ہو جاتا ہے۔ بالائی رقم پانی کا بہتا ہوا سوتا ہے۔ جس سے پیاس بجھتی رہتی ہے۔ مشاہرہ انسان دیتا ہے۔ اسی لئے

اس میں برکت نہیں ہوتی۔ بالائی رقم غیب سے ملتی ہے۔ اسی لئے اس میں برکت ہوتی ہے۔ اور تم عالم و فاضل ہو۔ تمہیں کیا سمجھاؤں۔ یہ معاملہ بہت کچھ ضمیر اور قیافے کی پہچان پر منحصر ہے انسان کو دیکھو اس کی ضرورت کو دیکھو۔ موقع دیکھو اور خوب غور سے کام لو۔ غرض مند کے ساتھ ہمیشہ بے رحمی اور بے رُخی کر سکتے ہو۔ لیکن بے غرض سے معاملہ کرنا مشکل کام ہے۔ ان باتوں کو گرہ میں باندھ لو۔ میری ساری زندگی کی کمائی ہیں :

بزرگانہ نصیحتوں کے بعد کچھ دُعائیہ کلمات کی باری آئی۔ بنسی دھر نے سعادتمند لڑکے کی طرح یہ باتیں بہت توجہ سے سُنیں اور تب گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ اس وسیع دُنیا میں جہاں اپنا استقلال۔ اپنا رفیق۔ اپنی ہمت اپنا مددگار اور اپنی کوشش اپنا مربی ہے لیکن اچھے شگون سے چلے تھے۔ خوبی قسمت ساتھ تھی۔ صیغۂ نمک کے داروغہ مقرر ہو گئے۔ مشاہرہ معقول بالائی رقم کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ بوڑھے منشی جی نے خط پایا۔ تو باغ باغ ہو گئے۔ کلوار کی تسکین و تشفی کی سند ملی۔ پڑوسیوں کو حسد ہوا۔ اور مہاجنوں کی سخت گیریاں مائل بنرمی ہو گئیں۔

(۲)

جاڑے کے دن تھے۔ اور رات کا وقت نمک کے برقنداز اور چوکیدار شراب خانے کے دربان بنے ہوئے تھے۔ منشی جی کو ابھی یہاں آئے ہوئے چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے لیکن اُسی عرصے میں اُن کی فرض شناسی اور دیانت نے افسروں کا اعتبار اور پبلک کی بے اعتباری حاصل کر لی تھی۔ نمک کے دفتر سے ایک میل پورب کی جانب جمنا ندی بہتی تھی۔ اور اس پر کشتیوں کی ایک گزرگاہ بنی ہوئی تھی۔ داروغہ صاحب کمرہ بند کئے میٹھی نیند سوتے تھے۔ یکایک آنکھ کھلی تو ندی کے میٹھے سہانے راگ کے بجائے گاڑیوں کا شور و غل اور ملاحوں کی بلند آوازیں کان میں آئیں اُٹھ بیٹھے۔ اتنی رات گئے گاڑیاں کیوں دریا کے پار جاتی ہیں اگر کچھ دغا نہیں ہے تو اس پردۂ تاریک کی ضرورت کیوں۔ شبہ کو استدلال نے ترقی دی۔ وردی پہنی طپنچہ جیب میں رکھا۔ اور آن کی

آن میں گھوڑا بڑھائے دریا کے کنارے آپہنچے دیکھا تو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار زلفِ محبوب سے بھی زیادہ طولانی پُل سے اُتر رہی ہے، حاکمانہ انداز سے بولے۔

"کس کی گاڑیاں ہیں؟"

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا۔ آدمیوں میں کچھ سرگوشیاں ہوئیں۔ تب اگلے گاڑیبان نے جواب دیا۔ "پنڈت الوپی دین کی۔"

"کون پنڈت الوپی دین؟"

"داتا گنج کے۔"

مُنشی بنسی دھر چونکے۔ الوپی دین اس علاقے کا سب سے بڑا اور ممتاز زمیندار تھا لاکھوں کی ہنڈیاں چلتی تھیں۔ غلّے کا کاروبار الگ۔ بڑا صاحب اثر۔ بڑا حکّام رس بڑے بڑے انگریز افسر اُس کے علاقے میں شکار کھیلنے آتے اور اس کے مہمان ہوتے۔ بارہ مہینے سدابرت چلتا تھا۔ پُوچھا، کہاں جائیں گی؟ جواب مِلا۔ کہ کان پور کو۔ لیکن اس سوال پر کہ "ان میں ہے کیا؟" ایک خاموشی کا عالم طاری ہوگیا۔ اور داروغہ صاحب کا شبہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ جواب کے ناکام انتظار کے بعد ذرا زور سے بولے "کیا تم سب گونگے ہوگئے۔ ہم پوچھتے ہیں ان میں کیا لدا ہے۔؟"

(۳)

جب اب کے بھی کوئی جواب نہ ملا۔ تو انھوں نے گھوڑے کو ایک گاڑی سے ملا دیا اور ایک بورے کو ٹٹولا۔ شبہ یقین سے ہم آغوش تھا۔ یہ نمک کے ڈھیلے تھے۔

پنڈت الوپی دین اپنے سجیلے رتھ پر سوار کچھ سوتے کچھ جاگتے چلے آتے تھے کہ دفعتاً کئی گھبرائے ہُوئے گاڑیبانوں نے آکر جگایا۔ اور بولے۔ "مہاراج! درو غانے گاڑیاں روک دیں اور گھاٹ پر کھڑے آپ کو بُلاتے ہیں۔"

پنڈت الوپی دین کو مبلغ علیہ السلام کی طاقت کا پورا پورا اور عملی تجربہ تھا۔ وہ

کہا کرتے تھے کہ دنیا کا ذکر ہی کیا، دولت کا سکہ بہشت میں بھی رائج ہے اور اُن کا یہ قول بہت صحیح تھا، قانون اور حق و انصاف یہ سب دولت کے کھلونے ہیں، جن سے وہ حسب ضرورت اپنا جی بہلایا کرتی ہے۔ لیٹے لیٹے امیرانہ بے پروائی سے بولے، اچھا چلو، ہم آتے ہیں۔ یہ کہہ کر پنڈت جی نے بہت اطمینان سے پان کے بیڑے لگائے اور تب لحاف اوڑھے ہوئے داروغہ جی کے پاس آکر بے تکلفانہ انداز سے بولے، بابو جی آشیرباد، ہم سے ایسی کیا خطا ہوئی کہ گاڑیاں روک دی گئیں، ہم برہمنوں پر تو آپ کی نظر عنایت ہی رہنی چاہیئے۔"

بنسی دھر نے الوپی دین کو پہچانا بے اعتنائی سے بولے: "سرکاری حکم۔"

الوپی دین نے ہنس کر کہا: "ہم سرکاری حکم کو نہیں جانتے اور نہ سرکار کو، ہمارے سرکار تو آپ ہی ہیں، ہمارا اور آپ کا تو گھر کا معاملہ ہے، کبھی آپ سے باہر ہو سکتے ہیں، آپ کا تو گھر کا معاملہ ہے، کبھی آپ سے باہر ہو سکتے ہیں، آپ نے ناحق تکلیف کی، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ادھر سے جائیں اور اس گھاٹ کے دیوتا کو بھینٹ نہ چڑھائیں، میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔

بنسی دھر پر دولت کی ان شیریں زبانیوں کا کچھ اثر نہ ہوا، دیانتداری کا تازہ جوش تھا، کڑک کر بولے: "ہم ان نمک حراموں میں نہیں ہیں، جو کوڑیوں پر اپنا ایمان بیچتے پھرتے ہیں، آپ اس وقت حراست میں ہیں، صبح کو آپ کا باقاعدہ چالان ہوگا، بس مجھے زیادہ باتوں کی فرصت نہیں ہے، جمعدار بدلو سنگھ! تم انہیں حراست میں لے لو میں حکم دیتا ہوں۔"

پنڈت الوپی دین اور اس کے ہوا خواہوں اور گاڑیبانوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی، یہ شاید زندگی میں پہلا موقع تھا کہ پنڈت جی کو ایسی ناگوار باتوں کے سننے کا اتفاق ہوا، بدلو سنگھ آگے بڑھا، لیکن فرط رعب سے ہمت نہ پڑی کہ ان کا ہاتھ پکڑ سکے، الوپی دین نے بھی فرض کو دولت سے ایسا بے نیاز اور ایسا بے غرض کبھی نہیں پایا تھا، سکتے میں آگئے،

خیال کیا کہ یہ ابھی طفلِ مکتب ہے، دولت کے ناز و انداز سے مانوس نہیں ہوا، الھڑ ہے، جھجکتا ہے، زیادہ ناز برداری کی ضرورت ہے۔ بہت منکرانہ انداز سے بولے "بابو صاحب! ایسا ظلم نہ کیجئے ہم مٹ جائیں گے۔ عزت خاک میں مل جائے گی۔ آخر آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔ بہت ہوا تو تھوڑا سا انعام و اکرام مل جائے گا، ہم کسی طرح آپ سے باہر تھوڑا ہی ہیں۔"

بنسی دھر نے سخت لہجے میں کہا "ہم ایسی باتیں سُننا نہیں چاہتے۔"

الوپی دین نے جس سہارے کو چٹان سمجھ رکھا تھا، وہ پاؤں کے نیچے سے کھسکتا ہوا معلوم ہوا، اعتماد نفس اور غرورِ دولت کو سخت صدمہ پہنچا، لیکن ابھی تک دولت کی تعدادی قوت کا پورا بھروسہ تھا، اپنے مختار سے بولے۔ لالہ جی! ایک ہزار روپیہ کا نوٹ بابو صاحب کی نذر کرو۔ آپ اس وقت بھوکے شیر ہو رہے ہیں۔

بنسی دھر نے گرم ہو کر کہا۔ "ایک ہزار نہیں مجھے ایک لاکھ بھی فرض کے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔" دولت فرض کی اس خام کارانہ جسارت اور اس زاہدانہ نفس کشی پر جھنجھلا گئی اور اب ان دونوں طاقتوں کے درمیان بڑے معرکے کی کشمکش شروع ہوئی، دولت نے پیچ و تاب کھا کھا کر مایوسانہ جوش کے ساتھ کئی حملے کئے، ایک سے پانچ ہزار تک، پانچ سے دس، دس سے پندرہ اور پندرہ سے بیس ہزار تک نوبت پہنچی۔ لیکن فرض مردانہ ہمت کے ساتھ اس سپاہِ عظیم کے مقابلہ میں یکّہ و تنہا پہاڑ کی طرح اٹل کھڑا تھا۔

الوپی دین مایوسانہ انداز سے بولے "اس سے زیادہ میری ہمت نہیں۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔" بنسی دھر نے اپنے جمعدار کو للکارا، بدلو سنگھ دل میں داروغہ جی کو گالیاں دیتا ہوا الوپی دین کی طرف بڑھا۔ پنڈت جی گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اور نہایت منت آمیز بے کسی کے ساتھ بولے "بابو صاحب! ایشور کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔ پچیس ہزار پر معاملہ کرنے کو تیار ہوں۔"

"غیر ممکن۔"

"تیس ہزار دو۔"

"غیر ممکن۔"

"کیا چالیس ہزار بھی ممکن نہیں۔"

"چالیس ہزار۔ نہیں چالیس لاکھ یہ بھی غیر ممکن۔ بدلو منتھ! اس شخص کو فوراً حراست میں لے لو۔ اب میں ایک لفظ بھی سُننا نہیں چاہتا۔"

فرض نے دولت کو پاؤں تلے کچل ڈالا۔ الوپی دین نے ایک قوی ہیکل جوان کو ہتھکڑیاں لئے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا، چاروں طرف مایوسانہ نگاہیں ڈالیں اور تب غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔

(۲)

دنیا سوتی تھی، مگر دنیا کی زبان جاگتی تھی۔ صبح ہوئی تو یہ واقعہ بچّے بچّے کی زبان پر تھا، اور ہر گلی کوچے سے ملامت اور تحقیر کی صدائیں آتی تھیں، گویا دنیا میں اب گناہ کا وجود نہیں رہا۔ پانی کو دودھ کے نام سے بیچنے والا گوالا فرضی روزنامچے بھرنے والے حکام سرکار۔ ٹکٹ کے بغیر ریل پر سفر کرنے والے بابو صاحبان اور جعلی دستاویزیں بنانے والے سیٹھ اور ساہوکار یہ سب اس وقت پارساؤں کی طرح گردنیں ہلاتے تھے اور جب دوسرے دن پنڈت الوپی دین کا مواخذہ ہوا، اور وہ کانسٹیبلوں کے ساتھ شرم سے گردن جھکائے ہوئے عدالت کی طرف چلے، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، دل میں غصّہ و غم، تو سارے شہر میں ہلچل سی مچ گئی۔ میلوں میں بھی شاید شوقِ نظارہ ایسی امنگ پر نہ آتا ہو۔ کثرتِ ہجوم سے سقف و دیوار میں تمیز کرنا مشکل تھا۔

مگر عدالت میں پہنچنے کی دیر تھی، پنڈت الوپی دین اس قلزمِ ناپیدا کنار کے نہنگ تھے، حکام اُن کے قدر شناس، عملے اُن کے نیاز مند، وکیل اور مختار اُن کے ناز بردار

اور اردلی، چپراسی اور چوکیدار تو ان کے درم خریدہ غلام تھے۔ انہیں دیکھتے ہی چاروں طرف سے لوگ دوڑے۔ ہر شخص حیرت سے انگشت بدنداں تھا۔ اس لئے نہیں کہ الوپی دین نے کیوں ایسا فعل کیا، بلکہ وہ کیوں قانون کے پنجے میں آئے۔ ایسا شخص جس کے پاس محال کو ممکن کرنے والی دولت اور دیوتاؤں پر جادو ڈالنے والی چرب زبانی ہو، کیوں قانون کا شکار بنے۔ حیرت کے بعد ہمدردی کے اظہار ہونے لگے۔ فوراً اس حملے کو روکنے کے لئے وکیلوں کا ایک دستہ تیار کیا گیا۔ اور انصاف کے میدان میں فرض اور دولت کی باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ بنسی دھر خاموش کھڑے تھے۔ یکّہ و تنہا۔ سچّائی کے سوا اور کچھ پاس نہیں۔ صاف بیانی کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں۔ استغاثہ کی شہادتیں ضرور تھیں لیکن ترغیبات سے ڈانواڈول تھے کہ انصاف بھی کچھ ان کی طرف سے کھچا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ انصاف سیم و زر سے بے نیاز ہے۔ لیکن پردے میں وہ اشتیاق ہے جو ظہور میں ممکن نہیں۔ دعوت اور تحفے کے پردے میں بیٹھ کر دولت زاہد فریب بن جاتی ہے۔ وہ عدالت کا دربار تھا۔ لیکن اس کے ارکان پر دولت کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ مقدمہ بہت جلد فیصل ہو گیا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ نے تجویز لکھی۔ پنڈت الوپی دین کے خلاف شہادت نہایت کمزور ہے۔ وہ ایک صاحب ثروت رئیس ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ محض چند ہزار کے فائدے کے لئے ایسی کمینہ حرکت کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ داروغہ صاحب نمک منشی بنسی دھر پر اگر زیادہ سنگین نہیں تو ایک افسوسناک غلطی اور خام کارانہ سرگرمی کا الزام ضرور عائد ہوتا ہے۔

ہم خوش ہیں کہ وہ ایک فرض شناس نوجوان ہے۔ لیکن صیغہ نمک کی اعتدال سے بڑھی ہوئی نمک حلالی نے اس کے امتیاز و ادراک کو مغلوب کر دیا۔ اسے آئندہ ہوشیار رہنا چاہیئے۔ وکیلوں نے یہ تجویز سنی اور اچھل پڑے۔ پنڈت الوپی دین مسکراتے ہوئے باہر نکلے حوالیوں نے روپے برسائے۔ سخاوت اور فراخ حوصلگی کا سیلاب آ گیا اور اس کی لہروں

نے عدالت کی بُنیادیں تک ہلا دیں۔ جب بنسی دھر عدالت سے باہر نکلے، نگاہیں غرور سے لبریز تو طعن اور تمسخر کے آوازے چاروں طرف سے آنے لگے۔ چپراسیوں اور برقندازوں نے جھک کر سلام کئے۔ لیکن ایک ایک اشارہ اس وقت اس نشۂ غرور پر ہوائے سرد کا کام کر رہا تھا۔ شاید مقدمے میں کامیاب ہو کر وہ شخص اس طرح اکڑتا ہوا نہ چلتا۔ دنیا نے اُسے پہلا سبق دے دیا تھا۔ انصاف علم اور پنج حرفی خطابات اور لمبی داڑھیاں اور ڈھیلے ڈھالے چغے ایک بھی حقیقی عزت کے مستحق نہیں۔

(۵)

لیکن بنسی دھر نے ثروت اور رسوخ سے بَیر مول لیا تھا۔ اس کی قیمت دینی واجب تھی مشکل سے ایک ہفتہ گذرا ہوگا، کہ معطلی کا پروانہ آپہنچا، فرض شناسی کی سزا ملی بے چارے دل شکستہ اور پریشان حال اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ بوڑھے منشی جی پہلے ہی سے بدظن ہو رہے تھے۔ کہ چلتے چلتے سمجھایا تھا۔ مگر اس لڑکے نے ایک نہ سُنی۔ ہم تو کلوار اور بوچڑ کے تقاضے سہیں، بڑھاپے میں بھگت بن کر بیٹھیں اور وہاں بس وہی سوکھی تنخواہ۔ آخر ہم نے بھی نوکری کی ہے۔ اور کوئی عہدہ دار نہیں تھے۔ لیکن جو کام کیا، دل کھول کر کیا۔ اور آپ دیانتدار بننے چلے ہیں گھر میں چاہے اندھیرا رہے مسجد میں ضرور چراغ جلا دینگے۔ جب ایسی سمجھ پر پڑھانا لکھانا سب اکارت گیا۔ اسی اثنا میں بنسی دھر خستہ حال مکان پر پہنچے اور بوڑھے منشی جی نے یہ روداد سُنی تو سر پیٹ لیا۔ اور بولے جی چاہتا ہے کہ اپنا اور تمہارا سر پھوڑ لوں۔ بہت دیر تک پچتاتے اور کف افسوس ملتے رہے۔ غصے میں کچھ سخت سُست بھی کہا۔ اور بنسی دھر اگر وہاں سے ٹل نہ جائیں تو عجب نہیں تھا، کہ یہ غصہ عملی صورت اختیار کر لیتا۔ بوڑھی امّاں کو بھی صدمہ ہوا۔ جگن ناتھ اور رامیشور کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور بیوی نے تو کئی دن تک سیدھے مُنہ سے بات نہیں کی۔

اس طرح اپنے یگانوں کی ترش روئی اور بیگانوں کی دلدوز ہمدردیاں سہتے سہتے

ایک ہفتہ گذر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ بوڑھے منشی رام نام کی مالا پھیر رہے تھے کہ اُن کے دروازے پر ایک سجا ہوا رتھ آکر رُکا۔ سبز اور گلابی پردے۔ پچھائیں نسل کے بیل، اُن کی گردنوں میں نیلے دھاگے۔ سینگ پیتل سے منڈھے ہوئے۔ منشی جی پیشوائی کو دوڑے دیکھا تو پنڈت الوپی دین ہیں۔ جھک کر ڈنڈوت کی اور مدّبرانہ دُرافشانیاں شروع کیں آپ کو کون سا منہ دکھائیں۔ منہ میں کالک لگی ہوئی ہے۔ مگر کیا کریں۔ لڑکا نالائق ہے ناخلف ہے۔ ورنہ آپ سے کیوں منہ چھپاتے۔ ایشور بے چراغ رکھے۔ مگر ایسی اولاد نہ دے۔ بنسی دھر نے الوپی دین کو دیکھا مصافحہ کیا۔ لیکن شان خودداری لئے ہوئے فوراً گمان ہوا کہ یہ حضرت مجھے جلانے آئے ہیں۔ زبان شرمندۂ معذرت نہیں ہوئی اپنے والد بزرگوار کا خلوص رواں سخت ناگوار گذرتا۔ یکایک پنڈت جی نے قطع کلام کیا۔ "نہیں بھائی صاحب! ایسا نہ فرمائیے۔

بوڑھے منشی جی کی قیافہ شناسی نے جواب دے دیا۔ انداز حیرت سے بولے "ایسی اولاد کو اور کیا کہوں۔" الوپی دین نے کسی قدر جوش سے کہا۔ "فخر خاندان اور بزرگوں کا نام روشن کرنے والا ایسا سپوت لڑکا پاکر آپ کو پرماتما کا شکر گزار ہونا چاہئیے۔ دنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں جو دیانت پر اپنا سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں۔ داروغہ جی! اسے زمانہ سازی نہ سمجھئے۔ زمانہ سازی کے لئے مجھے یہاں تک تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اُس رات کو آپ نے مجھے حکومت کے زور سے حراست میں لیا تھا۔ آج میں خود بخود آپ کی حراست میں آیا ہوں۔ میں نے ہزاروں رئیس اور امیر دیکھے ہزاروں عالی مرتبہ حکام سے سابقہ پڑا۔ لیکن مجھے زیر کیا۔ تو آپ نے۔ میں نے سب کو اپنا اور اپنی دولت کا غلام بنا کر چھوڑ دیا۔ مجھے اجازت ہے کہ آپ سے کوئی سوال کروں؟

بنسی دھر کو ان باتوں میں کچھ خلوص کی بو آئی۔ پنڈت جی کے چہرے کی طرف اُچٹتی ہوئی مگر تلاش کی نگاہ سے دیکھا۔ صداقت کی گاڑھی گاڑھی جھلک نظر آئی۔ غرور نے

ندامت کو راہ دی۔ شرماتے ہوئے بولے "یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے، فرض نے مجھے آپ کی شان میں بے ادبی کرنے پر مجبور کیا۔ ورنہ میں تو آپ کی خاک پا ہوں۔ جو آپ کا ارشاد ہوگا۔ بحد امکان اس کی تعمیل سے انکار نہ کروں گا۔"

الوپی دین نے التجا آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "دریا کے کنارے آپ نے میرا سوال رد کر دیا تھا۔ لیکن یہ سوال آپ کو قبول کرنا پڑے گا۔"

بنسی دھر نے جواب دیا "میں کس قابل ہوں۔ لیکن مجھ سے جو کچھ ناچیز خدمت ہو سکے گی۔ اس میں دریغ نہ کروں گا۔

الوپی دین نے ایک قانونی تحریر نکالی اور اسے بنسی دھر کے سامنے رکھ کر بولے "اس مختار نامے کو ملاحظہ فرمایئے۔ اور اس پر دستخط کیجئے۔ میں برہمن ہوں، جب تک یہ سوال پورا نہ کیجئے گا، دروازے سے نہ ٹلوں گا۔"

منشی بنسی دھر نے مختار نامے کو پڑھا، تو شکریہ کے آنسو آنکھوں میں بھر آئے پنڈت الوپی دین نے انہیں اپنی ساری ملکیت کا مختیار عام قرار دیا تھا۔ چھ ہزار سالانہ تنخواہ جیب خاص کے لئے، روزانہ خرچ الگ، سواری کے لئے گھوڑے، اختیارات غیر محدود کانپتی ہوئی آواز سے بولے، "پنڈت جی، میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں، کہ آپ نے مجھے ان عنایات بیکراں کے قابل سمجھا۔ لیکن میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ میں اتنے اعلیٰ رتبے کے قابل نہیں ہوں۔"

الوپی دین ہنس کر بولے، "اپنے منہ سے اپنی تعریف نہ کیجئے۔"

بنسی دھر نے متین انداز سے کہا، "یوں میں آپ کا غلام ہوں، آپ جیسے نورانی اوصاف بزرگ کی خدمت کرنا میرے لئے فخر کی بات ہے۔ لیکن مجھ میں نہ علم ہے، نہ فراست نہ تجربہ ہے، جو ان خامیوں پر پردہ ڈال سکے، ایسی معزز خدمات کے لئے ایک بڑے معاملہ فہم اور کار کردہ منشی کی ضرورت ہے۔

الوپی دین نے قلمدان سے قلم نکالا۔ اور بنسی دھر کے ہاتھ میں دے کر بولے۔ "مجھے نہ علم کی ضرورت ہے، نہ فراست کی، نہ کارکردگی کی۔ اور نہ معاملہ فہمی کی۔ ان سنگ ریزوں کے جوہر میں بارہا پرکھ چکا ہوں، اب حسن تقدیر اور حسن اتفاق نے مجھے وہ بے بہا موتی دے دیا ہے، جس کی آپ کے سامنے علم اور فراست کی چمک کوئی چیز نہیں، یہ قلم حاضر ہے۔ زیادہ تامل نہ کیجئے، اس پر آہستہ سے دستخط کیجئے۔ میرے پرماتما سے یہی التجا ہے کہ آپ کو سدا دریا کے کنارے والا بے مروّت سخت زبان، تند مزاج لیکن فرض شناس داروغہ بنائے رکھے۔"

بنسی دھر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، دل کے تنگ ظرف میں اتنا احسان نہ سما سکا، پنڈت الوپی دین کی طرف ایک بار پھر عقیدت اور پرستش کی نگاہ سے دیکھا۔ اور مختار نامے پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دستخط کر دیئے، الوپی دین فرطِ مسرت سے اُچھل پڑے اور انہیں گلے لگا لیا:۔

عالم بے عمل

(۱)

بابو اکھے کمار پٹنہ کے ایک وکیل تھے، اور بڑے وکیلوں میں سمجھے جاتے تھے یعنی رائے بہادری کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جیسا کہ اکثر بڑے آدمیوں کی نسبت مشہور ہے، ان بابو صاحب کا لڑکپن بھی بہت افلاس میں بسر ہوا تھا۔ والدین جب اپنے ناہموار لڑکوں کو تنبیہ کرتے، تو بابو اکھے کمار کا نام تمثیلاً پیش کیا جاتا تھا۔ "اکھے بابو کو دیکھو آج دروازے پر ہاتھی جھومتا ہے، رات پڑھنے کو تیل نہیں میسر ہوتا تھا، پیال جلا کر اس کی آنچ میں پڑھتے سڑک کی لالٹینوں کی روشنی میں سبق یاد کرتے، علم اس طرح آتا ہے"۔ بعض بلند پرواز حضرات اس امر کے شاہد تھے کہ انہوں نے اکھے بابو کو جگنو کی روشنی میں پڑھتے دیکھا ہے۔ آیا جگنو کی دمک یا پیال کی آنچ میں مستقل روشنی ہو سکتی ہے؟ اس کا فیصلہ سننے والوں کے فہم اور فراست پر تھا۔ حاصل کلام یہ کہ اکھے کمار کی مفلسی کا زمانہ رشک کے قابل نہ تھا۔ اور نہ وکالت کا گاؤ کام دھینو ثابت ہوتا، اور دنیا کی ساری نعمتیں اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہیں گی، باطل نکلی، سیاہ گاؤ بخت سیاہ کو روشن نہ کر سکا۔ اچھے دنوں کے انتظار میں بہت دن گزر گئے، اور بالآخر جب اچھے دن آئے، جب گارڈن پارٹیوں میں شریک ہونے کی دعوتیں آنے لگیں، جب وہ عام جلسوں میں کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہونے لگے تو شباب رخصت ہو چکا تھا۔ اور بالوں کو خضاب کی ضرورت محسوس ہونے

لگی تھی، خصوصاً اس وجہ سے کہ حسین اور ہنس مکھ ہیموتی کی خاطر داری لازمی تھی، جس کی مُبارک آمد نے بابو اکھے کمار کی زندگی کی آخری آرزو پوری کر دی تھی۔

(۲)

جس طرح سخاوت انسان کے عیبوں کو چھپا لیتی ہے اسی طرح بخل اس کی خوبیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے، بخیل کے دشمن سب ہوتے ہیں، دوست کوئی نہیں ہوتا، ہر کس و ناکس کو اُس سے بغض للّٰہ ہوتا ہے۔ وہ غریب کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا، وہ بالعموم بہت ہی صلح پسند، سلامت رَو، متقی اور خوددار شریف آدمی ہوتا ہے، مگر بخل کا لا رنگ ہے جس پر کوئی رنگ خواہ کیسا ہی شوخ ہو نہیں چڑھ سکتا۔ بابو اکھے کمار بھی بخیل مشہور تھے حالانکہ جیسا قاعدہ ہے یہ لقب اُنہیں حسد کے دربار سے عطا ہوا تھا، جو شخص بخیل کہا جاتا ہو اُسے سمجھ لو کہ وہ بہت خوش نصیب ہے، اور اُس کے حاسد بہت ہیں، اگر بابو اکھے کمار کوڑیوں کو دانت سے پکڑتے تھے تو کسی کا کیا نقصان تھا۔ اگر اُن کا مکان بہت اعلےٰ پیمانہ پر نہیں سجا ہوا تھا، اگر اُن کے یہاں مفت خوار، اور نکھٹو نوکروں کی فوج نہیں تھی، اگر وہ دو گھوڑوں کی فٹن پر کچہری نہیں جاتے تھے تو کسی کا کیا نقصان تھا، ان کی زندگی کا اصول تھا کہ کوڑیوں کی تم فکر رکھو، روپے اپنی فکر آپ کر لیں گے اور اس زرّیں اصول پر سختی سے کاربند ہونے میں وہ بالکل حق بجانب تھے، انہیں کوڑیوں پر شباب کی بہاریں اور دل کی اُمنگیں نثار کی تھیں، آنکھوں کی بینائی اور صحت جیسی نعمت عظمےٰ اُنہیں کوڑیوں پر صدقے کی تھی، اُنہیں دانتوں سے پکڑتے تھے تو بہت اچھا کرتے تھے، پلکوں سے اُٹھانا چاہیئے تھا۔

مگر حسین ہنس مکھ ہیموتی کا مزاج بالکل اس کے متضاد تھا، اپنی دوسری بہنوں کی طرح وہ بھی تکلف اور آرائش پر جان دیتی تھی، اور گو بابو اکھے کمار ایسے نادان اور ایسے خشک نہیں تھے کہ اس کی قابل قدر کمزوریوں کی قدر نہ کرتے ہیں، وہ سنگار اور

سجاوٹ کی چیزوں کو دیکھ کر کبھی کبھی خوش ہونے کی کوشش بھی کرتے تھے مگر بعض اوقات جب ہیموتی ان کے نیک مشوروں کی پرواہ نہ کر کے دائرۂ اعتدال سے بڑھ جاتی تھی۔ تو اس وقت بابو صاحب کو اس کی خاطر اپنی قوتِ استدلال و تنظیر کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور صرف کرنا پڑتا تھا۔

ایک روز جب اکھے کمار کچہری سے آئے تو عین اور منس مکھ ہیموتی نے ایک رنگین لفافہ ان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ انہوں نے دیکھا تو اندر ایک بہت نفیس گلابی رنگ کی نوید تھی۔ ہیموتی سے بولے۔ "ان لوگوں کو ایک نہ ایک خبط سوجھتا ہی رہتا ہے۔ میرے خیال میں اس ڈرامیٹک پرفارمنس کی ضرورت نہ تھی۔

ہیموتی ان باتوں کے سننے کی عادی تھی مسکرا کر بولی۔ "کیوں اس سے بہتر اور کون خوشی کی تقریب ہو سکتی ہے؟"

اکھے کمار سمجھ گئے۔ کہ اب بحث مباحثہ کی ضرورت آ گئی۔ سنبھل کر بیٹھے اور بولے "جانِ من! بی اے کے امتحان میں پاس ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ہزاروں نوجوان ہر سال پاس ہوتے رہتے ہیں۔ اگر میرا بھائی ہوتا تو میں صرف اس کی پیٹھ ٹھونک کر کہتا کہ شاباش! خوب محنت کی۔ مجھے ڈرامہ کھیلنے کا خیال بھی نہ پیدا ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب تو سمجھدار آدمی ہیں انہیں کیا سوجھی!"

ہیموتی۔ مجھے تو جانا ہی پڑے گا۔

اکھے کمار۔ کیوں کیا وعدہ کر لیا ہے؟

ہیموتی۔ ڈاکٹر صاحب کی بیوی خود آئی تھیں۔

اکھے کمار۔ تو جانِ من! تم بھی کبھی ان کے گھر چلی جانا۔ پر سوں جانے کی کیا ضرورت ہے۔

ہیموتی۔ اب تیاہی دوں مجھے نایکہ کا پارٹ دیا ہے۔ اور میں نے اسے منظور کر لیا ہے۔

یہ کہکر ہیموتی نے ناز سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا، مگر اکھے کمار کو اس خبر سے بہت خوشی نہیں ہوئی، اس سے قبل دو بار ہیموتی شکنتلا بن چکی تھی، ان دونوں موقعوں پر بابو صاحب کو مصارف کثیر برداشت کرنے پڑتے تھے۔ اُنہیں خوف ہُوا کہ اب کے ہفتے میں گھوش کمپنی دوسو کا بل پیش کرے گی، اور اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ ابھی سے روک تھام کی جائے اُنہوں نے بہت ملائمت سے ہیموتی کا ہاتھ پکڑ کر نہایت شیریں اور محبّت آمیز لہجے میں کہا۔ پیاری! یہ بلا پھر تم نے اپنے سر لے لی، اپنی تکلیف اور پریشانی کا بالکل خیال نہیں کیا، یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہاری پریشانی تمہارے اس عاشق زار کو کتنا پریشان کرتی ہے۔ جانِ من! یہ جلسے اخلاقی وجود کے اعتبار سے سخت قابل اعتراض ہیں۔ انہیں موقعوں پر دلوں میں رشک کے بیج پڑ جاتے ہیں، یہیں غیبت کی عادت پڑتی ہے اور یہیں طعنہ بازی اور نوک جھونک کی مشق ہوتی ہے۔ فلاں لیڈی حسین ہے اس لئے اس کی دوسری بہنوں کا فرض ہے کہ اس سے جلیں۔ جانِ من! ایشور نہ کرے کہ کوئی حاسد ہے، مگر حسود دنیا تو اپنے اختیار کی بات نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارا حسنِ جاں سوز کتنے ہی دلوں کو جلا کر راکھ کر دے گا۔ الغرض پیاری ہیمو! مجھے افسوس ہے کہ تم نے مجھ سے پُوچھے بغیر یہ دعوت منظور کر لی۔ مجھے یقین ہے اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ میں اسے پسند نہ کروں گا۔ تو تم ہرگز منظور نہ کرتیں۔

حسین اور ہنس مکھ ہیموتی اس محبت آمیز تقریر کو بظاہر بہت غور سے سُنتی رہی۔ بعد ازاں تجاہل سے بولی "میں نے تو یہ سوچ کر منظور کر لیا تھا۔ کہ کپڑے سب پہلے ہی کے رکھے ہُوئے ہیں، زیادہ سامان کی ضرورت نہ ہو گی، صرف چند گھنٹوں کی تکلیف ہے اور احساسِ منت۔ ڈاکٹروں کو ناراض کرنا بھی تو اچھی بات نہیں ہے، مگر اب نہ جاؤں گی، میں ابھی معذرت لکھے دیتی ہوں۔ بیچ میں کیا فائدہ، خواہ مخواہ کی اُلجھن۔"

یہ سُن کر کہ کپڑے سب پہلے کے رکھے ہُوئے ہیں، کچھ زیادہ خرچ نہ ہو گا۔ اکھے کمار

کے دل پر ایک بڑا بوجھ اُٹھ گیا۔ ڈاکٹروں کو ناراض کرنا بھی تو اچھی بات نہیں، یہ جملہ بھی معنوں سے خالی نہ تھا۔ بابو صاحب پچھتائے، کہ اگر پہلے سے یہ حال معلوم ہوتا، تو کاہے کو واعظ خشک بننا پڑتا، گردن ہلا کر بولے۔ "نہیں نہیں جانِ من! میرا منشا یہ ہرگز نہیں کہ تم جاؤ ہی مت، جب تم دعوت منظور کر چکی ہو، تو اب معذرت کرنا انسانیت سے بعید معلوم ہوتا ہے، میرا صرف منشا یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو ایسے جلسوں سے دور رہنا چاہیئے۔

مگر بھموتی نے اپنا فیصلہ بحال رکھا۔ "اب میں تو جاؤں گی، تمہاری باتیں گرہ میں باندھ لیں۔"

(۴)

دوسرے دن شام کو اکھے کمار ہوا خوری کو نکلے۔ آنند باغ اس وقت جوبن پر تھا، خوش قامت سرو اور اشوک کی دورویہ قطاروں کے بیچ میں سرخ سنگریزوں سے سجی ہوئی سڑک ایسی خوبصورت معلوم ہوتی تھی، گویا کنول کے پتّوں میں پھول کھلا ہوا ہے۔ یا نوک دار پلکوں کے بیچ میں لال متوالی آنکھیں زیب دے رہی ہیں۔ بابو اکھے کمار اس روش پر ہوا کے ہلکے ہلکے فرح بخش جھونکوں کا لطف اُٹھاتے ہوئے ایک سایہ دار کنج میں جا بیٹھے۔ یہ اُن کی مخصوص جگہ تھی۔ اس عنایتوں کی بستی میں آکر تھوڑی دیر کے لئے ان کے دل پر چڑیوں کی شگفتگی اور پتّوں کی شادابی کا بہت ہی پُر سرور اثر ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے ان کا دل بھی پھول کی طرح شگفتہ ہو جاتا تھا۔ یہاں بیٹھے اُنہیں تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اُنہیں ایک بوڑھا آدمی اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس نے سامنے آکر سلام کیا اور ایک سربمہر لفافہ دے کر غائب ہو گیا۔ اکھے کمار نے لفافہ کھولا اور اس کی عنبر ریز مہک سے رُوح پھڑک اُٹھی خط کا مضمون یہ تھا۔

"میرے پیارے اکھے بابو! آپ اس ناچیز کے خط کو پڑھ کر بہت حیرت میں آئیں گے، مگر

مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اس دلیری کو معاف کریں گے، آپ کے حسنِ اخلاق، حسنِ مذاق اور حسنِ معاشرت کی تعریفیں سُن سُن کر میرے دل میں آپ کے لئے ایک محبت آمیز عقیدت پیدا ہو گئی ہے۔ آپ کی سادہ روش نے مجھے فریفتہ کر لیا ہے۔ اگر شرم و حیا دامن گیر نہ ہوتی تو میں اپنے جذبات کا زیادہ پُرجوش الفاظ میں اظہار کرتی، سال بھر ہوا کہ میں نے عام مردوں کی کمزوریوں سے مایوس ہو کر یہ ارادہ قائم کر لیا تھا، کہ بقیہ زندگی مسرتوں کا خواب دیکھنے میں کاٹوں گی، میں نے ڈھونڈا، مگر جس دل کی تلاش تھی، نہ ملا۔ لیکن جب سے میں نے آپکو دیکھا ہے، مسرتوں کی سوئی ہوئی آرزوئیں پیدا ہو گئی ہیں۔ آپ کے چہرے پر حسن اور شباب کی نہ سہی مگر تقوی کی جھلک موجود ہے، جس کی میری نگاہ میں زیادہ عزت ہے۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ اگر آپ کو اپنے اوصاف ظاہری کی فکر ہوتی تو غالباً میرے وجود کا کمزور حصہ زیادہ خوش ہوتا مگر میں حسنِ صورت کی بھوکی نہیں ہوں۔ مجھے ایک سچے، نمائش سے پاک سینے میں دل رکھنے والے انسان کی چاہ ہے، اور میں نے اُسے پا لیا ہے، میں نے ایک ہوشیار غوّاص کی طرح سمندر کی تہہ میں بیٹھ کر اس رتن کو ڈھونڈ نکالا ہے، میری آپ سے صرف یہ التجا ہے کہ آپ کل رات کو ڈاکٹر چیلو کے مکان پر تشریف لائیں، میں آپ کا بہت احسان مانوں گی۔ وہاں ایک سبز پوش عورت اشوکوں کے کنج میں آپ کے لئے آنکھیں فرشِ راہ کئے بیٹھی نظر آئے گی۔"

اس خط کو اکھے کمار نے دوبارہ پڑھا۔ اس کا ان کے دل پر کیا اثر ہوا اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، وہ رشی نہیں تھے۔ حالانکہ ایسے نازک موقعہ پر رشیوں کا پھسل جانا بھی بعید از قیاس نہیں۔ انہیں ایک نشہ سا محسوس ہونے لگا۔ ضرور اس عزت حور نے مجھے یہاں بیٹھے دیکھا ہوگا، میں نے آج کئی دن سے آئینہ بھی نہیں دیکھا۔ جانے چہرے کی کیا کیفیت ہو رہی ہے۔ اس خیال سے بے قرار ہو کر وہ دوڑتے ہوئے ایک حوض پر گئے اور شفاف پانی میں اپنی صورت دیکھی، مگر تسکین نہ ہوئی۔ بہت تیزی

سے قدم بڑھاتے ہوئے مکان کی طرف چلے۔ اور جاتے ہی آئینے پر نگاہ ڈالی۔ خط صاف نہیں ہے۔ اور صافہ اگرچہ بہت خوبصورتی سے نہیں بندھا، تاہم مجھے کوئی بدصورت نہیں کہہ سکتا۔ یہ ضرور کوئی اعلےٰ درجہ کی تعلیم یافتہ بلند خیال عورت ہے، ورنہ معمولی عورتوں کی نگاہ میں تو دولت اور حسن کے سوا اور کوئی چیز جچتی ہی نہیں۔ تاہم میرا یہ پھوہڑپن کسی خوش مذاق عورت کو اچھا نہیں معلوم ہو سکتا۔ مجھے اب اس کا زیادہ خیال رکھنا ہوگا۔ آج میرے نصیب جاگے ہیں۔ بہت مدت کے بعد میرا ایک قدردان سچا جوہری نظر آیا ہے۔ ہندوستانی عورتیں شرم و حیا کی پتلی ہوتی ہیں، تاوقتیکہ اپنے دل کی اضطراب سے مجبور نہ ہو جائیں، وہ ایسا خط لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتیں۔

انہیں خیالوں میں بابو اکھے کمار نے رات کاٹی، پلک تک نہیں جھپکی۔

(۴)

دوسرے دن صبح سے دس بجے تک بابو اکھے کمار نے شہر کی ساری فیشن ایبل دکانوں کی سیر کی۔ دکاندار حیرت میں تھے کہ آج بابو صاحب یہاں کیسے بھول پڑے، کبھی بھول کر بھی نہ جھانکتے تھے۔ یہ کایا پلٹ کیونکر ہوئی؟ غرض آج انہوں نے بڑی بے دردی سے روپیہ صرف کیا۔ اور جب گھر چلے تو فٹن پر بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔

ہیموتی نے ان کے ماتھے پر سے پسینہ صاف کر کے پوچھا۔ "آج سویرے سے کہاں غائب ہو گئے؟" اکھے کمار نے چہرے کو ذرا متین بنا کر جواب دیا۔ "آج جگر میں کچھ درد تھا۔ ڈاکٹر چڈھا کے پاس چلا گیا تھا۔"

ہیموتی کے حسین ہنستے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ بولی۔ "تم نے مجھ سے بالکل ذکر نہیں کیا۔ درد جگر خوفناک مرض ہے۔"

اکھے کمار۔ "ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے، کوئی اندیشے کی بات نہیں ہے۔"

ہیموتی۔ اس کی دوا ڈاکٹر گھیلو کے یہاں بہت مجرب ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر چڈھا صاحب

کی تہہ تک پہنچے بھی یا نہیں۔"

اکھے کمار نے ہیموتی کی طرف ایک بار چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا، اور کھانا کھانے لگے۔ بعد ازاں اپنے کمرے میں جا کر لیٹے۔ شام کو جب وہ پارک، گلفعہ گھر آنند باغ کی سیر کرتے ہوئے فٹن پر جا رہے تھے۔ تو اُن کے ہونٹوں پر سُرخی اور گالوں پر شباب کی گلابی جھلک موجود تھی۔ تاہم قدرت کی بے انصافی پر جس نے اُنہیں دولت حُسن سے محروم رکھا تھا۔ اُنہیں آج جتنا غصّہ آیا، شاید اور کبھی نہ آیا ہو۔ آج وہ پتلی سی ناک کے بدلے اپنا خوبصورت گاؤں اور ڈپلومہ سب کچھ دینے پر آمادہ تھے۔

(۵)

ڈاکٹر کھیڑ کا کوٹھی وضع لتاؤں سے سجا ہوا انگلہ رات کے وقت دن کا سماں دکھا رہا تھا۔ پھاٹک کے ستون، برآمدے کی محرابیں، سروؤں کی قطاریں سب برقی شمعوں سے جگمگا رہی تھیں۔ انسان کی برقی صنعت اپنا بوقلموں کرشمہ دکھا رہی تھی۔ دروازے پر خیر مقدم کا طرّہ، درختوں پر طائر خوش رنگ، لتاؤں میں شگفتہ پھول یہ سب اسی برقی روشنی کے جلوے ہیں۔ اس سہانی روشنی میں رؤسائے شہر محو خرام ہیں۔ ابھی ناٹک شروع ہونے میں کچھ دیر ہے، مگر اشتیاق نے بے قرار طبیعتوں کو کھینچنا شروع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر کھیڑ دروازے پر کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے ہیں، آٹھ بجے ہوں گے کہ بابو اکھے کمار ایک شان رعنائی کے ساتھ اپنی فٹن سے اُترے۔ ڈاکٹر صاحب چونک پڑے یہ آج گولر میں کیسے پھول لگ گئے۔ اُنہوں نے بڑی گرمجوشی سے بابو صاحب سے مصافحہ کیا۔ اور سر سے پاؤں تک اُنہیں غور سے دیکھا۔ اُنہیں کبھی خیال بھی نہ ہوا تھا۔ کہ بابو اکھے کمار ایسے خوش وضع جامہ زیب گبرو نوجوان بن سکتے ہیں۔ مسئلہ تناسخ کی بدیہی مثال آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔

اکھے بابو کو دیکھتے ہی اِدھر اُدھر سے لوگ آ کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ ہر شخص

حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتا تھا، ہونٹ رومال کی آڑ ڈھونڈنے لگے، آنکھیں سرگوشیاں کرنے لگیں، ہر شخص نے غیر معمولی تپاک سے اُن کی مزاج پُرسی کی، میکشوں کی مجلس اور حضرت واعظ کی تشریف آوری کا نظارہ پیش ہو گیا۔

اکھے بابو بہت جھینپ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں اُوپر کو نہ اُٹھتی تھیں۔ اس لئے جب مزاج پُرسیوں کا طوفان دور ہوا تو اُنھوں نے اپنی سبز پوش نازنین کی تلاش میں چاروں طرف ایک وسیع نگاہ دوڑائی اور دل میں کہا، یہ شہدے ہیں، مسخرے، مگر ابھی ابھی اِن کی آنکھیں کھلی جاتی ہیں، میں دکھا دوں گا، کہ مجھ پر بھی حسینوں کی نگاہیں پڑتی ہیں ایسے حسین بھی ہیں، جو صدقِ دل سے میرے مزاج کی کیفیت پوچھتے ہیں، اور جن سے اپنا دردِ دل کہنے میں مَیں بھی رنگین بیان ہو سکتا ہوں، مگر معشوق سبز پوش کا کہیں پتہ نہ تھا نگاہیں چاروں طرف سے گھوم گھام کر ناکام واپس آئیں۔

آدھ گھنٹہ کے بعد ناٹک شروع ہوا۔ بابو صاحب مایوسانہ انداز سے قدم اُٹھاتے ہوئے تھیٹر ہال میں گئے۔ اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ بتّیہ کیبلتے گئے گر پڑے۔ پردہ اُٹھا۔ شکنتلا اپنی دونوں سہیلیوں کے ساتھ سر پر گھڑا رکھے پودوں کو سینچتی ہوئی دکھائی دی ناظرین باغ باغ ہو گئے۔ نعرۂ مرحبا بلند ہوا، شکنتلا کی جو خیالی تصویر کھینچ سکتی ہے، وہ نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی۔ وہی معشوقانہ شگفتگی، وہی دلفریب متانت وہی متوالی چال، وہی شرمیلی آنکھیں، اکھے بابو پہچان گئے۔ یہ حسین سبز پوش ہیموتی تھی۔

بابو اکھے کمار کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ناٹک میں نہ جاؤں گی، میں نے گھنٹوں اُسے سمجھایا، معذرت کرنے پر تیار تھی، مگر محض دوسروں کو رجھانے اور لبھانے کے لئے محض دوسروں کے دلوں میں اپنے حسن اور ادا کا جادو پھونکنے کے لئے محض دوسری عورتوں کو جلانے کے لئے اُس نے میری نصیحتوں کا اور اپنے وعدے کا تھے کہ میری ناراضی کا ذرا بھی خیال نہ کیا، ہیموتی نے بھی اُڑتی

ہوئی نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھا۔ ان کے بانکپن پر اُسے ذرا بھی تعجب نہ ہُوا۔ کم ازکم وہ مسکرائی نہیں۔

ساری محفل پر محویت کا عالم طاری تھا۔ مگر اکھے بابو کی طبیعت وہاں نہ جمتی تھی وہ بار بار اُٹھ کے باہر جاتے۔ اِدھر اُدھر اشتیاق سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھتے اور ہر بار جھنجلا کر واپس آتے۔ یہاں تک کہ بارہ بج گئے۔ اور اب مایوس ہوکر انہوں نے اپنے آپ کو کوسنا شروع کیا۔ مَیں بھی کیسا احمق ہوں۔ ایک شوخ عورت کے چکمے میں آگیا۔ ضرور انہیں بدمعاشوں میں سے کسی کی شرارت ہوگی۔ یہ لوگ مجھے دیکھ دیکھ کر کیسا ہنستے تھے۔ انہیں میں سے کسی مسخرے نے یہ شگوفہ چھوڑا ہے۔ افسوس! سینکڑوں روپے پر پانی پھر گیا۔ خفیف ہُوا۔ وہ الگ۔ کئی مقدمے ہاتھ سے گئے۔ ہیمولی کی نگاہوں میں ذلیل ہو گیا۔ اور یہ سب محض حاسدوں کی خاطر۔ مجھ سے بڑا احمق اور کون ہوگا؟

اس طرح اپنے اوپر لعنت بھیجتے، غصے میں بھرے ہُوئے وہ پھر محفل کی طرف چلے کہ یکایک ایک سرو کے درخت کے نیچے وہ سبز پوش انہیں اشارے سے اپنی طرف بلاتی نظر آئی۔ فرطِ مسرّت سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ دِل و دماغ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ مست وار قدم اُٹھاتے جھومتے اور اینڈتے اس نازنین کے قریب آئے۔ اور عاشقانہ جوش کے ساتھ بولے "اے ملکۂ حسن میَں اس ذرّہ نوازی کے لئے تمہارا تہ دِل سے ممنون ہوں۔ اشتیاق دیدار میں اس عاشق نیم جاں کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اور اگر تمہیں کچھ دیر تک اَور یہ آنکھیں دیکھ نہ پاتیں، تو تمہیں اپنے کشتۂ ناز کی لاش پر حسرت کے آنسو بہانے پڑتے کل شام ہی سے میرے دِل کی جو کیفیت ہو رہی ہے، اس کا ذکر قوت بیان سے باہر ہے۔ جانِ من! مَیں کل کچہری نہ گیا۔ اور کئی مقدمے ہاتھ سے کھوئے مگر تمہارے دیدار سے جو رُوحانی سرور حاصل ہو رہا ہے۔ اس پر مَیں اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہُوں۔ مجھے اب تابِ صبر نہیں ہے۔ آتشِ اشتیاق نے ضبط اور صبر کو جلا کر خاک کر دیا ہے۔ تمہیں اپنے

دیوانہ حسن سے یہ پردہ داری زیبا نہیں، پروانہ اور شمع میں پردہ کیسا۔ اُسے کان زیبائی اور اے روح رعنائی! تیرے سحر انگیز کلمات نے میرے دل میں آرزوؤں کا طوفان برپا کر دیا ہے۔ اب یہ دل تمہارے اوپر صدقے اور یہ جان تمہارے قدموں پر نثار ہے۔

یہ کہتے ہوئے بابو اکھے کمار نے عاشقانہ جسارت سے آگے بڑھ کر اس سبز پوش نازنین کا گھونگھٹ اُٹھا دیا، اور سیمولی کو مسکراتے دیکھ کر بے اختیار منہ سے نکلا۔ "ارے"! اور بس سکتہ ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا۔ گویا آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا۔ بولے "یہ سب تمہاری شرارت تھی۔"

حسین ملبس مکھ سیمولی مسکرائی اور کچھ جواب دینا چاہتی تھی۔ مگر بابو اکھے کمار نے اس وقت زیادہ سوال وجواب کا موقع نہ دیکھا۔ بہت ندامت کے ساتھ بولے، سیمولی اب منہ سے کچھ نہ کہو۔ تم جیتیں اور میں ہار گیا۔ یہ ہار کبھی نہ بھولے گی۔

گناہ کا اگنی کنڈ

(۱)

کنور پرتھی سنگھ مہاراجہ جسونت سنگھ کے بیٹے تھے۔ زیورِ حسن و شجاعت سے آراستہ ایران، مصر، شام وغیرہ ملکوں میں سیر و سیاحت کی تھی۔ اور کئی زبانوں میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ ان کی ایک بہن تھی۔ راج نندنی حسن و ملاحت کی تصویر، شیریں زبان، خوش ادا اور بلند خیال، گناہ سے اُسے خلقی نفرت تھی یہاں تک کہ وہ بارہا مہاراجہ صاحب سے اخلاقی مسائل پر دلیلیں کر چکی تھی اور جب کبھی انہیں نظم و سیاست کے بارے میں کوئی غیر واجب کام کرتے دیکھتی تو اُسے حتے الوسع روکنے کی کوشش کرتی۔ اس کی شادی کنور دھرم سنگھ سے ہوئی تھی جو ایک چھوٹی سی ریاست کے ولیعہد تھے۔ اور جسونت سنگھ کی فوج میں ایک اعلےٰ عہدہ پر مامور تھے۔ دھرم سنگھ بڑا شجاع اور کارپرداز آدمی تھا۔ اُسے ہونہار دیکھ کر مہاراجہ صاحب نے راج نندنی کو اس کے آغوشِ محبت میں سونپ دیا تھا۔ اور یہ بڑے اخلاص سے رہتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے شیدا تھے۔ دھرم سنگھ زیادہ تر جودھپور ہی میں رہتے۔ پرتھی سنگھ اُن کے دلی دوست تھے ایک جان دو قالب۔ ان میں وہ دوستی تھی جو برادرانہ تعلقات سے بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہے دونوں ایک دوسرے کے رازدار اور ہمراز جس طرح ان دونوں راجکماروں میں یگانگی تھی۔ اس طرح دونوں راجکماریاں بھی ایکدوسرے پر جان دیتیں۔ پرتھی سنگھ کی بیوی درگا کنور بہت ہی نیک مزاج، متین اور درگزر کرنے والی عورت تھی۔ عام طور پر نند بھاوج میں چشمکیں رہا کرتی ہیں۔ مگر دونوں عورتیں ایکدوسرے کی عاشقِ زار تھیں اور دونوں سنسکرت علم ادب کی شیدا۔

ایک روز دونوں راجکماریاں باغیچے میں محو خرام تھیں کہ ایک کنیز نے راج نندنی کے ہاتھ

میں ایک پرچہ لاکر رکھ دیا۔ راج نندنی نے کھولا، تو وہ سنسکرت میں لکھا ہوا ایک رقعہ تھا۔ اسے پڑھ کر اس کنیز سے کہا۔ کہ جا انہیں یہاں بھیج دے، ذرا دیر میں ایک عورت بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے آتے دکھائی دی، اس کا سن پچیس سال سے زائد نہ تھا، مگر رنگت زرد تھی، آنکھیں بڑی بڑی اور ہونٹ خشک، چال ڈھال میں نزاکت تھی، اور خط و خال نہایت دلفریب، قیاس یہ کہتا تھا۔ کہ گو اس وقت زمانے نے اس کی یہ حالت بنا رکھی ہے مگر کسی وقت وہ نہایت حسین عورت ہوگی۔ اس عورت نے آکر چوکھٹ چومی اور دعائیں دے کر فرش پہ بیٹھ گئی، راج نندنی نے اسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھ کر پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے، اس نے جواب دیا۔ مجھے برج بلاسی کہتے ہیں۔

راج نندنی۔ کہاں رہتی ہو؟

برج بلاسی۔ یہاں سے تین دن کے راستے پر ایک گاؤں وکرم نگر ہے، وہیں میرا مکان ہے

راج نندنی۔ سنسکرت کہاں پڑھی؟

برج بلاسی۔ میرے باپ سنسکرت کے بڑے پنڈت تھے، انہیں نے تھوڑا بہت پڑھا دیا

راج نندنی۔ تمہارا بیاہ تو ہو گیا ہے نا؟

بیاہ کا نام سنتے ہی برج بلاسی کی آنکھوں سے موتی جھڑنے لگے۔ آواز سنبھال کر بولی اس کا جواب میں پھر کبھی دوں گی۔ میری رام کہانی بڑی دردناک ہے۔ آپ اُسے سن کر رنج ہوگا، اس وقت معاف رکھیئے۔

آج سے برج بلاسی یہاں رہنے لگی، سنسکرت ادب میں اسے بڑی رسائی تھی، اور شعرا کے کلام کی دلدادہ، وہ ہر روز دونوں راجکماریوں کو نظم و نثر کے کلام پڑھ کر سناتی اس کے حسن مذاق اور وسیع علمیت نے رفتہ رفتہ راجکماریوں کے دل میں اس کی محبت اور عزت پیدا کر دی، یہاں تک کہ پاس ادب رتبے کی تمیز اٹھ گئی۔ اور برج بلاسی سہیلیوں کی طرح بے تکلف رہنے لگی۔

(۲)

کئی مہینے گذر گئے۔ کنور بیرتھی سنگھ اور دھرم سنگھ دونوں مہاراجہ صاحب کے ساتھ افغانستان کی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ جُدائی کی یہ گھڑیاں یہاں میگھوت اور رگھوبنس کے مطالعہ میں کٹتیں۔ برج بلاسی کو کالیداس کے کلام سے بہت رغبت تھی۔ اور وہ اس کی توضیح ایسی خوبی سے کرتی اور اس میں ایسے لیسے نکتے نکالتی کہ دونوں راجکماریاں وجد کرنے لگتیں۔ ایک روز شام کا وقت تھا۔ دونوں راجکماریاں پائیں باغ کی سیر کرنے لگیں تو دیکھا برج بلاسی ہری ہری گھاس پر لیٹی ہوئی ہے اور اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ راجکماریوں کے حسنِ سلوک خاطر و مدارات اور بے تکلفانہ برتاؤ نے اُس کا حسن بہت کچھ چمکا دیا تھا وہ اب ان کے ساتھ خود بھی راجکماری معلوم ہوتی۔ مگر ان دلجوئیوں کے باوجود یہ غریب عورت اکثر تنہائی میں بیٹھ کر رو دیا کرتی۔ اسکے دل پر ایک ایسا صدمہ تھا۔ جو اُسے دم بھر بھی چین سے نہ بیٹھنے دیتا۔ راجکماریوں نے اس وقت اُسے روتے دیکھا تو کمال ہمدردی سے اُس کے پاس بیٹھ گئیں۔ راج نندنی نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔ اور اُس کے گلابی رخساروں کو تھپک کر بولی۔ سکھی! تم اپنے دل کا حال ہم کو نہ بتاؤ گی۔ کیا اب بھی ہم غیر ہیں۔ تمہارا یوں اکیلے غم کی آگ میں جلنا ہم سے نہیں دیکھا جاتا۔"

برج بلاسی۔ کچھ آواز سنبھال کر بولی۔ بہن میں ابھاگن ہوں۔ میرا حال مت سنو۔

راج نندنی۔ اگر بُرا نہ مانو۔ تو ایک بات پوچھوں؟

برج بلاسی۔ کیا۔ کہو۔

راج نندنی۔ وہی جو میں نے پہلے دن پوچھا تھا۔ تمہارا بیاہ ہُوا ہے کہ نہیں؟

برج بلاسی۔ اس کا جواب میں کیا دوں۔ ابھی نہیں ہُوا۔

راج نندنی۔ کیا کسی کے پریم کی برچھی جگر میں چبھی ہُوئی ہے؟

برج بلاسی۔ نہیں بہن ایشور جانتا ہے۔

راج نندنی۔ تو اتنی اُداس کیوں رہتی ہو۔ کیا محبّت کا مزہ اُٹھانے کو جی چاہتا ہے؟

برج بلاسی۔ نہیں غم کے سوا دل میں محبّت کی جگہ نہیں ہے۔

راج نندنی۔ ہم محبت کی جگہ پیدا کر دیں گے۔

برج بلاسی کنایہ سمجھ گئی۔ بولی۔ بہن ان باتوں کا چرچا مت کرو۔

راج نندنی۔ میں اب تمہارا بیاہ رچاؤں گی۔ دیوان جے چند کو تم نے دیکھا ہے۔

برج بلاسی آبدیدہ ہو کر بولی۔

راجکماری! میں برت دھارنی ہوں اور اپنے برت کا پورا کرنا ہی میری زندگی کا خاص مقصد ہے اسی عہد کو پورا کرنے کے لئے میں جیتی ہوں۔ ورنہ میں نے ایسی ایسی آفتیں جھیلی ہیں کہ جینے کی آرزو دل میں باقی نہیں رہی۔ میرے باپ بکرم نگر کے جاگیردار تھے۔ میرے سوا ان کے کوئی دوسری اولاد نہ تھی۔ مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ میری ہی خاطر انہوں نے برسوں تک سنسکرت پڑھا سیکھی تھی۔ فنون سپہ گری میں بڑے ماہر کئی بار لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔ ایک دن شام کا وقت تھا۔ گائیں مرغزار سے لوٹ رہی تھیں۔ میں اپنے دروازے پر کھڑی تھی اتنے میں ایک شخص بانکی پگیا باندھے بدن پر ہتھیار لگائے نشہ جوانی سے جھومتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ میری پیاری گائے موہنی اسی وقت چراگاہ سے لوٹی تھی۔ اور اس کا بچہ ادھر اُدھر کلیلیں کر رہا تھا۔ اتفاق سے بچہ اس نوجوان کے پاؤں تلے دب گیا۔ گائے اس آدمی پر جھپٹی۔ راجپوت بڑا دلیر تھا۔ اس نے شاید خیال کیا کہ بھاگتا ہوں۔ تو کلنک کا ٹیکا لگتا ہے۔ فوراً تلوار میان سے کھینچ لی اور گائے پر حملہ کر بیٹھا۔ گائے جھلائی ہوئی تھی۔ مطلق نہ ڈری۔ میری آنکھوں کے سامنے راجپوت نے اس پیاری گائے کو جان سے مار ڈالا۔ دیکھتے دیکھتے صدہا آدمی جمع ہو گئے۔ اور اس شخص کو سخت سست کہنے لگے۔ اتنے میں پتا جی بھی آ گئے۔ وہ سندھیا کرنے گئے ہوئے تھے۔ دروازے پر آ کر دیکھا۔ تو صدہا آدمیوں کا مجمع ہے۔ گائے تڑپ رہی ہے۔ اور اس کا بچہ کھڑا رو رہا ہے۔ پتا جی کی آواز سنتے ہی گائے نے بڑی پُر درد آواز سے کراہا اور ان کی طرف

کچھ ایسی دردناک نگاہوں سے دیکھا کہ پتاجی کو طیش آگیا۔ میرے بعد انہیں یہ گائے ہی پیاری تھی۔ للکار کر بولے "میری گائے کس نے ماری ہے؟" نوجوان شرم سے سر جھکائے سامنے آیا اور بولا۔ "میں نے۔"

پتاجی۔ تم چھتری ہو؟

راجپوت۔ ہاں۔

پتاجی۔ تو کسی چھتری سے ہاتھ ملاتے۔

راجپوت کا چہرہ تمتما گیا۔ بولا۔ کوئی چھتری سامنے آجائے۔"

ہزاروں آدمی کھڑے تھے۔ مگر کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس راجپوت کا سامنا کرے یہ دیکھ کر پتاجی نے تلوار کھینچ لی اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس نے بھی تیغہ نکال لیا۔ اور دونوں آدمیوں میں تیغے چلنے لگے۔ پتاجی بوڑھے تھے۔ سینے پر زخم کاری لگا گر پڑے۔ انہیں اٹھا کر لوگ گھر میں آئے۔ ان کا چہرہ زرد تھا۔ مگر آنکھوں سے غصّے کی چنگاریاں نکل رہی تھیں میں روتی ہوئی ان کے سامنے آئی۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے سب آدمیوں کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ جب میں اور وہ تنہا رہ گئے۔ تو پتاجی بولے۔ "بیٹی! تم راجپوتنی ہو۔؟"

میں۔ جی ہاں

پتاجی۔ راجپوت بات کے دھنی ہوتے ہیں۔

میں۔ جی ہاں۔

پتاجی۔ اس راجپوت نے میری گائے کی جان لی ہے۔ اس کا بدلہ تمہیں لینا ہوگا۔

میں۔ میں آپ کا حکم بجا لاؤں گی۔

پتاجی۔ اگر آج میرا کوئی بیٹا ہوتا۔ تو میں یہ بوجھ تمہاری گردن پر نہ رکھتا۔

میں۔ آپ کا جو کچھ ارشاد ہوگا۔ میں بسر و چشم بجا لاؤں گی۔

پتاجی۔ تم عہد کرتی ہو؟

میں۔ جی ہاں۔

پتاجی۔ اس عہد کو پورا کر دکھاؤ گی۔"

میں۔ جہاں تک میرا بس چلے گا، میں ضرور یہ عہد پورا کروں گی۔

پتاجی۔ یہ میرا تیغہ ہو۔ جب تک تم یہ تیغہ اس راجپوت کے کلیجے میں نہ پیوست کرلینا اپنے اوپر عیش و آرام حرام سمجھنا۔

یہ کہتے کہتے پتاجی کی جان نکل گئی۔ میں نے اسی دن سے جوگن کا بھیس بدل لیا اور اس تیغہ کو پہلو میں چھپائے اس راجپوت نوجوان کی تلاش میں گھومنے لگی۔ برسوں گذر گئے۔ میں کبھی بستیوں میں جاتی۔ کبھی کوہ و بیابان کی خاک چھانتی، مگر اس نوجوان کا سُراغ نہ ملتا۔ ایک روز میں ایک سنسان جگہ میں بیٹھی ہوئی اپنی حسرت نصیبوں پر رو رہی تھی کہ وہی نوجوان شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا "تو کون ہے؟"

میں۔ ایک دکھیاری برہمنی ہوں۔ آپ مجھ پر دیا کیجئے اور مجھے کچھ کھانے کو دیجئے۔

راجپوت۔ اچھا میرے ساتھ آ۔

میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ شخص بے خبر تھا۔ میں نے بجلی کی طرح جھک کر پہلو سے تیغہ نکالا اور اس کے سینے میں بھونک دیا۔ اتنے میں کئی آدمی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں اتنی خوفزدہ ہوئی کہ تیغہ چھوڑ کر بھاگی۔ تین سال تک پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپی رہی۔ بار بار جی میں آیا کہ کہیں ڈوب مروں، مگر جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ نہ جانے کیا کیا ذلت و خواری جھیلنی رہی ہوئی ہے کہ اب تک زندہ ہوں۔ آخر جب بہائم کی طرح جنگل میں رہتے رہتے جی اُکتا گیا تو جودھپور چلی آئی۔ یہاں آپ لوگوں کی غریب پروری کا شہرہ سنا۔ آپ کی سیوا میں آ پہنچی اور تب سے آپ کی شفقتوں کی بدولت آرام سے زندگی بسر کر رہی ہوں۔ یہ میری مختصر رام کہانی ہے۔

راج نندنی نے لمبی سانس لے کر کہا "اوہ! دُنیا میں کیسے کیسے لوگ پڑے ہوئے ہیں، خیر تمہارے تیغے نے اُس کا کام تو تمام کر دیا۔"

برج بلاسی۔ کہاں بہن! وہ بچ گیا، زخم اوچھا پڑا تھا۔ اسی شکل کا ایک نوجوان راجپوت میں نے جنگل میں شکار کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ نہیں معلوم وہی تھا یا اور کوئی؟ شکل بالکل ملتی تھی۔

(۳)

کئی مہینے گذر گئے، راجکماریوں نے جب سے برج بلاسی کی سرگزشت سُنی تھی اس کے ساتھ اور بھی محبّت اور ہمدردی کا برتاؤ کرنے لگی تھیں، پہلے بے تکلفی میں کبھی کبھی چھیڑ چھاڑ ہو جاتی، مگر اب دونوں ہر دم اس کی دلجوئی کیا کرتیں ایک روز بادل گھرا ہُوا تھا، راج نندنی نے کہا، آج بہاری لال کی ست سئی سُننے کو جی چاہتا ہے۔ برکھا رُت پر اس میں بہت عمدہ دوہے ہیں۔

دُرگا کنور، بڑی انمول کتاب ہے سہیلی! تمہاری بغل میں جو الماری رکھی ہوئی ہے، اس میں وہ کتاب ہے ذرا نکالنا۔

برج بلاسی نے کتاب نکالی، اور اُس کا پہلا ہی ورق کھولا، تو اُس کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ کر گر پڑی اسکے ہر ورق پر ایک تصویر زیب دے رہی تھی، یہ اسی ظالم کی تصویر تھی جو اس کے باپ کا قاتل تھا، برج بلاسی کی آنکھیں شعلہ بار ہوگئیں تیوری پر بل پڑ گئے، اپنا عہد یاد آ گیا، مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہُوا کہ اس شخص کی تصویر یہاں کیسے آئی اور اسے ان راجکماریوں سے کیا تعلق ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے زیربار احسان ہو کر اپنا عہد توڑنا پڑے۔ راج نندنی نے اس کی صورت دیکھ کر کہا، سکھی کیا بات ہے یہ غصّہ کیوں؟ برج بلاسی نے آہستہ سے کہا، کچھ نہیں، نہ جانے کیوں چکر آ گیا تھا۔"

آج سے برج بلاسی کے دل میں ایک اور فکر جاگزیں ہوئی، کیا مجھے زیربار احسان

ہو کر اپنا عہد توڑنا پڑے گا۔

(۴)

پورے دو مہینے کے بعد افغانستان سے پرتھی سنگھ اور دھرم سنگھ لوٹے۔ شاہی مہم کو کو بڑی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ برف کثرت سے پڑنے لگی۔ پہاڑوں کے درّے برف سے ڈھک گئے۔ آمد و رفت کے رستے بند ہو گئے۔ رسد کے سامان کمیاب ہونے لگے سپاہی بھوکوں مرنے لگے تب افغانوں نے موقع پا کر شب خون مارنے شروع کئے آخر شہزادہ محی الدین کو ناکام اور پسپا ہو کر واپس آنا پڑا۔

دونوں راجکمار جوں جوں جودھپور کے نزدیک پہنچتے تھے۔ اُن کے دل شوق سے اُمڈے آتے تھے اتنے دنوں کی جُدائی کے بعد پھر وصال نصیب ہوگا۔ شوقِ دیدار قدم بڑھائے جاتا تھا۔ رات دن منزلیں طے کرتے چلے آتے ہیں، تھکن معلوم ہوتی ہے نہ ماندگی۔ دونوں نے زخم کھائے ہیں، مگر پھر ملنے کی خوشی میں زخم کی تکلیف بالکل محسوس نہیں ہوتی۔ پرتھی سنگھ دُرگا کنور کیلئے ایک اصفہانی تیغہ لائے ہیں۔ دھرم سنگھ نے راج نندنی کیلئے کشمیر کی ایک بیش بہا شال مول لی ہے۔ دونوں کے دل اُمنگ سے بھرے ہوئے ہیں۔

راجکماریوں نے جب سُنا کہ دونوں ویر واپس آتے ہیں، تو فرطِ مسرت سے متوالی ہو گئیں شنگار کیا جانے لگا، مانگ موتیوں سے بھری جانے لگی۔ اُن کے چہرے فرطِ مسرت سے گلنار ہوئے جاتے تھے۔ اتنے دنوں کی جُدائی کے بعد پھر ملاپ ہوگا۔ خوشی آنکھوں سے اُبلی پڑتی ہے۔ دونوں ایکدوسرے کو چھیڑتی ہیں اور خوش ہو ہو کر گلے ملتی ہیں۔

اگھن کا مہینہ تھا، برگد کی ڈالیوں میں مونگے کے خوشے لگے ہوئے تھے۔ جودھپور کے قلعے سے سلامیوں کی گھن گرج صدائیں آنے لگیں۔ سارے شہر میں شور مچ گیا کہ کنور پرتھی سنگھ بخیر و عافیت افغانستان سے واپس آئے، دونوں راجکماریاں تھالوں میں آرتی کے سامان لئے دروازے پر کھڑی تھیں، پرتھی سنگھ درباریوں کے سلام لیتے ہوئے

محل میں آئے درگا کنور نے آرتی اُتاری اور دونوں البیلے دُمَر کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ کنور دھرم سنگھ بھی جوش شجاعت سے اینڈتے ہوئے اپنے محل میں داخل ہوئے مگر اندر قدم بھی نہ رکھنے پائے تھے کہ چھینک کی آواز سنائی دی اور داہنی آنکھ پھڑکنے لگی۔ راج نندنی آرتی کا تھال لے کر لپکی۔ مگر پاؤں پھسل گیا اور تھال ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ دھرم سنگھ کا ماتھا ٹھنکا اور راج نندنی کا چہرہ زرد ہو گیا یہ بدشگونی کیوں؟

(۵)

برج بلاسی نے دونوں راجکماروں کے آنے کی خبر پا کر اُن دونوں کی شان میں دو پُر درد قصیدے کہہ رکھے تھے۔ صبح کو جب کنور پرتھی سنگھ سندھیا سے فارغ ہو کر بیٹھے تو وہ ان کے سامنے آئی۔ اور ایک خوبصورت کشتی کی طشتری میں قصیدہ رکھ کر پیش کیا۔ پرتھی سنگھ نے دست شوق بڑھا کر قصیدہ لے لیا۔ شاعری گو اعلےٰ پائے کی نہ تھی۔ مگر کلام میں تازگی اور جدّت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ پرتھی سنگھ نے نفیس شاعرانہ مذاق پایا تھا۔ اس قصیدے کو پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے۔ اور ایک موتیوں کا ہار انعام دیا۔

برج بلاسی یہاں سے فرصت پا کر کنور دھرم سنگھ کے پاس پہنچی۔ وہ بیٹھے ہوئے راج نندنی سے میدانِ جنگ کے واقعات بیان کر رہے تھے۔ مگر جوں ہی برج بلاسی کی نگاہ اُن پر پڑی۔ وہ بے اختیار جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ کنور دھرم سنگھ نے بھی اُسے دیکھا اور چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ ہونٹ خشک ہو گئے۔ اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ سا آگیا۔ برج بلاسی تو اُلٹے قدم واپس ہوئی اور دھرم سنگھ نے چارپائی پر لیٹ کر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔ راج نندنی نے یہ کیفیت دیکھی اور اس کا پھول سا بدن پسینے میں تر ہو گیا۔

دھرم سنگھ سارے دن پلنگ پر خاموش پڑے کروٹیں بدلتے رہے۔ چہرا ایسا کمہلا گیا۔ جیسے برسوں کا مریض۔ راج نندنی اُن کی دلجوئی میں مصروف تھی۔ دن تو یوں کٹا

رات کو کنور صاحب سرِ شام ہی سے تھکن کا بہانہ کرکے لیٹ گئے۔ راج نندنی حیران تھی، کہ ماجرا کیا ہے۔ کیا برج بلاسی انہیں کے خون کی پیاسی ہے۔ کیا ممکن ہے کہ میرا پیارا، میرا عالی دماغ دھرم سنگھ ایسا سنگدل ہو۔ نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا ہر چند چاہتی ہے کہ اپنی خوش ادائیوں سے اُن کے دل کا بوجھ ہلکا کرے مگر ناکام رہتی ہے۔ آخر اُسے بھی نیند نے اپنے آغوش میں لے لیا۔

رات زیادہ آگئی تھی۔ آسمان نے تاریکی کی چادر منہ پر لپیٹ لی تھی بیماروں کی دردناک آواز کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی اور رہ رہ کر قلعے کے سنتریوں کی آواز کان میں آپڑتی تھی۔ راج نندنی کی آنکھ یکایک کھلی، تو دھرم سنگھ کو پلنگ پر نہ پایا اندیشہ ہوا تیزی سے اُٹھ کر برج بلاسی کے کمرے کی طرف چلی اور دروازے پر کھڑی ہو کر اندر جھانکا، شک یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ کیا دیکھتی ہے کہ برج بلاسی ہاتھ میں تیغہ لئے کھڑی ہے اور دھرم سنگھ دونوں ہاتھ جوڑے اس کے سامنے بیکسوں کی طرح گھٹنے ٹیکے بیٹھے ہیں۔

یہ نظارہ دیکھتے ہی راج نندنی کا خون خشک ہو گیا، اور سر میں چکر سا آنے لگا پاؤں لڑکھڑانے لگے، معلوم ہوا کہ گری جاتی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آئی اور منہ ڈھانپ کر لیٹ رہی۔ مگر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا

(۶)

دوسرے دن بیر بھی سنگھ علی الصباح کنور دھرم سنگھ کے پاس گئے اور مسکرا کر کہا "بھیا! موسم بڑا سہانا ہے۔ شکار کھیلنے چلتے ہو؟"

دھرم سنگھ کسی گہرے خیال میں غرق تھے، سر اوپر اُٹھایا تو چہرہ اُداس تھا۔ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، بولے "کیا کہا؟"

بیر بھی سنگھ۔ "شکار کھیلنے چلتے ہو؟"

دھرم سنگھ۔ ہاں چلو۔
دونوں راجکماروں نے گھوڑے کسوائے اور شکار گاہ کی طرف چل دیئے۔

پرتھی سنگھ کا چہرہ شگفتہ تھا۔ جیسے کنول کا پھول کھلا ہو۔ ایک ایک حرکت سے تیزی اور چستی ٹپکی پڑتی تھی۔ مگر کنور دھرم سنگھ کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ گویا بدن میں جان نہیں ہے۔ پرتھی سنگھ نے انہیں کئی مرتبہ چھیڑا مگر دیکھا کہ یہ بہت زیادہ دل گرفتہ ہیں تو خاموش ہو گئے۔ چلتے چلتے دونوں ایک جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ یکایک دھرم سنگھ ٹھٹک گئے۔ اور بولے "میں نے آج رات کو ایک سخت عہد کیا ہے۔" یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ پرتھی سنگھ نے پھر کر پوچھا "کیسا عہد؟"

دھرم سنگھ۔ تم نے برج بلاسی کی سرگذشت سُنی ہے؟"

پرتھی سنگھ۔ ہاں۔

دھرم سنگھ۔ میں نے عہد کیا ہے کہ جس شخص نے اس کے باپ کا خون کیا ہے اُسے بھی جہنم میں پہنچا دوں۔

پرتھی سنگھ۔ تم نے واقعی بڑا دلیرانہ عہد کیا ہے۔

دھرم سنگھ۔ ہاں بشرطیکہ پورا کر سکوں۔ کیوں تمہارے خیال میں ایسا شخص گردن زدنی ہے یا نہیں؟

پرتھی سنگھ۔ ایسے موذی کی گردن کند چھری سے کاٹنی چاہیئے۔

دھرم سنگھ۔ بے شک یہی میرا بھی خیال ہے۔ اگر میں کسی وجہ سے یہ کام سرانجام دے سکوں تو تم میرا عہد پورا کر دو گے؟

پرتھی سنگھ۔ بڑے شوق سے۔ تم اُسے پہچانتے ہو نا؟"

دھرم سنگھ۔ ہاں اچھی طرح۔
پرتھی سنگھ۔ تو بہتر ہو گا کہ یہ کام خیر مجھی کو کرنے دو۔ تمہیں شاید اس پر رحم آجائے۔

دھرم سنگھ۔ بہت خوب۔ مگر یاد رکھو، وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے کئی بار موت کے منہ سے بچ نکلا ہے کیا عجیب ہے کہ تم بھی نرم ہو جاؤ، اس لئے تم بھی عہد کرو کہ اُسے ضرور واصل جہنم کرو گے۔

پرتھی سنگھ۔ میں درگا کی قسم کھاتا ہوں۔ کہ اس شخص کے خون سے اپنے تیغے کی پیاس بجھاؤں گا۔

دھرم سنگھ۔ بس ہم دونوں مل کر یہ مہم سر کر لیں گے۔ تم اپنے عہد پر قائم رہو گا۔
پرتھی سنگھ۔ کیوں؟ میں سپاہی نہیں ہوں۔ ایک دفعہ جو عہد کیا بس سمجھ لو کہ وہ پورا ہو کر رہے گا چاہے اس میں اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔
دھرم سنگھ۔ ہر حالت میں۔
پرتھی سنگھ۔ ہاں ہر حالت میں۔
دھرم سنگھ۔ اگر وہ تمہارا کوئی عزیز ہو تو؟
پرتھی سنگھ۔ (دھرم سنگھ کو ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر) کوئی عزیز ہو تو۔
دھرم سنگھ۔ ہاں ممکن ہے کہ وہ تمہارا کوئی رشتہ دار ہو۔
پرتھی سنگھ (جوش سے) کوئی ہو، اگر میرا بھائی بھی ہو تو زندہ چنوا دوں۔
دھرم سنگھ گھوڑے سے اتر پڑے۔ اُن کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ انہوں نے کمر سے تیغہ کھول کر زمین پر رکھ دیا۔ اور پرتھی سنگھ کو للکار کر بولے۔ "پرتھی سنگھ! تیار ہو جاؤ۔ وہ موذی مل گیا۔" پرتھوی سنگھ نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا، مگر دھرم سنگھ کے سوا اور کوئی دکھائی نہ دیا۔"

دھرم سنگھ۔ تیغہ کھینچو۔
پرتھی سنگھ۔ مَیں نے اُسے نہیں دیکھا۔
دھرم سنگھ۔ وہ تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ وہ سیہ کار موذی دھرم سنگھ ہی ہے۔
پرتھی سنگھ۔ (گھبرا کر) اِی! اِیہ سنگ دل!
دھرم سنگھ۔ راجپوت! اپنا عہد پورا کرو۔

اتنا سنتے ہی پرتھی سنگھ نے بجلی کی طرح کمر سے تیغہ کھینچ لیا۔ اور اُسے دھرم سنگھ کے سینے میں چبھو دیا۔ تیغہ دستے تک چبھ گیا۔ خون کا فوارہ بہ نکلا۔ دھرم سنگھ زمین پر گر پڑے اور آہستہ سے بولے "پرتھی سنگھ! مَیں تمہارا بہت ممنون ہوں۔ تم سچے بیر ہو۔ تم نے مرد کا فرض مرد کی طرح پورا کیا۔

پرتھی سنگھ نے یہ سُنا اور زمین پر بیٹھ کر رونے لگے۔

(۷)

آج راج نندنی ستی ہونے جا رہی ہے۔ اُس نے سولہ سنگار کئے ہیں اور مانگ موتیوں سے بھروائی ہے۔ کلائی میں بیاہ کا کنگن باندھا ہے۔ پاؤں میں سُرخ مہندی رچائی ہے۔ اور گلناری جوڑا زیب تن کیا ہے۔ اُس کے بدن سے خوشبو آ رہی ہے کیونکہ آج وہ ستی ہونے جاتی ہے۔

راج نندنی کا چہرہ ماہ کامل کی طرح روشن ہے اس کی طرف دیکھتے ہی آنکھیں جھپک جاتی ہیں۔ نشۂ محبت سے اس کا رؤیاں رؤیاں مست ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے روحانی نور برس رہا ہے۔ وہ آج آسمان کی دیوی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی چال کیسی مستانہ ہے۔ نشۂ محبت میں جھوم رہی ہے۔ وہ اپنے پیارے پتی کا سر گود میں لئے ہوئے آتی ہے اور اس چتا میں بیٹھ جاتی ہے۔ جو صندل، خس اور عود سے بنائی گئی تھی۔

سارے شہر کے لوگ یہ نظارہ دیکھنے کے لئے اُمڈے چلے آتے ہیں۔ بلیجے بج

رہے ہیں۔ پھولوں کی برکھا ہو رہی ہے۔ ستی چتا میں بیٹھ چکی تھی کہ اتنے میں کنور پرتھی سنگھ آئے اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مہارانی میرا قصور معاف کرو۔"

ستی نے جواب دیا "معاف نہیں ہو سکتا۔ تم نے ایک نوجوان راجپوت کی جان لی ہے تم بھی جوانی ہی میں قتل کئے جاؤ گے۔" ستی کے بچن کبھی جھوٹے ہوئے ہیں۔ یکایک چتا میں آگ کا شعلہ نمودار ہوا۔ جے جے کار کے نعرے بلند ہوئے۔ آگ میں اس کا چہرہ یوں چمکتا تھا۔ جیسے افق کی سرخی میں آفتاب چمکتا ہے۔ ذرا دیر میں وہاں ایک تودہ خاک کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اس ستی کے مزاج میں کیسا ست تھا۔ پرسوں جب اس نے برج بلاسی کو جھجک کر دھرم سنگھ کے سامنے جاتے دیکھا تھا۔ اسی وقت اس کے دل میں شک پیدا ہو گیا تھا۔ مگر جب رات کو اس نے دیکھا کہ میرا شوہر اس عورت کے سامنے بے کسوں کی طرح بیٹھا ہوا ہے تو شک یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ اور یہ یقین ست کا جذبہ اپنے ساتھ لیتا آیا۔ سویرے جب دھرم سنگھ اٹھے تو راج نندنی نے کہا۔ کہ میں برج بلاسی کے دشمن کا سر چاہتی ہوں۔ تمہیں لانا ہو گا۔

دھرم سنگھ نے کہا۔ کہ شام تک تمہارے سامنے وہ سر آجائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اپنے ستی ہونے کے سب اسباب راج نندنی نے خود جان بوجھ کر پیدا کئے۔ کیونکہ اس کے مزاج میں ست تھا:

کیسا اعلیٰ اخلاقی معیار ہے۔ اور کتنی عبرت ناک داستان۔ گناہ کی آگ کیسی تیز اور اس کی لپٹ کیسی جان سوز ہوتی ہے۔ ایک گناہ نے کتنی جانیں جلا ڈالیں شاہی خاندان کے دو راج کنور اور شاہی خاندان کی دو کنواریاں دیکھتے دیکھتے اس اگن کنڈ کی نذر ہو گئیں کیونکہ ستی کا بچن ست ہوا۔ اور ساتھ ہی ہفتے کے اندر پرتھی سنگھ بھی دہلی میں قتل کئے گئے اور درگا کنور نے اپنے تئیں اُن پر قربان کر دیا:

بے غرض محسن

(۱)

ساون کا مہینہ تھا۔ ریوتی رانی نے پاؤں میں مہندی رچائی، مانگ چوٹی سنواری اور تب اپنی بوڑھی ساس سے جا کر بولی "اماں جی! آج میں میلہ دیکھنے جاؤں گی۔"

ریوتی پنڈت چنتامن کی بیوی تھی۔ پنڈت جی نے سرسوتی کی پوجا میں زیادہ نفع نہ دیکھ کر لکشمی دیوی کی مجاوری کرنی شروع کی تھی۔ لین دین کا کاروبار کرتے تھے۔ مگر اور مہاجنوں کے خلاف خاص خاص حالتوں کے سوا ۲۵ فی صدی سے زیادہ سود لینا مناسب نہ سمجھتے تھے۔

ریوتی کی ساس ایک بچّے کو گود میں لئے کھٹولے پر بیٹھی تھیں۔ بہو کی بات سُن کر بولیں "بھیگ جاؤ گی، تو بچّے کو زکام ہو جائے گا۔"

ریوتی "نہیں اماں مجھے دیر نہ لگے گی، ابھی چلی آؤں گی۔"

ریوتی کے دو بچّے تھے ایک لڑکا دوسری لڑکی۔ لڑکی ابھی گود میں تھی اور لڑکا ہیرامن ساتویں سال میں تھا۔ ریوتی نے اُسے اچھے اچھے کپڑے پہنائے۔ نظر بد سے بچانے کے لئے ماتھے اور گالوں پر کاجل کے ٹیکے لگا دئیے، گڑیاں پیٹنے کے لئے ایک خوش رنگ چھڑی دے دی اور اپنی ہمجولیوں کے ساتھ میلہ دیکھنے چلی

کیرت ساگر کے کنارے عورتوں کا بڑا جمگھٹ تھا۔ نیلگوں گھٹائیں چھائی ہوئی

تھیں، عورتیں سولہ سنگار کر کے ساگر کے پُرفضا میدان میں ساون کی رم جھم برکھا کی بہار لوٹ رہی تھیں۔ شاخوں میں جھولے پڑے تھے کوئی جھولا جھولتی کوئی ملہار گاتی، کوئی ساگر کے کنارے بیٹھی لہروں سے کھیلتی تھی، ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا، پانی کی ہلکی ہلکی پھوار، پہاڑیوں کی نکھری ہوئی ہریاول، لہروں کے دلفریب جھکولے موسم کو توبہ شکن بنائے ہوئے تھے۔

آج گڑیوں کی بدائی ہے۔ گڑیاں اپنے سسرال جائیں گی۔ کنواری لڑکیاں ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے گڑیوں کو گہنے کپڑے سے سجائے انہیں بدا کرنے آئی ہیں۔ اُنہیں پانی میں بہاتی ہیں۔ اور چہک چہک کر ساون کے گیت گاتی ہیں مگر دامنِ عافیت سے نکلتے ہی ان ناز و نعمت میں پلی ہوئی گڑیوں پر چاروں طرف سے چھڑیوں اور لکڑیوں کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے۔

ریوتی یہ سیر دیکھ رہی تھی اور ہیرامن ساگر کے زینوں پر اور لڑکیوں کے ساتھ گڑیاں پیٹنے میں مصروف تھا۔ زینوں پر کائی لگی ہوئی تھی۔ دفعتہً اُس کا پاؤں پھسلا تو پانی میں جا پڑا۔ ریوتی چیخ مار کر دوڑی اور سر پیٹنے لگی۔ دم کے دم میں وہاں مردوں اور عورتوں کا ایک ہجوم ہو گیا۔ مگر یہ کسی کی انسانیت تقاضا نہ کرتی تھی، کہ پانی میں جا کر ممکن ہو تو بچے کی جان بچائے۔ سنوارے ہوئے گیسو نہ بکھر جائیں گے! دھلی ہوئی دھوتی نہ بھیگ جائے گی۔ کتنے ہی مردوں کے دلوں میں یہ مردانہ خیالات آ رہے تھے۔ دس منٹ گزر گئے۔ مگر کوئی شخص کمر ہمت باندھتا نظر نہ آیا، غریب ریوتی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ ناگاہ ایک آدمی اپنے گھوڑے پر سوار چلا جاتا تھا۔ یہ اژدحام دیکھ کر اتر پڑا۔ اور ایک تماشائی سے پوچھا "یہ بھیڑ کیسی ہے" تماشائی نے جواب دیا "ایک لڑکا ڈوب گیا ہے"

مسافر: کہاں؟

تماشائی، جہاں وہ عورت کھڑی رو رہی ہے۔

مسافر نے فوراً اپنی گاڑھے کی مرزئی اُتاری، اور دھوتی کس کر پانی میں کُود پڑا۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ متحیر تھے کہ کون شخص ہے اُس نے پہلا غوطہ لگایا تو اُس کی چھتری ہاتھ لگی۔ اور دوسرا غوطہ لگایا تو اُس کی ٹوپی ملی۔ تیسرے غوطے کے جب اُوپر آیا تو لڑکا اُس کی گود میں تھا۔ تماشائیوں نے واہ واہ کا نعرہ پرشور بلند کیا۔ ماں نے دوڑ کر بچے کو لپٹا لیا۔ اس اثنا میں پنڈت چنتامن کے اور کئی عزیز آپہنچے اور لڑکے کو ہوش میں لانے کی فکر کرنے لگے۔ آدھ گھنٹے میں لڑکے نے آنکھیں کھول دیں۔ لوگوں کی جان میں جان آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اگر لڑکا دو منٹ بھی پانی میں اور رہتا تو بچنا غیر ممکن تھا۔ مگر جب لوگ اپنے گمنام محسن کو ڈھونڈنے لگے تو اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف آدمی دوڑائے سارا میلہ چھان مارا۔ مگر وہ نظر نہ آیا؛

(۲)

بیس سال گذر گئے۔ پنڈت چنتامن کا کاروبار روز بروز بڑھتا گیا۔ اس دوران میں اسکی ماں نے سات جاترائیں کیں اور مریں۔ تو اِن کے نام پر ٹھاکر دوارا تیار ہوا۔ ریوتی بہو سے ساس بنی لین دین بہی کھاتہ ہیرامن کے ہاتھ میں آیا۔ ہیرامن اب ایک وجیہہ شکیل نوجوان تھا۔ نہایت خلیق نیک مزاج۔ کبھی کبھی باپ سے چھپا کر غریب اسامیوں کو قرض حسنہ دیا تھا۔ چنتامن نے کئی بار اس گناہ کے لئے بیٹے کو آنکھیں دکھائی تھیں۔ اور الگ کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ ہیرامن نے ایک بار ایک سنسکرت پاٹھ شالا کے لئے پچاس روپیہ چندہ دیا۔ پنڈت جی اس پر ایسے برہم ہوئے کہ دو دن تک کھانا نہیں کھایا۔ ایسے ناگوار واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ انہیں وجوہ سے ہیرامن کی طبیعت باپ سے کچھ کھچی رہتی تھی۔ مگر اس کی یہ ساری شرارتیں ہمیشہ ریوتی کی سازش سے ہوا کرتی۔ جب قصبے کی غریب بدھوائیں یا

زمینداروں کے ستائے ہوئے آسامیوں کی عورتیں ریوتی کے پاس آکر ہیرامن کو آنچل پھیلا پھیلا کر دعائیں دینے لگتیں تو اُسے ایسا معلوم ہوتا، کہ مجھ سے زیادہ بھاگوان اور میرے بیٹے سے زیادہ فرشتہ صفت آدمی دُنیا میں کوئی نہ ہوگا، تب اُسے بے اختیار وہ دن یاد آجاتا، جب ہیرامن کرت ساگر میں ڈوب گیا تھا۔ اور اُس آدمی کی تصویر اُس کی نگاہوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی، جس نے اُس کے لال کو ڈوبنے سے بچایا تھا۔ اُس کے تہہ دل سے دعا نکلتی اور ایسا جی چاہتا کہ اُسے دیکھ پاتی تو اُس کے پاؤں پر گر پڑتی۔ اُسے اب یقین کامل ہو گیا تھا کہ وہ انسان نہ تھا، بلکہ کوئی دیوتا تھا۔ وہ اب اُسی کھٹولے پر بیٹھی ہوئی جس پر اس کی ساس بیٹھی تھی اپنے دونوں پوتوں کو کھلایا کرتی تھی۔

آج ہیرامن کی ستائیسویں سالگرہ تھی۔ ریوتی کے لئے یہ دن سال بھر کے دنوں میں سب سے زیادہ مُبارک تھا۔ آج اس کا دستِ کرم خوب فیاضی دکھاتا تھا۔ اور یہی ایک بے جا صرف تھا، جس میں پنڈت چنتامن بھی اس کے شریک ہو جاتے تھے۔ آج کے دن وہ بہت خوش ہوتی۔ اور بہت روتی۔ اور آج اپنے گمنام محسن کے لئے اُس کے دل سے جو دعائیں نکلتیں وہ دل و دماغ کے اعلیٰ ترین جذبات میں رنگی ہوئی تھیں اُسی کی بدولت تو آج مجھے یہ دن اور سُکھ دیکھنا میسّر ہوا ہے۔

(۱۳)

ایک دن ہیرامن نے آکر ریوتی سے کہا۔ امّاں! امہری پور نیلام پر چڑھا ہوا ہے کہو تو میں بھی دام لگاؤں۔"

ریوتی۔ سولھوں آنہ ہے؟

ہیرامن۔ سولھوں آنہ۔ اچھا گاؤں ہے۔ نہ بڑا نہ چھوٹا۔ یہاں سے دس کوس ہے۔ بیس ہزار تک بولی چڑھ چکی ہے۔ سَو دو سَو میں ختم ہو جائے گا۔

ریوتی۔ اپنے دادا سے تو پوچھو

ہیرامن۔ ان کے ساتھ دو گھنٹے تک مغز کرنے کی کسے فرصت ہے۔

ہیرامن اب گھر کا مختارِ کل ہو گیا تھا۔ اور ریوتی اس کی ایک نہ چلنے پاتی۔ وہ غریب اب عینک لگائے ایک گدّے پر بیٹھے اپنا وقت کتھا سننے میں صرف کرتے تھے۔

دوسرے دن ہیرامن کے نام پر بسری پور ختم ہو گیا۔ مہاجن سے زمیندار ہوئے اپنے منیب اور دو چپراسیوں کو لے کر گاؤں کی سیر کرنے چلے۔ بسری پور والوں کو خبر ہوئی نئے زمیندار کی پہلی آمد تھی۔ گھر گھر نذرانہ دینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پانچویں دن شام کے وقت ہیرامن گاؤں میں داخل ہوئے۔ دہی اور چاول کا تلک لگایا گیا۔ اور تین سو اسامی پہر رات تک ہاتھ باندھے ہوئے ان کی خدمت میں کھڑے رہے۔ سویرے مختارِ عام نے اسامیوں کا تعارف کرانا شروع کیا۔ جو اسامی زمیندار کے سامنے آتا وہ اپنی بساط کے موافق ایک یا دو روپے اُن کے پاؤں پر رکھ دیتا۔ دوپہر ہوتے ہوتے وہاں پانچ سو روپوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

ہیرامن کو پہلی بار زمینداری کا مزہ ملا پہلی بار ثروت اور طاقت کا نشہ محسوس ہوا۔ سب نشوں سے زیادہ تیز۔ زیادہ قاتل ثروت کا نشہ ہے۔ جب اسامیوں کی فہرست ختم ہو گئی تو مختار سے بولے۔ "اور کوئی اسامی تو باقی نہیں ہے۔"؟

مختار۔ ہاں مہاراج! ابھی ایک اسامی اور ہے۔ تخت سنگھ۔

ہیرامن۔ وہ کیوں نہیں آیا؟

مختار۔ ذرا مست ہے۔

ہیرامن۔ میں اس کی مستی اُتار دوں گا۔ ذرا کوئی اسے بلا لائے۔

تھوڑی دیر میں ایک بڑھا آدمی لاٹھی ٹیکتا آیا۔ اور ڈنڈوت کر کے

زمین پر بیٹھ گیا۔ نہ نذر نہ نیاز۔ اس کی یہ گستاخی دیکھ کر ہیرامن کو بخار چڑھ آیا۔ کڑک کر بولے۔ "ابھی کسی زمیندار سے پالا نہیں پڑا۔ ایک ایک کی ہیکڑی بھلا دوں گا۔"

تخت سنگھ نے ہیرامن کی طرف غور سے دیکھ کر جواب دیا۔ "میرے سامنے بیس زمیندار آئے اور چلے گئے۔ مگر کبھی کسی نے اس طرح گھڑکی نہیں دی۔"

یہ کہہ کر اس نے لاٹھی اٹھائی۔ اور اپنے گھر چلا آیا۔ بوڑھی ٹھکرائن نے پوچھا "دیکھا زمیندار کو۔ کیسے آدمی ہیں؟"

تخت سنگھ۔ اچھے آدمی ہیں۔ میں انہیں پہچان گیا۔

ٹھکرائن۔ کیا تم سے پہلے کی ملاقات ہے؟

تخت سنگھ۔ میری ان کی بیس برس کی جان پہچان ہے گڑیوں کے میلے والی بات یاد ہے نا؟"

اس دن سے تخت سنگھ پھر ہیرامن کے پاس نہ آیا۔

( )

چھ مہینے کے بعد ریوتی کو بھی مہری پور دیکھنے کا شوق ہوا۔ وہ اور اس کی بہو اور بچے سب مہری پور آئے۔ گاؤں کی سب عورتیں ان سے ملنے آئیں۔ ان میں بوڑھی ٹھکرائن بھی تھی۔ اس کی بات چیت، سلیقہ اور تمیز دیکھ کر ریوتی دنگ رہ گئی۔ جب وہ چلنے لگی، تو ریوتی نے کہا۔ "ٹھکرائن! کبھی کبھی آیا کرنا۔ تم سے ملکر طبیعت بہت خوش ہوئی۔" اس طرح دونوں عورتوں میں رفتہ رفتہ میل ہو گیا۔ یہاں تو یہ کیفیت تھی اور ہیرامن اپنے مختار عام کے مغالطے میں آکر تخت سنگھ کو بے دخل کرنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

جیٹھ کی پورنماشی آئی۔ ہیرامن کی سالگرہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ریوتی چھلنی

میں میدہ چھپان رہی تھی۔ کہ بوڑھی ٹھکرائن آئی۔ ریوتی نے مسکرا کر کہا "ٹھکرائن! ہمارے یہاں کل تمہارا نیوتا ہے۔"

ٹھکرائن۔ تمہارا نیوتا سر آنکھوں پر۔ کون سی برس گانٹھ ہے؟"

ریوتی۔ اُنیسویں۔

ٹھکرائن۔ نارائن کرے۔ ابھی ایسے ایسے سُو دِن تمہیں اُور دیکھنے نصیب ہوں۔

ریوتی۔ ٹھکرائن! تمہاری زبان مبارک ہو۔ بڑے بڑے جنتر منتر کیئے ہیں تب تم لوگوں کی دعا سے یہ دِن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ یہ ساتویں ہی سال میں تھے کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ گُڑیوں کا میلہ دیکھنے گئی تھی۔ یہ پانی میں گر پڑے۔ بارے ایک مہاتما نے ان کی جان بچائی۔ ان کی جان اُنہیں کی دی ہوئی ہے۔ بہت تلاش کرایا۔ ان کا پتہ نہ چلا۔ ہر برس گانٹھ پر ان کے نام سے سَو روپیہ نکال رکھتی ہوں۔ دو ہزار سے کچھ اوپر ہو گیا ہے۔ بچے کی نیت ہے کہ اُن کے نام سے سری پور میں ایک مندر بنوا دیں۔ سچ مانو۔ ٹھکرائن! ایک بار اُن کے درشن ہو جاتے تو زندگی سپھل ہو جاتی جی کی ہوس نکال لیتے۔

ریوتی جب خاموش ہوئی۔ تو ٹھکرائن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

دوسرے دن ایک طرف ہیرامن کی سالگرہ کا جشن تھا اور دوسری طرف تخت سنگھ کے کھیت نیلام ہو رہے تھے۔

ٹھکرائن بولی۔ "میں ریوتی رانی کے پاس جا کر دُہائی مچاتی ہوں۔"

تخت سنگھ نے جواب دیا "میرے جیتے جی نہیں۔"

(۵)

اساڑھ کا مہینہ آیا۔ میگھ راج نے اپنی جان بخش فیاضی دکھائی۔ سری پور کے کسان اپنے اپنے کھیت جوتنے چلے۔ تخت سنگھ کی حسرت ناک اور آرزومند نگاہیں ان

سے ساتھ ساتھ جاتیں، یہاں تک کہ زمین اُنہیں اپنے دامن میں چھپا لیتی۔

تخت سنگھ کے پاس ایک گائے تھی۔ وہ اب دن کے دن اُسے چرایا کرتا۔ اُس کی زندگی کا اب یہی ایک سہارا تھا۔ اُس کے اُپلے اور دودھ بیچ کر گزران کرتا۔ کبھی کبھی فاقے کرنے پڑ جاتے۔ یہ سب مصیبتیں اُس نے جھیلیں مگر اپنی بے نوائی کا رونا رونے کے لئے ایک دن بھی ہیرامن کے پاس نہ گیا۔ ہیرامن نے اُسے زیر کرنا چاہا تھا۔ مگر خود زیر ہو گیا۔ جیتنے پر بھی اُسے ہار ہوئی۔ پرانے لوہے کو اپنی کمینہ ضد کی آنچ سے نہ جھکا سکا۔

ایک دن ریوتی نے کہا۔ بیٹا! تم نے غریب کو ستایا، اچھا نہ کیا۔

ہیرامن نے تیز ہو کر جواب دیا۔ "وہ غریب نہیں ہے۔ اُس کا گھمنڈ میں توڑ دوں گا۔"

ثروت کے نشے میں متوالا زمیندار وہ چیز توڑنے کی فکر میں تھا جس کا وجود ہی نہ تھا۔ جیسے بے سمجھ بچہ اپنی پرچھائیں سے لڑنے لگتا ہے۔

(۶)

سال بھر تخت سنگھ نے جوں توں کر کے کاٹا۔ پھر برسات آئی۔ اس کا گھر چھایا نہ گیا تھا۔ کئی دن تک موسلا دھار مینہ برسا۔ تو مکان کا ایک حصہ گر پڑا۔ گائے وہیں بندھی ہوئی تھی۔ دب کر مر گئی۔ تخت سنگھ کے بھی سخت چوٹ آئی۔ اسی دن اُسے بخار آنا شروع ہوا۔ دوا دارو کون کرتا۔ روزی کا سہارا تھا۔ وہ بھی ٹوٹا۔ ظالم بے درد مصیبت نے کچل ڈالا۔ سارا مکان پانی سے بھرا ہوا۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ نہیں۔ اندھیرے میں پڑا ہوا کراہ رہا تھا کہ ریوتی اس کے گھر گئی۔ تخت سنگھ نے آنکھیں کھول دیں، اور پوچھا کون ہے؟

ٹھکرائن۔ ریوتی رانی میں۔

تخت سنگھ۔ میرے دھن بھاگ۔ مجھ پر بڑی دیا کی۔

ریوتی نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ٹھکرائن! ایشور جانتا ہے۔ میں اپنے بیٹے سے حیران ہوں۔ تمہیں جو تکلیف ہو مجھ سے کہو۔ تمہارے اوپر ایسی آفت پڑ گئی۔ اور ہم نے خبر تک نہ کی۔

یہ کہہ کر ریوتی نے روپیوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی ٹھکرائن کے سامنے رکھ دی۔ روپیوں کی جھنکار سُن کر تخت سنگھ اُٹھ بیٹھا اور بولا۔ رانی! ہم اس کے بھوکے نہیں ہیں۔ مرتے دم گنہگار نہ کرو۔"

دوسرے دن ہیرامن بھی اپنے ہواخواہوں کو لیے اُدھر سے جا نکلا۔ گرا ہوا مکان دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے دل نے کہا۔ آخر میں نے اُس کا گھمنڈ توڑ دیا۔ مکان کے اندر جا کر بولا۔ "ٹھاکر! اب کیا حال ہے؟"

ٹھاکر نے آہستہ سے کہا۔ "سب ایشور کی دیا ہے آپ کیسے بھول پڑے۔"

ہیرامن کو دوسری بار زک ملی۔ اُس کی یہ آرزو کہ تخت سنگھ میرے پاؤں کو آنکھوں سے چومے۔ اب بھی پوری نہ ہوئی۔ اسی رات کو غریب آزاد منش ایماندار بے ترس ٹھاکر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

(۷)

بوڑھی ٹھکرائن اب دنیا میں اکیلی تھی۔ کوئی اس کے غم کا شریک اور اُس کے مرنے پر آنسو بہانے والا نہ تھا۔ بے نوائی اور بے مائگی نے غم کی آنچ اور بھی تیز کر دی۔ سامان فراغت موت کے زخم کو گو بھر نہ سکیں۔ مگر مرہم کا کام ضرور کرتے ہیں۔

فکر معاش بُری بلا ہے۔ ٹھکرائن اب کھیت اور چراگاہ سے گوبر چُن لاتی اور اُپلے بنا کر بیچتی۔ اُسے لاٹھی ٹیکتے ہوئے کھیتوں کو جاتے اور گوبر کا ٹوکرا سر پر رکھ کر بوجھ سے ہانپتے ہوئے آتے دیکھنا سخت دردناک تھا۔ یہاں تک کہ ہیرامن کو بھی اس پر ترس آ گیا۔ ایک دن اُنہوں نے آٹا، دال، چاول تھالیوں میں رکھ کر اُس کے پاس بھیجا۔ ریوتی

تو دے کر گئی۔ مگر بڑھی ٹھکرائن آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ریوتی! جب تک آنکھوں سے سوجھتا ہے اور ہاتھ پاؤں چلتے ہیں مجھے اور مرنے والے کو گنہگار نہ کرو۔

اُس دن سے ہیرامن کو پھر اُس کے ساتھ عملی ہمدردی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

ایک دن ریوتی نے ٹھکرائن سے اُپلے مول لئے۔ گاؤں میں پیسے کے تیس اُپلے بکتے تھے اُس نے چاہا کہ اس سے بیس ہی اُپلے لوں۔ اُس دن سے ٹھکرائن نے اُس کے یہاں اُپلے لانا منع کر دیا۔

ایسی دیویاں دُنیا میں کتنی ہیں۔ کیا وہ اتنا نہ جانتی تھی کہ ایک راز سر بستہ زبان پر لا کر میں اپنی جانکاہ فکر کا خاتمہ کر سکتی ہوں۔ مگر وہ پھر احسان کا بدلہ نہ ہو سکے گا۔ مثل مشہور ہے۔ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ شاید اس کے دل میں کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا کہ میں نے ریوتی پر کوئی احسان کیا ہے۔

یہ وضع دار آن پر مرنے والی عورت شوہر کے مرنے کے بعد تین سال تک زندہ رہی۔ یہ زمانہ اُس نے جس تکلیف سے کاٹا اُسے یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کئی کئی دن فاقے سے گزر جاتے۔ کبھی گوبر نہ ملتا۔ کبھی کوئی اُپلے چرا لے جاتا۔ ایشور کی مرضی! کسی کا گھر بھرا ہوا ہے کھانے والے نہیں۔ کوئی یوں رو رو کر زندگی کاٹتا ہے۔

بڑھیا نے یہ سب دُکھ جھیلا۔ مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

( )

ہیرامن کی تیسویں سالگرہ آئی۔ ڈھول کی سہانی آواز سنائی دینے لگی۔ ایک طرف گھی کی پوریاں پک رہی تھیں دوسری طرف تیل کی۔ گھی کی موٹے معزز برہمنوں کے لئے تیل کی غریب فاقہ کشوں نیچوں کے لئے۔

یکایک ایک عورت نے ریوتی سے آ کر کہا۔ ٹھکرائن جانے کیسی ہوئی جاتی ہیں

تمہیں بلا رہی ہیں۔"

ریوتی نے دل میں کہا۔ "ایشور! آج تو خیریت سے کاٹنا۔ کہیں بڑھیا نہ مر رہی ہو۔"

یہ سوچ کر وہ بڑھیا کے پاس چلی گئی۔ ہیر امن نے جب دیکھا امّاں نہیں جانا چاہتیں، تو خود چلا۔ ٹھکرائن پر اسے کچھ دنوں سے رحم آنے لگا تھا۔ مگر ریوتی مکان کے دروازے تک اُسے منع کرنے آئی۔ یہ رحم دل نیک مزاج شریف ریوتی تھی۔

ہیر امن ٹھکرائن کے مکان پر پہنچا تو وہاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بڑھی عورت کا چہرہ زرد تھا۔ اور جان کنی کی حالت طاری تھی۔ ہیر امن نے زور سے کہا "ٹھکرائن! میں ہوں ہیر امن۔"

ٹھکرائن نے آنکھیں کھولیں اور اشارے سے اسے اپنا سر نزدیک لانے کو کہا، پھر رک رک کر بولی، "میرے سرہانے پٹاری میں ٹھاکر کی ہڈیاں رکھی ہوئی ہیں میرے سہاگ کا سیندور بھی وہیں ہے۔ یہ دونوں پراگ راج بھیج دینا۔"

یہ کہہ کر اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ ہیر امن نے پٹاری کھولی تو دونوں چیزیں بہ حفاظت رکھی ہوئی تھیں ایک پوٹلی میں دس روپے بھی رکھے ہوئے ملے یہ شاید جانے والے کا زاد راہ تھا۔

رات کو ٹھکرائن کی تکلیفوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔

اُسی رات کو ریوتی نے خواب دیکھا۔ ساون کا مہینہ ہے۔ گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں میں کیرت ساگر کے کنارے کھڑی ہوں۔ اتنے میں ہیر امن پانی میں پھسل پڑا۔ میں چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ دفعتہً ایک بوڑھا آدمی پانی میں کودا اور ہیر امن کو نکال لایا۔ ریوتی اُس کے پاؤں پر گر پڑی۔ اور بولی "آپ کون ہیں؟" اُس نے جواب دیا۔ "میں سری پور میں رہتا ہوں۔ میرا نام تخت سنگھ ہے۔"

مری پور اب بھی ہیرامن کے قبضے میں ہے۔ مگر اب اُس کی رونق دو چند ہو گئی ہے۔ وہاں جاؤ، تو دور سے شوالے کا سنہری کلس دکھائی دینے لگتا ہے۔ جس جگہ تخت سنگھ کا مکان تھا۔ وہاں یہ شوالہ بنا ہوا ہے اُس کے سامنے ایک پختہ کنواں اور پختہ دھرم سالہ ہے۔ مسافر یہاں ٹھہرتے ہیں۔ اور تخت سنگھ کا گن گاتے ہیں۔ یہ شوالہ اور دھرم سالہ دونوں اُس کے نام سے مشہور ہیں۔

آہ بے کس

(۱)

منشی رام سیوک بھویں چڑھائے ہوئے گھر سے نکلے، اور بولے۔ "ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے"

موت کی دست درازیوں کا سارا زمانہ شاکی ہے۔ اگر انسان کا بس چلتا تو موت کا وجود ہی نہ رہتا۔ مگر فی الواقع موت کو جتنی دعوتیں دی جاتی ہیں، اُنہیں قبول کرنے کی فرصت ہی نہیں، اگر اُسے اتنی فرصت ہوتی تو آج زمانہ ویران نظر آتا۔

منشی رام سیوک موضع چاند پور کے ایک ممتاز رئیس تھے۔ اور رئیسا کے اوصاف حمیدہ سے بہرہ ور۔ وسیلہ معاش اتنا ہی وسیع تھا، جتنی انسان کی حماقتیں اور کمزوریاں یہی اُن کی املاک اور موروثی جائیداد تھی۔ وہ روز عدالت منصفی کے احاطے میں ایک نیم کے درخت کے نیچے کاغذات کا بستہ کھولے ایک شکستہ حال چوکی پر بیٹھے نظر آتے تھے اور گو اُنہیں کسی نے کبھی اجلاس پر قانونی بحث یا مقدمے کی پیروی کرتے نہیں دیکھا، مگر عرف عام میں وہ مختیار صاحب مشہور تھے۔ طوفان آئے، پانی برسے اولے گریں، مگر مختار صاحب کبھی نام اور دل کی طرح وہیں جمے رہتے تھے۔ وہ کچہری چلتے تو دہقانیوں کا ایک جلوس سا نظر آتا، چاروں طرف سے اُن پر عقیدت و احترام کی نگاہیں پڑتیں اور اطراف میں مشہور تھا کہ اُن کی زبان پر سرسوتی ہیں۔

اسے وکالت کہو یا مختارکاری، مگر یہ صرف خاندانی اور اعزازی پیشہ تھا۔

آمدنی کی صورتیں یہاں مفقود تھیں نقرئی سکوں کا تو ذکر ہی کیا۔ کبھی کبھی مسی پیسے بھی آزادی سے آنے میں تامل کرتے تھے۔

منشی جی کی قانون دانی میں کوئی شک نہیں۔ مگر "پاس" کی منحوس قید نے انہیں مجبور و معذور کر دیا تھا۔ بہرحال جو کچھ ہو یہ پیشہ محض اعزاز کے لئے تھا ورنہ ان کی گزران کی خاص صورت قرب و جوار کی بے کسی مگر فارغ البال بیواؤں نے اور سادہ وضع مگر خوشحال بڈھوں کی خوش معاملگی تھی۔ بیوائیں اپنا روپیہ اُن کی امانت میں رکھتیں بڑھے اپنی پونجی ناخلف لڑکوں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لئے انہیں سونپتے اور روپیہ ایک دفعہ ان کی مٹھی میں جا کر پھر نکلنا نہیں جانتا تھا۔ وہ حسب ضرورت کبھی کبھی قرض بھی لیتے تھے۔ بلا قرض لئے کس کا کام چل سکتا ہے؟ صبح کو شام کے وعدے پر روپیہ لیتے۔ مگر وہ شام کبھی نہیں آتی تھی۔ خلاصہ یہ کہ منشی جی قرض لے کر دینا نہیں جانتے تھے۔ اور یہ ان کا خاندانی وصف تھا۔ اس خاندان کی یہ رسم قدیم تھی۔

یہ معاملات اکثر منشی جی کے آرام میں مخل ہوا کرتے تھے۔ قانون اور عدالت کا تو انہیں کوئی خوف نہ تھا۔ اس میدان میں ان کا سامنا کرنا پانی میں رہ کر مگر سے بیر کرنا تھا۔ لیکن جب بعض شریر النفس لوگ خواہ مخواہ اُن سے بدظن ہو جاتے ان کی خوش نیتی پر شک کرتے اور اُن کے در پردہ علانیہ بدزبانیوں پر اُتر آتے تو منشی جی کو بڑا صدمہ ہوتا۔ اس قسم کے ناگوار واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ ہر جگہ ایسے تنگ ظرف حضرات موجود ہوتے ہیں جنہیں دوسروں کی تحقیر میں مزہ آتا ہے۔ انہیں بدخواہوں کی شہ پا کر بعض اوقات چھوٹے چھوٹے آدمی منشی جی کے منہ میں آ جاتے تھے ورنہ ایک کنجڑن کا اتنا حوصلہ نہ ہو سکتا تھا کہ اُن کے گھر میں جا کر انہیں کی شان میں نازیبا کلمات منہ سے نکالے۔ منشی جی اس کے پرانے گاہک تھے۔ برسوں تک اس سے سبزی

لی تھی۔ اگر دام نہ دیئے تو کنجڑن کو صبر کرنا چاہئیے تھا۔ جلد یا دیر میں مل ہی جاتے مگر وہ بدزبان عورت دو سال ہی میں گھبرا گئی اور چند آنے پیسوں کے لئے ایک معزز آدمی کی آبرو ریزی کی۔ ایسی حالت میں اگر انہوں نے جھنجھلا کر موت کو دعوت دی۔ تو اُن کی کوئی خطا نہیں۔

(۳)

اسی موضع میں مونگا نام ایک بیوہ برہمنی تھی۔ اس کا شوہر برما کی کالی پلٹن میں حوالدار تھا اور وہیں مارا گیا تھا۔ اُس کے حسنِ خدمات کے صلے میں مونگا کو پانسو روپے ملے تھے۔ بیوہ عورت تھی۔ نازک زمانہ۔ اُس نے یہ روپے منشی رام سیوک کو سونپ دیئے اور ہر ماہ اس میں سے تھوڑا تھوڑا لے کر گذر کرتی رہی۔ منشی جی نے یہ فرض کئی سال تک نیک نیتی کے ساتھ پورا کیا۔ مگر جب پیرانہ سالی کے باوجود مونگا نے مرنے میں تامل کیا۔ اور منشی جی کو اندیشہ ہوا۔ کہ شاید وہ توشۂ آخرت کیلئے نصف رقم بھی چھوڑنا نہیں چاہتی۔ تو ایک روز اُنہوں نے کہا۔ "مونگا! تمہیں مرنا ہے یا نہیں۔ صاف صاف کہہ دو تاکہ میں اپنے مرنے کی فکر کروں۔"

اُس دن مونگا کی آنکھیں کھلیں۔ خواب سے بیدار ہوئی۔ بولی۔ میرا حساب کر دو۔ فردِ حساب تیار تھی۔ امانت میں اب ایک کوڑی بھی باقی نہ تھی۔ اس سخت گیری سے جو بڑھاپے کے ساتھ مخصوص ہے اُس نے منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا۔ میرے ڈھائی سو روپے تم نے دبائے ہیں۔ میں ایک ایک کوڑی لے لوں گی۔

مگر بے کسوں کا غصہ پٹاخے کی آواز ہے جس سے بچے ڈر جاتے ہیں اور اثر کچھ نہیں ہوتا۔ عدالت میں اُس کا کچھ زور نہ تھا۔ نہ کوئی لکھا پڑھی نہ حساب کتاب البتہ پنچایت سے کچھ اُمید تھی۔ اور پنچایت بیٹھی۔ گاؤں کے آدمی جمع ہوئے۔ منشی جی نیت اور معاملے کے صاف تھے۔ اُنہیں پنچوں کا کیا خوف! سبھا میں کھڑے ہو کر

پنچوں سے کہا "بھائیو! آپ سب لوگ ایماندار اور شریف ہیں۔ میں آپ سب صاحبوں کا خاکپا پروردہ ہوں۔ آپ صاحبوں کی عنایات و الطاف سے فیض و کرم سے محبت و شفقت سے میرا ایک ایک رونگٹا گراں بار ہے۔ کیا آپ سب نیک اور شریف حضرات خیال کرتے ہیں کہ میں نے ایک بے کس اور بیوہ عورت کے روپے ہضم کر لیے"؟

پنچوں نے یک زبان ہو کر کہا "نہیں آپ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔

اگر آپ سب نیک اور شریف صاحبوں کا خیال ہے کہ میں نے روپے دبا لیے تو میرے لئے ڈوب مرنے کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں۔ میں امیر نہیں ہوں۔ نہ مجھے فیاضی کا دعوےٰ ہے۔ مگر اپنے قلم کی بدولت۔ آپ صاحبوں کی عنایت کی بدولت کسی کا محتاج نہیں۔ کیا میں ایسا کمینہ ہو جاؤں گا۔ کہ ایک بے کس عورت کے روپے ہضم کر لوں۔

پنچوں نے یک زبان ہو کر پھر کہا "نہیں نہیں آپ سے ایسا نہیں ہو سکتا"۔

پگڑی کی ٹکریں ہے۔ پنچوں نے منشی جی کو رہا کر دیا۔ پنچایت ختم ہو گئی اور مونگا کو اب کسی خیال سے تسکین ہو سکتی تھی۔ تو وہ یہ تھا کہ یہاں نہ دیا نہ سہی وہاں کہاں جائے گا۔

(۳)

مونگا کا اب کوئی غمخوار و مددگار نہ تھا۔ ناداری سے جو کچھ تکلیفیں ہو سکتی ہیں وہ سب اُسے جھیلنی پڑیں۔ اس کے قویٰ درست تھے۔ وہ چاہتی تو محنت کر سکتی تھی مگر جس دن پنچایت ختم ہوئی۔ اُسی دن سے اُس نے کام کرنے کی قسم کھا لی۔ اب اُسے رات دن روپیوں کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اُسے صرف ایک کام تھا اور وہ منشی رام سیوک کا ذکر خیر تھا۔ اپنے جھونپڑے کے دروازے پر بیٹھی وہ رات دن اُنہیں صدق دل سے دعائیں دیا کرتی۔ اور اکثر دعاؤں میں ایسے شاعرانہ انداز تھے۔ ایسے رنگین استعارے استعمال کرتی کہ سُن کر حیرت ہوتی تھی۔

رفتہ رفتہ مونگا کے حواس پر وحشت کا غلبہ ہوا۔ ننگے سر، ننگے بدن ہاتھ میں ایک کلہاڑا لئے وہ سنسان جگہوں میں جا بیٹھتی۔ جھونپڑے کے بجائے اب وہ مرگھٹ پر ندی کے کنارے، کھنڈروں میں گھومتی دکھائی دیتی۔ بکھری ہوئی پریشان لٹیں، سُرخ آنکھیں وحشت ناک چہرہ، سوکھے ہوئے ہاتھ پاؤں، اس کی یہ ہیئت کذائی دیکھ کر لوگ ڈر جاتے تھے، اب اُسے کوئی مزاح کے طور پر نہ چھیڑتا۔ اگر وہ کبھی گاؤں میں نکل آتی تو عورتیں گھروں کے کواڑ بند کر لیتیں، مرد کترا کر نکل جاتے، اور بچے چیخ چیخ کر بھاگ جاتے اگر کوئی لڑکا نہ بھاگتا تو یہ منشی رام سیوک کا صاحبزادہ رام غلام تھا باپ میں جو کچھ کور کسر رہ گئی تھی۔ وہ اُن کی ذات میں پوری ہو گئی تھی۔ لڑکوں کا اس کے مارے ناک میں دم تھا۔ گاؤں کے کانے اور لنگڑے آدمی اس کی صورت سے بیزار تھے اور گالیاں کھانے میں تو شاید سسرال میں آنے والے داماد کو بھی اتنا مزہ نہ آتا ہو۔ وہ مونگا کے پیچھے تالیاں بجاتا۔ کتوں کو ساتھ لئے اس وقت تک رہتا۔ جب تک وہ غریب تنگ آکر نکل نہ جاتی۔ روپیہ پیسہ ہوش و حواس کھو کر اُسے پگلی کا لقب ملا۔ اور وہ سچ مچ پگلی تھی۔ اکیلے بیٹھے ہوئے آپ ہی آپ گھنٹوں باتیں کیا کرتی جس میں رام سیوک کے گوشت، ہڈی، پوست، آنکھیں، کلیجہ وغیرہ کو کھانے، مسلنے، نوچنے، کھسوٹنے کی پُرجوش خواہش کا اظہار ہوتا تھا۔ اور جب یہ خواہش بے تابی کی حد تک پہنچ جاتی، تو وہ رام سیوک کے مکان کی طرف منہ کر کے بلند اور ڈراؤنی آواز سے ہانک لگاتی، "تیرا لہو پیوں گی"۔

اکثر راتوں کے سناٹے میں یہ گرجتی ہوئی آواز سُن کر عورتیں چونک پڑتی تھیں مگر اس آواز سے زیادہ ہیبت ناک اس کا قہقہہ تھا۔ منشی جی کے خیال لہو پینے کی خوشی میں وہ زور سے ہنسا کرتی تھی۔ اس قہقہے سے ایسی شیطانی مسرت ایسی سفاکی۔ ایسی خونخواری ٹپکتی تھی۔ کہ رات کو سُن کر لوگوں کے خون سرد ہو جاتے

معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا سینکڑوں اُلّو ایک ساتھ ہنس رہے ہیں۔

منشی رام سیوک بڑے حوصلہ و جگر کے آدمی تھے۔ نہ انہیں دیوانی کا خوف تھا نہ فوجداری کا۔ مگر مونگا کے ان خوفناک نعروں کو سُن کر وہ بھی سہم جاتے تھے ہمیں انسانی انصاف کا چاہے خوف نہ ہو۔ اور بسا اوقات نہیں ہوتا۔ مگر خدائی انصاف کا خوف ہر انسان کے دل میں خلقی طور پر موجود ہوتا ہے اور کبھی کبھی ایسے مبارک اتفاقات پیش آجاتے ہیں۔ جب نفس کے نیچے دبا ہوا یہ خیال اوپر آجاتا ہے۔ مونگا کی دہشت ناک شب گردی رام سیوک کیلئے یہی مبارک اتفاق تھی اور ان سے زیادہ ان کی بیوی کے لئے جو ایک فرمادار عورت کی طرح ہر معاملے میں نہ صرف اپنے شوہر کا ساتھ دیتی تھیں۔ بلکہ آئے دن کے مباحثوں اور مناظروں میں زیادہ نمایاں حصہ لیا کرتی تھیں۔ فرقہ اناث میں ان کے زور بیان کا عام شہرہ تھا۔ زبانی معاملات ہمیشہ وہی طے کیا کرتی تھیں۔ اُن لوگوں کو بھول تھی۔ جو کہتے تھے کہ منشی جی کی دکان پر سرسوتی ہے۔ یہ فیض اُن کی بیوی کو حاصل تھا۔ زور بیان میں اُنہیں وہی ملکہ تھا جو منشی جی کو زور تحریر میں۔ اور یہ دونوں پاک روحیں اکثر عالم مجبوری میں مشورہ کرتیں کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

(۴)

آدھی رات کا وقت تھا۔ منشی جی حسب معمول غم غلط کرنے کے لئے آب آتشیں کے دو چار گھونٹ پی کر سو گئے تھے۔ یکایک مونگا نے اُن کے دروازے پر آکر زور سے ہانک لگائی۔ "تیرا لہو پیوں گی" اور خوب کھلکھلا کر ہنسی۔

منشی جی یہ خوفناک قہقہہ سُن کر چونک پڑے۔ خوف سے پاؤں تھرتھرا رہے تھے اور کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ دل پر بہت جبر کرکے اُنہوں نے دروازہ کھولا۔ اور جا کر ناگن کو جگایا۔

ناگن نے جھلا کر کہا، "کیا ہے؟ کیا کہتے ہو؟"

منشی جی نے آواز دبا کر کہا: "وہ دروازے پر آ کر کھڑی ہے۔"

ناگن اُٹھ بیٹھی۔ "کیا کہتی ہے؟"

"تمہارا سر۔"

"کیا دروازے پر آ گئی؟"

"ہاں آواز نہیں سنتی ہو؟"

ناگن مونگا سے نہیں مگر اس کی وحشت سے ڈرتی تھی۔ تاہم اُسے یقین تھا کہ میں تقریر میں اُسے ضرور نیچا دکھا سکتی ہوں۔ سنبھل کر بولی۔ "تو میں اس سے دو باتیں کر لوں۔" مگر منشی جی نے منع کیا۔

دونوں آدمی دہلیز پر گئے اور دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ مونگا کی دُھندلی صورت زمین پر پڑی تھی۔ اور اُس کی سانس تیزی سے چلتی سنائی دیتی تھی۔ رام سیوک کے خون اور گوشت کی آرزو میں وہ اپنا گوشت اور خون خشک کر چکی تھی۔ ایک بچہ بھی اُسے گرا سکتا تھا۔ مگر اُس سے سارا گاؤں ڈرتا تھا۔ ہم زندہ انسانوں سے نہیں ڈرتے ہیں، مُردوں سے ڈرتے ہیں۔

اگرچہ اندر سے دروازہ بند تھا۔ مگر منشی جی اور ناگن نے بیٹھ کر رات کاٹی۔ مونگا اندر نہیں آ سکتی تھی، مگر اس کی آواز کو کون روک سکتا تھا۔ مونگا سے زیادہ ڈراؤنی اس کی آواز تھی۔

صبح کے وقت منشی جی باہر نکلے، اور مونگا سے بولے "یہاں کیوں پڑی ہوئی ہے؟"

مونگا بولی "تیرا خون پیوں گی۔"

ناگن نے بل کھا کر کہا "تیرا منہ جھلس دوں گی۔"

مگر ناگن کے زہر نے مونگا پر کچھ اثر نہ کیا۔ اُس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ناگن

کھسیانی سی ہو گئی۔ قہقہے کے مقابلے میں زبان بند ہو جاتی ہے۔ منشی جی پھر بولے "یہاں سے اُٹھ جا۔"

"نہ اُٹھوں گی۔"

"کب تک پڑی رہے گی؟"

"تیرا لہو پی کے جاؤں گی۔"

منشی جی کی پر زور تقریر کا یہاں کچھ زور نہ چلا۔ اور ناگن کی آتشیں تقریر یہاں ہرز ہو گئی۔ دونوں گھر میں جا کر مشورہ کرنے لگے۔ یہ بلا کیونکر ٹلے گی۔ اس آفت سے کیونکر نجات ہوگی۔

دیوی آتی ہیں۔ تو بکرے کا خون پی کر چلی جاتی ہیں۔ مگر یہ ڈائن انسان کا خون پینے آئی ہے۔ وہ خون جس کے اگر قلم بنانے میں چند قطرے نکل پڑتے تھے تو ہفتوں اور مہینوں سارے کنبے کو افسوس رہتا تھا۔ اور یہ واقعہ گاؤں میں ہر گز گفتگو بن جاتا تھا کیا یہ خون پی کر بونگا کا سوکھا ہوا جسم ہرا ہو جائے گا۔

گاؤں میں خبر پھیل گئی بونگا منشی کے دروازے پر دھرنا دیئے بیٹھی ہے منشی جی کی رسوائی میں گاؤں والوں کو خواہ مخواہ لطف آتا تھا۔ سینکڑوں آدمی جمع ہو گئے۔ اس دروازے پر وقتاً فوقتاً میلے لگتے رہتے تھے مگر وہ پُر شور اور پُر خروش میلے ہوتے تھے۔ آج کا مجمع خاموش اور متین تھا۔ یہ رکاؤ اور خاص کر رام غلام کو مرغوب نہ تھا۔ بونگا پر اُسے غصہ آرہا تھا۔ کہ اس کا بس چلتا تو ضرور کنوئیں میں دھکیل دیتا۔ کہتا۔ چل کنوئیں پر تجھے پانی پلا لاؤں۔ جب وہ کنوئیں پر پہنچتی تو پیچھے سے ایسا دھکا دیتا کہ وہ اڑا ادھم کنوئیں میں جا گرتی اور وہاں سیٹے ہوئے کتے کی طرح چیخنے لگتی۔ دھماکے کی آواز آتی اس خیال سے رام غلام کے سینے میں گدگدی سی ہونے لگی۔ اور وہ مشکل سے اپنی ہنسی کو روک سکا۔ کیسے مزے کی بات ہوتی۔ مگر یہ چڑیل یہاں سے اُٹھتی ہی نہیں۔ کیا کروں۔

منشی جی کے گھر میں اسخوانی نسل کی ایک گائے تھی۔ کھلی دانہ اور بھوسا تو اُسے بڑی کثرت سے کھلایا جاتا تھا۔ مگر وہ سب اُس کی ہڈیوں میں پیوست ہو جاتا تھا۔ اور اس کا ڈھانچا روز بروز زیادہ نمایاں ہوتا جاتا تھا۔ رام غلام نے ایک ہانڈی میں اس کا گوبر گھولا۔ اور وہ ساری غلاظت مونگا پر لاکر انڈیل دی۔ اور پھر اس کے چھینٹے تماشائیوں پر ڈال دیئے۔ غریب مونگا لت پت ہو گئی اور اُٹھ کر رام غلام کی طرف دوڑی۔ ہمدرد تماشائیوں کے کپڑے خراب ہو گئے۔ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ منشی رام سیوک کا دروازہ ہے۔ یہاں اسی طرح کی مدارات کی جاتی ہے۔ جلد بھاگ چلو۔ ورنہ اب کے کوئی اس سے اچھی خاطر کی جائے گی۔ ادھر مطلع صاف ہوا۔ ادھر رام غلام گھر میں جاکر خوب ہنسا۔ اور خوب تالیاں بجائیں۔ منشی جی نے اس مجمع ناجائز کو ایسی آسانی اور خوبصورتی سے ہٹا دینے کی تدبیر پر اپنے سعادتمند لڑکے کی پیٹھ ٹھونکی مگر سب بھلگے۔ مونگا جوں کی توں بیٹھی رہی۔

دوپہر ہوئی۔ مونگا نے کھانا نہیں کھایا۔ گاؤں کے چودھری نے خوشامدیں کیں حتےٰ کہ منشی جی نے ہاتھ تک جوڑے۔ مگر دیوی راضی نہ ہوئیں۔ آخر منشی جی اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ اُن کا قول تھا۔ روٹھنے والوں کو بھوک آپ منا لیا کرتی ہے۔ مونگا نے یہ رات بھی بے آب و دانہ کاٹ دی۔ اور لالہ صاحب اور ان کی زوجہ غمگسار نے آج پھر جاگ جاگ کر صبح کی۔ آج مونگا کے نعرے اور قہقہے بہت کم سنائی دیئے۔ گھر والوں نے سمجھا۔ بلا ٹل گئی۔ سویرا ہوتے ہی جو دروازے پر آکر دیکھا تو وہ بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اُن کی جان نکل چکی تھی۔ وہ اس دروازے پر جان ہی دینے آئی تھی جس نے اُس کی جمع جتھا لی تھی۔ اسی کو جان بھی سونپ دی۔ اپنی مٹی تک اس کی نذر کر دی۔

یہ ذکر کہ گاؤں میں کیسی ہل چل مچی اور منشی رام سیوک کیسے ذلیل ہوئے فضول

ہے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک ایسے غیر معمولی واقعہ پر جتنی ہلچل مچ سکتی ہے اُس سے کچھ زیادہ ہی مچی۔ اور منشی جی کی جتنی ذلت ہونی چاہیئے تھی۔ اُس سے ذرا بھی کم نہ ہوئی۔ گاؤں کا چمار بھی ان کے ہاتھ کا پانی پینے کا یا انہیں چھونے کا روادار نہ تھا۔ اگر کسی کے گھر میں کوئی گائے بندھی بندھی مر جاتی ہے۔ تو وہ شخص مہینوں در بدر بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ نہ حجام اس کی حجامت بنائے نہ کہار اس کا پانی بھرے نہ کوئی اُسے چھوئے۔ یہ گئو ہتیا کا پرائشچت ہے برہم ہتیا کی سزائیں اس سے بدرجہا سخت اور ذلتیں بدرجہا زیادہ ہیں۔ مونگا یہ جانتی تھی۔ اور اسی لئے اس دروازے پر آکر مری تھی کہ میں جو زندہ رہ کر کچھ نہیں کر سکتی۔ مر کر بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ گوبر کا اُپلا جب جل کر راکھ ہو جاتا ہے تو سادھو سنت لوگ اُسے ماتھے پر چڑھاتے ہیں۔ پتھر کا ڈھیلا آگ میں جل کر آگ سے بھی زیادہ اور قاتل ہو جاتا ہے۔

(۵)

منشی رام سیوک قانون دان آدمی تھے۔ قانون نے اُن پر کوئی جرم نہیں لگایا تھا۔ مونگا کسی قانونی دفعہ کے منشا کے مطابق نہیں مری تھی۔ تعزیرات ہند میں اس کی نظیر نہ ملتی تھی۔ اس لئے جو لوگ ان سے پرائشچت کرانا چاہتے تھے اُن کی سخت غلطی تھی۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ کہار پانی نہ بھرے گا۔ وہ خود اپنا پانی آپ بھر سکتے تھے۔ اپنا کام کرنے میں کوئی شرم نہیں۔ بلا سے حجام بال نہ بنائے گا۔ حجامت کی ضرورت ہی کیا ہے داڑھی بہت خوبصورت چیز ہے۔ داڑھی مرد کا زیور اور سنگار ہے اور پھر جو بالوں سے ایسی ہی نفرت ہوگی۔ تو ایک ایک آنے میں تو استرے آتے ہیں۔ دھوبی کپڑے نہ دھوئے گا اس کی بھی کچھ پروا نہیں۔ صابن کوڑیوں کے مول آتا ہے۔ ایک بٹی میں درجنوں کپڑے ایسے صاف ہو جائیں جیسے بگلے کا پر۔ دھوبی کیا کھا کے ایسے صاف کپڑے دھوئے گا۔ کم

بچت تھی۔ پھر ٹیپ ٹاپ کر کپڑوں کا ستا لگا لیتا ہے۔ خود پہنے دوسروں کو پہنائے۔ کبھی کبھی جو پٹھا رہے، ریہہ میں بھگوئے۔ کپڑوں کی دُرگت کر ڈالتا ہے۔ جبھی تو کُرتے دو تین سال سے زیادہ نہیں چلتے۔ ورنہ دادا ہر پانچویں سال دو اچکن اور دو کُرتے بنوایا کرتے تھے۔ منشی رام سیوک اور اُن کی زوجہ غمگسار نے دن بھر یوں ہی اپنے دلوں کو سمجھا کر ٹالا۔ مگر شام ہوتے ہی اُن کی قوت استدلال نے جواب دے دیا۔ ان کے دلوں پر ایک بے معنی بے بنیاد مہمل خوف کا غلبہ ہوا۔ اور رات کے ساتھ ساتھ خوف کا یہ احساس مشتعل ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ناگن کھانا پکانے کے لئے رسوئی کے کمرے میں تنہا نہ جا سکی۔ باہر کا دروازہ غلطی سے کھلا رہ گیا تھا۔ مگر کسی ایک کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ جا کر دروازہ بند کر آئے۔ آخر ناگن نے ہاتھ میں چراغ لیا۔ منشی جی نے کلہاڑا اور رام غلام نے گنڈاسا۔ اس قطع سے تینوں آدمی چونکتے، ہچکچاتے دروازے تک آئے۔ یہاں منشی جی نے بڑی جرأت سے کام لیا۔ اُنہوں نے بے دھڑک دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کی اور کانپتی ہوئی مگر بلند آواز میں ناگن سے بولے۔ "تم ناحق ڈرتی ہو۔ کیا یہاں وہ بیٹھی ہے۔" مگر وفادار ناگن نے انہیں اندر کھینچ لیا اور خفا ہو کر بولیں۔ "تمہارا یہی لڑکپن تو اچھا نہیں۔" یہ مہم فتح کر کے تینوں آدمی رسوئی کے کمرے میں آئے اور کھانا پکانا شروع ہوا۔ مگر مونگا ان کی آنکھوں میں گھسی ہوئی تھی۔ اپنی پرچھائیں کو دیکھ کر مونگا کا گمان ہوتا تھا۔ اندھیرے کونوں میں مونگا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہی ہڈیوں کا ڈھانچہ وہی جھنڈولے بال وہی وحشت وہی ڈراؤنی آنکھیں مونگا کا نکھ سکھ دکھائی دیتا تھا۔ اسی کمرے میں آٹا دال کے کئی مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ وہیں کچھ پرانے چیتھڑے بھی پڑے تھے۔ ایک چوہے کو بھوک نے بے چین کیا۔ مٹکوں نے کبھی اناج کی صورت نہیں دیکھی۔ مگر سارے گاؤں میں مشہور تھا کہ اس گھر کے چوہے غضب کے ڈاکو ہیں۔ وہ ان دانوں کی تلاش میں جو مٹکوں سے کبھی نہیں گرے تھے۔ رینگتا اس چیتھڑے کے نیچے سے نکلا۔ کپڑے میں حرکت

ہوئی۔ پھیلے ہوئے چیتھڑے مونگا کی پتلی ٹانگیں بن گئے۔ ناگن دیکھتے ہی جھجکی اور چیخ اٹھی۔ منشی جی بدحواس ہو کر دروازے کی طرف لپکے۔ رام غلام دوڑ کر ان کی ٹانگ سے لپٹ گیا۔ بارے چوہا باہر نکل آیا۔ اسے دیکھ کر ان لوگوں کے ہوش بجا ہوئے۔ اب منشی جی مردانہ وار قدم اٹھائے مٹکے کی طرف چلے۔ ناگن نے طنز سے کہا "رہنے دو۔ دیکھ لی تمہاری مردی!" منشی جی وفادار ناگن کی اس ناقدری پر بہت بگڑے۔ "کیا تم سمجھتی ہو، میں ڈر گیا۔ بھلا ڈر کی کیا بات تھی۔ مونگا مر گئی۔ اب کیا وہ بیٹھی ہے۔ کل میں دروازے کے باہر نکل گیا تھا۔ تم روکتی ہی رہیں اور میں نہ مانا۔"

منشی جی کی اس زبردست دلیل نے ناگن کو لاجواب کر دیا۔ کل دروازے کے باہر نکل جانا یا نکلنے کی کوشش کرنا معمولی کام نہ تھا۔ جس کی جرأت کا ایسا ثبوت مل چکا ہو اسے بزدل کون کہہ سکتا ہے۔ یہ ناگن کی ہٹ دھرمی تھی۔

کھانا کھا کر تینوں آدمی سونے کے مکان میں آئے۔ لیکن مونگا نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ باتیں کرتے تھے۔ دل کو بہلاتے تھے۔ ناگن نے راجہ ہر دول اور رانی سارندھا کی کہانیاں کہیں۔ منشی جی نے چند مقامات کی تفصیل بیان کی مگر تدبیروں کے باوجود مونگا کی تصویر آنکھوں کے سامنے سے دور نہ ہوتی تھی۔ ذرا کواڑ کھڑکا اور دونوں چونک پڑے۔ پتوں میں سنسناہٹ ہوئی اور دونوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور رہ رہ کر ایک مدھم آواز نہ جانے کہاں سے شاید آسمان کے اوپر، یا زمین کے نیچے سے ان کے کانوں میں آتی تھی۔ "میں تیرا خون پیوں گی۔"

(۴)

آدھی رات کو ناگن عالم غنودگی سے چونکی۔ وہ غریب ان دنوں حاملہ تھی۔ سرخ آتشیں آنکھیں، تیز نکیلے دانتوں والی مونگا اس کے سینے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ناگن چیخ مار کر اٹھی۔ ایک عالم وحشت میں بھاگ کر آنگن میں آئی۔ اور فرط ہراس سے زمین پر گر پڑی

سارا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ منشی جی نے بھی اس کی چیخ سُنی مگر خوف کے مارے آنکھیں نہ کھولیں، اندھوں کی طرح دروازہ ٹٹولتے رہے۔ بہت دیر کے بعد انہیں دروازہ ملا۔ آنگن میں آئے، ناگن زمین پر پڑی ہاتھ پاؤں پٹک رہی تھی۔ اُسے اُٹھا کر اندر لائے مگر رات بھر اُس نے آنکھیں نہ کھولیں، صبح کو گھڑیاں بکنے لگیں، تھوڑی دیر میں بخار ہو گیا جسم سُرخ توا ہو گیا، شام ہوتے ہوتے سرسام ہُوا، اور آدھی رات کے وقت جب ہر طرف سنّاٹا چھایا ہُوا تھا، ناگن اس دُنیا سے چل بسی۔ مونگا کے خوف نے اس کی جان لے لی جیتے تک مونگا زندہ رہی، وہ ناگن کی پھنکار سے ہمیشہ ڈرتی رہی، عالم جنون میں بھی اُس نے ناگن کا سامنا کبھی نہیں کیا۔ مگر اپنی جان دے کر آج اُس نے ناگن کی جان لی۔ خوف میں بڑی طاقت ہے۔ اِنسان ہوا میں ایک گرہ نہیں لگا سکتا۔ خوف نے ہوا میں ایک دنیا بنا ڈالی ہے۔

رات گذر گئی، دن چڑھتا آتا تھا۔ منشی جی گھر گھر گھومے مگر کوئی نہ نکلا۔ بتیالے کے دروازے پر کون جائے، بتیالے کی لاش کون اُٹھائے۔ منشی جی کا رعب ان کے خونخوار قلم کا خوف اور قانونی مصلحت آمیزیاں۔ کچھ بھی کارگر نہ ہُوا۔ چاروں طرف سے ہار کر منشی جی پھر اپنے خانۂ تنہائی میں آئے۔ مگر اندر قدم نہیں رکھا جاتا تھا نہ باہر کھڑے رہ سکتے تھے۔ باہر مونگا اندر ناگن، دل پر بہت جبر کر کے ہنومان چالیسہ کا ورد کرتے ہوئے وہ مکان میں گئے۔ اس وقت ان کے دل پر جو گذر رہی تھی، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ گھر میں لاش پڑی ہوئی۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے، دوسری شادی تو ہو سکتی تھی۔ ابھی اسی پچاگن میں تو پچاسواں سال ہے، مگر ایسی زبان دراز۔ خوش بیان عورت کہاں ملیگی افسوس کہ اب تقاضا کرنے والوں سے بحث کون کرے گا۔ کون انہیں لاجواب کرے گا لین دین کا حساب کون اتنی خوبی سے کرے گا۔ کس کی آواز بلند تیر کی طرح ان تقاضا کے سینوں میں چبھے گی۔ اس نقصان کی تلافی اب ممکن نہیں۔

دوسرے دن منشی جی لاش کو ایک ٹھیلے پر لاد کر گنگا جی کی طرف چلے۔ عزاداروں کی تعداد بہت مختصر تھی۔ ایک منشی جی دوسرے رام غلام۔ اس ہیئت کذائی سے موہنگا کی لاش بھی نہیں اٹھی تھی۔ مگر موہنگا نے ناگوں کی جان لے کر بھی منشی جی کا پنڈ نہ چھوڑا۔ لیلیٰ کی تصویر مجنوں کے پردۂ دماغ پر ایسے شوخ رنگوں سے شاید ہی کھینچی ہو۔ آٹھوں پہر ان کا خیال اسی طرف لگا رہتا ہے۔ اگر دل بہلاؤ کا کوئی ذریعہ ہوتا تو شاید انہیں اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ مگر گاؤں کا کوئی ذی روح ان کے دروازے کی طرف جھانکتا بھی نہ تھا۔ غریب اپنے ہاتھوں پانی بھرتے۔ خود برتن دھوتے۔ غم اور غصہ۔ فکر اور خوف اتنے دشمنوں کے مقابلے میں ایک دماغ کب تک ٹھہر سکتا تھا۔ خصوصاً وہ دماغ جو روزانہ قانونی مباحثوں میں صرف تیز ہو جاتا ہو۔

کنج تنہائی کے دس بارہ دن جوں توں کر کے کٹے۔ بارھویں دن منشی جی نے کپڑے پہنے اور بستہ لئے ہوئے کچہری چلے۔ آج ان کا چہرہ کچھ روشن تھا۔ جاتے ہی میرے موکل دوڑ کر مجھے گھیر لیں گے۔ ماتم پرسی کریں گے۔ میں آنسوؤں کے دو چار قطرے گرا دوں گا۔ پھر بیعناموں۔ رہن ناموں۔ صلحناموں وغیرہ کا ایک طوفان بلکہ سیلاب سامنے آ جائے گا۔ یہ خیال انہیں خوش کئے ہوئے تھا۔ مٹھیاں گرم ہوں گی۔ روپے کی صورت نظر آئے گی۔ شام کو ذرا شغل ہو جائے گا۔ اس کے چھوٹنے سے تو جی اور اچاٹ تھا۔ انہیں خیالوں میں محو منشی جی کچہری پہنچے۔

مگر وہاں رہن ناموں کے طوفان۔ بیع ناموں کے سیلاب اور موکلوں کی چہل پہل کے بدلے مایوسی کا ایک کف دست حوصلہ شکن ریگستان نظر آیا۔ بستہ کھولے گھنٹوں بیٹھے رہے۔ مگر کوئی مخاطب نہ ہوا۔ کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ مزاج کیسا ہے۔ نئے موکل تو خیر بڑے بڑے پرانے موکل جن کا منشی جی کے ساتھ پشتوں سے تعلق چلا آتا تھا۔ آج ان سے گریز کرنے لگے۔ وہ نالائق اور بدتمیز رمضان خاں کیسا بے شعور آدمی تھا۔ املا تک

غلط لکھنا، منشی جی اس کا خوب مضحکہ اُڑاتے تھے۔ مگر آج سینکڑوں آدمی اُسے گھیرے ہوئے تھے۔ سیلے بمبز گودیوں میں گینچا بنا ہوا تھا۔ واہ ری قسمت! موکل کم بخت یوں منہ پھیرے چلے جاتے ہیں گویا کبھی کی جان پہچان ہی نہیں۔ دن بھر موکلوں کا انتظار کرنے کے بعد شام کو اپنے گھر کی طرف چلے، پژمردہ، مایوس، متفکر اور جوں جوں گھر نزدیک آتا تھا، مونگا کی تصویر سامنے آتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب شام کو گھر پہنچ کر دروازہ کھولا اور دو کتے جنھیں رام غلام نے شرارتاً بند کر رکھا تھا، جھپٹ کر باہر نکلے تو منشی جی کے اوسان ختم ہو گئے۔ ایک چیخ مار کر زمین پر گر پڑے۔

انسان کا دل اور دماغ خوف سے جس قدر متاثر ہوتا ہے، اتنا کسی اور طاقت سے نہیں۔ محبت، افسوس، مایوسی، جدائی، نقصان یہ سب دل پر کچھ نہ کچھ اثر کرتے ہیں۔ مگر یہ اثرات ہلکے ہلکے جھونکے ہیں اور خوف کا اثر طوفان ہے۔ منشی رام سیوک پر بعد کو کیا گزری، یہ معلوم نہیں۔ کئی دن تک لوگوں نے انھیں روزانہ کچہری جاتے اور وہاں سے افسردہ و پژمردہ لوٹتے دیکھا۔ کچہری جانا ان کا فرض تھا۔ اور گو وہاں موکلوں کا قحط تھا، مگر تقاضے والوں سے گلا چھڑانے اور انھیں اطمینان دلانے کے لئے اب یہی ایک لٹکا رہ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کئی ماہ تک نظر نہ آئے۔ بدری ناتھ چلے گئے۔

ایک دن گاؤں میں ایک سادھو آیا۔ بھبوت رمائے، لمبی لمبی جٹائیں، ہاتھ میں کمنڈل اس کی صورت منشی رام سیوک سے بہت ملتی تھی۔ آواز اور رفتار میں بھی زیادہ فرق نہ تھا۔ وہ ایک بڑ کے نیچے دھونی رمائے بیٹھا رہا۔ اسی رات کو منشی رام سیوک کے گھر سے دھواں اُٹھا۔ پھر شعلے نظر آئے اور آگ بھڑک اُٹھی۔ ناگن کی آتش تقریر بھی کبھی اس قدر نہ بھڑکی تھی۔ گاؤں کے سینکڑوں آدمی دوڑے، مگر آگ بجھانے کے لئے نہیں، تماشا دیکھنے کے لئے۔ ایک بیکس کی آہ میں کتنا اثر ہے!

صاحبزادہ رام غلام منشی جی کے غائب ہو جانے پر اپنے ماموں کے یہاں چلے گئے

اور وہاں کچھ دنوں رہے۔ مگر وہاں کی نوتش فعلیاں نہ پسند کی گئیں۔ ایک روز آپ نے کسی کے کھیت میں بوٹے نوچے، اُس نے دو چار دھول لگائے، اس پر آپ اس قدر برہم ہوئے کہ جب اس کے چنے کھلیان میں آئے، تو جا کر آگ لگا دی، ایک کے پیچھے سارا کھلیان جل کر راکھ ہو گیا۔ ہزاروں روپے کا نقصان ہوا، پولیس نے تحقیقات کی حضرت گرفتار ہوئے۔ اپنے قصور کا اقبال کیا۔ اور اب چنار کے رفارمیٹری اسکول میں موجود ہیں۔

آلھا

(۱)

آلھا کا نام کس نے نہیں سُنا۔ زمانۂ قدیم کے چندیل راجپوتوں میں شجاعت اور سرفروشانہ اطاعت گزاری کے لئے کسی راجہ مہاراجہ کو بھی یہ شہرت دوام حاصل نہیں ہے راجپوتوں کے قانون اخلاق میں صرف شجاعت ہی نہیں داخل تھی۔ بلکہ اپنے آقا اور اپنے راجہ کے لئے اپنی جان دینا بھی اس کا ایک رکن تھا۔ آلھا اور اودل کی زندگی اس کی بہترین مثال ہے۔ سچا راجپوت کیا ہوتا تھا اور اُسے کیا ہونا چاہیئے۔ اُسے جس خوبصورتی سے ان دونوں بھائیوں نے دکھا دیا ہے۔ اس کی نظیر ہندوستان کے کسی دوسرے خطّے میں مشکل سے مل سکے گی۔ آلھا اور اودل کے معرکے اور ان کے کارنامے ایک چندیل شاعر نے شاید انہیں کے زمانے میں گائے۔ اور اس کو عوام میں جو مقبولیت اس صوبے میں حاصل ہے وہ شاید رامائن کو بھی نہ ہو۔ یہ نظم آلھا ہی کے نام سے مشہور ہے اور آٹھ نو صدیاں گذر جانے کے باوجود اس کی دلچسپی اور ہر دلعزیزی میں فرق نہیں آیا۔ آلھا گانے کا اس صوبہ میں بڑا رواج ہے۔ دیہات کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں آلھا سُننے بیٹھے جمع ہوتے ہیں۔ شہروں میں بھی کبھی کبھی یہ مجلسیں نظر آجاتی ہیں۔ خواص کی نسبت عام میں یہ قصّہ زیادہ مقبول ہے۔ کسی مجلس میں جائیے۔ ہزاروں آدمی فرش زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ساری محفل پر محویت کا عالم طاری ہے اور آلھا گانے والا کسی مونڈھے پر بیٹھا ہوا اپنی الاپ سُنا رہا ہے۔ اُس کی آواز حسب موقع کبھی اونچی ہو جاتی ہے اور کبھی مدھم۔ مگر جب وہ کسی لڑائی اور اس کی تیاریوں کا ذکر

کرنے لگتا ہے۔ تو الفاظ کی روانی، اس کے ہاتھوں اور ابروؤں کے اشارے ڈھول کی مردانہ لے۔ اور ان دلیرانہ الفاظ کی نشست جو کچھ رزمیہ نظموں ہی کے لئے مخصوص ہیں، سامعین کے دلوں میں مردانہ جوش کی ایک اُمنگ سی پیدا کر دیتے ہیں۔ طرزِ بیان ایسا سادہ اور دلچسپ اور زبان ایسی عام فہم ہے۔ کہ اس کے سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔ بیان اور جذبات کی سادگی حسنِ قبول کی جان ہے۔

راجہ پرمال دیو چندیل خاندان کا آخری راجہ تھا۔ تیرھویں صدی کے آغاز نے اس خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ مہوبا جو ایک معمولی قصبہ ہے اُس زمانے میں چندیلوں کا پایہ تخت تھا۔ قلمرو مہوبا دہلی اور قنوج سے آنکھیں ملاتی تھی آلہا اور اودل اسی راجہ پرمال دیو کے اعیانِ دربار تھے۔ یہ دونوں بھائی ابھی بچے ہی تھے کہ ان کا باپ جسراج ایک لڑائی میں مارا گیا۔ راجہ کو یتیموں پر ترس آیا۔ انہیں راج محل میں لے آئے اور محبت کے ساتھ اپنی رانی ملہنا کے سپرد کر دیا۔ رانی نے ان دونوں بھائیوں کی پرورش اور پرداخت اپنے لڑکوں کی طرح کی۔ جوان ہو کر یہی دونوں بھائی بہادری میں شہرۂ آفاق ہوئے۔ انہیں دلاوروں کے کارناموں نے مہوبا کا نام روشن کر دیا ہے۔

بڑے لڑیّا مہوبے والے

جن کے بل کو وار نہ پار

آلہا اور اودل راجہ پرمال دیو پر جان قربان کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے رانی ملہنا نے انہیں پالا۔ ان کی شادیاں کیں۔ انہیں گود میں کھلایا۔ حقِ نمک کے ساتھ ان احسانات اور تعلقات نے دونوں بھائیوں کو چندیل راج کا جان نثار محافظ اور راجہ پرمال دیو کا وفادار اور اطاعت گزار خادم بنا دیا تھا۔ ان کی جان بازیوں کی بدولت قرب و جوار کے صدہا خود سر فرمانبردار چندیلوں کے ہوا خواہ بن گئے۔ قلمرو مہوبا کے حدود دریا کے سیلاب کی طرح بڑھے اور چندیلوں کا اقتدار ہلال سے بدر ہوا۔ یہ دونوں دلاور

کبھی چین سے نہ بیٹھے تھے۔ میدان آرائیوں کی انہیں دھن تھی بھکھ پیسج پر بینو آتی تھی اور وہ زمانہ بھی ایسا ہی پُر آشوب تھا۔ اس زمانے میں چین سے بیٹھنا دنیا کے پردے سے مٹ جانا تھا۔ بات بات پر تلواریں چلتیں اور خون کی ندیاں بہتی تھیں شتے کتخدائیاں خونریز لڑائیوں کے مترادف ہوگئی تھیں۔ لڑکی پیدا ہوئی اور شامت آگئی ہزاروں سپاہیوں، سرداروں اور عزیزوں کے خون جہیز میں دینے پڑتے تھے۔ آلھا اُودل اُس پُرشور زمانے کی سچّی تصویریں ہیں اور گو ایسے حالات و زمانے کے ساتھ جو اخلاقی کمزوریاں اور ناہمواریاں مخصوص ہوتی ہیں، اُن کے اثر سے وہ محفوظ نہیں ہیں۔ مگر ان کی لغزشیں ان کا قصور نہیں بلکہ ان کے زمانے کا قصور ہے۔

(۲)

آلھا کا ماموں ماہل ایک سیہ باطن کینہ ور آدمی تھا۔ ان دونوں بھائیوں کی حشمت اور ثروت اس کے پہلو میں کانٹے کی طرح کھٹکا کرتی تھی۔ اُس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ ان کے عروج کو خاک میں ملا دے، اسی کارِ خیر کے لئے اُس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ سینکڑوں وار کئے، سینکڑوں بار آگ لگائی، یہاں تک کہ بالآخر اُس کی نشہ تیز سرگوشیوں نے راجہ پرمال کو متوالا کر دیا۔ لوہا بھی پانی سے کٹ جاتا ہے۔

ایک روز راجہ پرمال دربار میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے کہ ماہل آیا۔ راجہ نے اُسے مغموم دیکھ کر پوچھا: "بھیا تمہارا چہرہ کچھ اُترا ہوا ہے۔" ماہل کی آنکھیں آنسوؤں ہوگئیں۔ مکّار آدمی کو اپنے جذبات پر جو قدرت ہوتی ہے وہ کسی درویش کامل کو بھی مشکل سے حاصل ہوتی ہے اس کا دل روتا ہے مگر ہونٹ ہنستے ہیں، دل عشرت کے مزے لیتا ہے مگر آنکھیں روتی ہیں، دل حسد کی آگ سے جلتا ہے مگر زبان سے قند و شکر کی ندیاں بہتی ہیں ماہل بولا۔ مہاراج! آپ کے زیر سایہ رہ کر مجھے دنیا میں اب کسی چیز کی تمنّا باقی نہیں۔ مگر جن

لوگوں کو آپ نے خاک سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا، اور جو آپ کی عنایتوں کی بدولت آج صاحب جاہ و حشم بن گئے۔ اُن کی احسان فراموشی اور فتنہ انگیزی میرے لئے سوہان روح ہو رہی ہے۔

پرمال نے متعجب ہو کر پوچھا "کیا میرے نمک خواروں میں ایسے لوگ بھی ہیں؟"

ماہل۔ مہاراج میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ آپ کا دل لطف و کرم کا دریا ہے مگر اُس میں ایک خونخوار نہنگ آ گھسا ہے۔

"وہ کون ہے؟"

"میں"

راجہ نے متحیر ہو کر کہا۔ "تم!"

ماہل۔ ہاں مہاراج! وہ بدقسمت شخص میں ہی ہوں۔ میں آج خود اپنی فریاد لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اپنے عزیزوں کے متعلق میرا جو فرض ہے وہ اس عقیدت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں، جو مجھے آپ کی ذات پاک سے ہے۔ آلھا میرا لخت جگر ہے۔ اس کا گوشت میرا گوشت اور اس کا خون میرا خون ہے۔ مگر اپنے بدن میں جو مرض پیدا ہو جاتا ہے اُسے مجبوراً حکیم سے کہنا پڑتا ہے۔ آلھا تمردت کے نشے میں چور ہو رہا ہے اُس کے دل میں یہ خیال خام پیدا ہو گیا ہے۔ کہ میرے ہی قوت بازو سے یہ راج قایم ہے۔

راجہ پرمال کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں، بولا۔ "آلھا کو میں نے ہمیشہ اپنا لڑکا سمجھا ہے۔"

ماہل۔ لڑکے سے زیادہ۔

پرمال۔ وہ یتیم تھا۔ بےکس تھا۔ میں نے اس کی پرورش کی۔ اُسے گود میں کھلایا میں نے اُسے جاگیریں دیں۔ اُسے اپنی فوج کا سپہ سالار بنایا۔ اُس کی شادی میں میں نے بیس ہزار چندیل سورماؤں کا خون بہا دیا۔ اس کی ماں اور میری ملہنا برسوں گلے مل کر سوئی ہیں اور آلھا کیا میرے احسانات بھول سکتا ہے۔ ماہل! مجھے تمہاری بات پر اعتبار نہیں

آتا۔

ماہل کا چہرہ زرد ہو گیا۔ مگر سنبھل کر بولا۔ "مہاراج! میری زبان سے کبھی جھوٹی بات نہیں نکلی۔"

پرمال۔ مجھے کیونکر یقین آئے؟

ماہل نے آہستہ سے راجہ کے کان میں کچھ کہہ دیا۔

(۳)

آلھا اور اودل دونوں چوگان بازی کی مشق کر رہے تھے۔ وسیع میدان میں ہزاروں آدمی محو تماشا تھے۔ گیند کسی بدقسمت کی طرح اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھی۔ چوبدار نے اطلاع کی۔ مہاراج نے یاد فرمایا ہے۔ آلھا کو اندیشہ ہوا۔ مہاراج نے خلاف معمول اس وقت کیوں یاد کیا۔ کھیل بند ہو گیا۔ گیند کو ٹھوکروں کو نجات ملی۔ فوراً دربار میں چوبدار کے ساتھ حاضر ہوا۔ اور جھک کر آداب بجا لایا۔

پرمال نے کہا۔ "میں تم سے کچھ مانگوں، دو گے؟"

آلھا نے سادگی سے جواب دیا۔ "فرمائیے۔"

پرمال۔ انکار تو نہ کرو گے؟

آلھا نے کنکھیوں سے ماہل کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ اس وقت کچھ نہ کچھ دال میں کالا ہے۔ اس کے چہرے پر یہ مسکراہٹ کیوں؟ گولریں یہ پھول کیوں لگے؟ کیا میری وفاداری کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ جوش سے بولا۔ مہاراج میں آپ کی زبان سے ایسے سوالات سننے کا عادی نہیں ہوں۔ آپ میرے سرپرست، میرے مربی اور میرے راجہ ہیں۔ آپ کے ابرو کے اشارے پر میں آگ میں کود سکتا ہوں۔ اور موت سے لڑ سکتا ہوں۔ آپ کی مرضی پا کر میں محال کو ممکن بنا سکتا ہوں۔ آپ مجھ سے ایسے سوالات نہ کریں۔

پرمال۔ شاباش! مجھے تم سے ایسی ہی اُمید ہے۔

آلھا ۔ مجھے کیا حکم ملتا ہے؟

پرمال ۔ تمہارے پاس ناہر گھوڑا ہے؟

آلھا نے "جی ہاں" کہہ کر ماہل کی طرف غضب ناک آتشیں نگاہوں سے دیکھا۔

پرمال ۔ اگر تمہیں ناگوار نہ ہو تو اُسے میری سواری کے لئے دے دو۔

آلھا کچھ جواب نہ دے سکا۔ سوچنے لگا۔ میں نے ابھی وعدہ کیا ہے کہ انکار نہ کروں گا۔ میں نے بات ہار دی ہے۔ مجھے انکار نہ کرنا چاہیئے۔ ضرور اس وقت میری وفاداری کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ میرا انکار اس وقت نہایت بے موقع اور خطرناک ہے۔ اس کا تو کچھ غم نہیں۔ مگر میں انکار کس مُنہ سے کروں۔ بے وفا نہ کہلاؤں گا۔ راجہ کا تعلق میرے ساتھ محض خادم و مخدوم کا نہیں ہے۔ میں اُن کی گود میں کھیلا ہوں۔ جب میرے ہاتھ کمزور تھے اور پاؤں میں کھڑے ہونے کا بوتا نہ تھا۔ جب انہوں نے میرے ظلم سہے ہیں۔ کیا اب انکار کر سکتا ہوں۔

خیالات نے پہلو بدلا مانا کہ راجہ کے احسانات مجھ پر بے شمار ہیں۔ میرے جسم کا ایک ایک رُواں اُن کے احسانات سے گراں بار ہے۔ مگر چھتری کبھی اپنی سواری کا گھوڑا دوسرے کو نہیں دیتا۔ یہ چھتریوں کا دھرم نہیں۔ میں راجہ کا پروردہ اور منت کش ہوں۔ مجھے اپنے جسم پر اختیار ہے اُسے میں راجہ پر نثار کر سکتا ہوں۔ مگر راجپوتی دھرم پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے اُسے میں نہیں توڑ سکتا۔ جن لوگوں نے دھرم کے کچے دھاگے کو لوہے کی دیوار سمجھا ہے۔ اُنہیں سے راجپوتوں کا نام روشن ہے۔ کیا میں ہمیشہ کے لئے اپنے پر داغ لگاؤں؟ آہ! ماہل نے اس وقت مجھے خوب جکڑ رکھا ہے۔ سامنے خونخوار شیر ہے پیچھے گہرا غار ہے۔ یا تو ذلت اُٹھاؤں۔ یا احسان فراموش کہلانا منظور ہے۔ مگر ذلیل بننا منظور نہیں۔ تباہ ہو جانا منظور ہے مگر راجپوتوں

کے دھرم میں بٹا لگانا منظور نہیں ۔

آلھا سر نیچا لئے انہیں خیالات میں غوطے کھا رہا تھا ۔ یہ اُس کیلئے آزمائش کا موقع تھا ۔ جس میں کامیاب ہو جانے پر اُس کے مستقبل کا مدار و انحصار تھا ۔"

مگر مال کے لئے یہ موقع کچھ کم صبر آزما نہ تھا ۔ وہ دن اب آ گیا ۔ جس کے انتظار میں کبھی آنکھیں نہیں تھکیں ، خوشیوں کا یہ سیلاب اب ضبط کی آہنی دیوار کو کاٹتا جاتا تھا ۔ درویش کامل پر کمزور انسان غالب آتا جاتا تھا ۔ یکایک پرمال نے آلھا سے بلند لہجے میں پوچھا ۔" کس کشمکش و پیچ میں ہو ۔ کیا نہیں دینا چاہتے ؟"

آلھا نے راجہ سے آنکھیں ملا کر کہا ۔" جی نہیں ۔"

پرمال کو طیش آ گیا ۔ کڑک کر بولا ۔ کیوں ؟

آلھا نے مستقل مزاجی سے جواب دیا ۔" یہ راجپوتوں کا دھرم نہیں ہے ۔"

پرمال ۔ کیا میرے احسانات کا یہی بدلہ ہے ۔ تم جانتے ہو ۔ پہلے تم کیا تھے اور اب کیا ہو ۔؟

آلھا ۔ جی ہاں ، جانتا ہوں ۔

پرمال ۔ تمہیں میں نے بنایا ہے اور میں ہی بگاڑ سکتا ہوں ۔

آلھا سے اب صبر نہ ہو سکا ۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور تیوروں پر بل پڑ گئے تند لہجے میں بولا ۔ مہاراج ! آپ نے میرے اوپر جو احسانات کئے اُن کا میں ہمیشہ ممنون رہوں گا ۔ چھتری کبھی احسان نہیں بھولتا ۔ مگر آپ نے میرے اوپر احسانات کئے ہیں ، تو میں نے بھی دل توڑ کر آپ کی خدمت کی ہے ۔ محض ملازمت اور حق نمک مجھ میں وہ عقیدت اور سرگرمی نہیں پیدا کر سکتا تھا ۔ جس کا میں بارہا اظہار کر چکا ہوں ۔ مگر خیر ، اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس دربار میں میرا ہرگز گزر نہ ہوگا ۔ میرا آخری سلام قبول ہو ۔ اور اپنی نادانی سے میں نے جو کچھ خطا کی ہو ۔ وہ معاف کی جائے ۔

ماہل کی طرف مخاطب ہو کر اُس نے کہا، "ماموں صاحب! آج سے میرے اور آپ کے درمیان خون کا رشتہ ٹوٹتا ہے۔ آپ میرے خون کے پیاسے ہیں، تو میں بھی آپ کی جان کا دشمن ہوں۔"

(۴)

آلھا کی ماں کا نام دیول دیوی تھا۔ اس کا شمار ان عالی حوصلہ اور بلند خیال عورتوں میں ہے، جنہوں نے ہندوستان کے گزشتہ کارناموں کو قابلِ رشک بنا دیا ہے۔ اس تاریک زمانے میں بھی کہ نفاق اور عناد کا ایک عظیم مہلک سیلاب ملک میں آ پہنچا تھا، ہندوستان میں ایسی ایسی دیویاں پیدا ہوئیں، جو تاریخ کے سیاہ ترین صفحات کو بھی روشن کر سکتی ہیں۔ دیول دیوی نے آلھا کی آن پر مری کا تذکرہ سُنا، تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے دونوں بھائیوں کو گلے لگا کر کہا، بیٹا! تم نے وہی کیا جو راجپوتوں کا دھرم تھا۔ میں بہت خوش نصیب ہوں، کہ ایسے دو حق پرور بیٹے پائے ہیں۔" اُسی روز دونوں بھائیوں نے مہوبا سے کوچ کر دیا۔ اپنے ساتھ اپنی تلوار اور گھوڑوں کے سوا اور کچھ نہ لیا۔ مال و اسباب سب وہیں چھوڑ دیئے۔ سپاہی کی دولت اور عزت سب اُس کی تلوار ہے۔ جس کے پاس شجاعت کی دولت موجود ہے، اُسے کسی دوسری دولت کی ضرورت نہیں۔

برسات کے دن تھے۔ ندی نالے اُمڈے ہوئے تھے۔ اندر کی فیاضیوں سے مالا مال ہو کر زمین پھولی نہیں سماتی تھی، درختوں پر موروں کی رسیلی جھنکاریں سنائی دیتی تھیں۔ اور کھیتوں میں بادۂ فراغت سے متوالے کسان ملار کی تانیں لگاتے تھے۔ پہاڑوں کی گھنی ہریاول، پانی کے بلوریں تختوں اور جنگلی بیل بوٹوں کے بناؤ سنوار سے قدرت پر ایک جوبن برس رہا تھا۔ میدانوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی طرب خیز ہوا، جنگلی پھولوں کی میٹھی سہانی روح افزا مہک اور کھیتوں کی لہراتی ہوئی بوقلموں روئیدگی نے دلوں میں آرزوؤں کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ ایسے مبارک موسم میں آلھا نے مہوبا کو

خیرباد کہا۔ دونوں بھائیوں کی آنکھیں روتے روتے لال ہو گئی تھیں کیونکہ آج اُن سے اُن کا وطن چھوٹ رہا تھا انہیں گلیوں میں اُنہوں نے گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا تھا۔ انہیں تالابوں میں کاغذ کی ناؤیں چلائی تھیں یہیں خواب کی سی فکروں کی بہاریں لوٹی تھیں ان سے اب ہمیشہ کیلئے ناتا ٹوٹتا تھا۔ دونوں بھائی آگے بڑھتے جاتے تھے مگر بہت آہستہ آہستہ یہ خیال تھا کہ شاید پرمال نے روٹھنے والوں کو منانے کے لئے اپنا کوئی معتمد آدمی بھیجا ہو گا گھوڑوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ مگر جب مہوبے کی پہاڑیوں کا آخری نشان نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ تو اُمید کی آخری جھلک بھی غائب ہو گئی۔ بے وطنوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گھوڑے بڑھا دیئے اُن کی جلا وطنی کی خبریں بہت جلد چاروں طرف پھیل گئیں۔ اُن کے لئے ہر دربار میں جگہ تھی ہر چہار طرف سے راجاؤں کے پیغام آنے لگے قنوج کے راجہ جے چند نے اپنے راجکمار کو ان کی ملاقات کیلئے بھیجا پیغاموں سے جو کام نہ نکلا وہ اس ملاقات نے پورا کر دیا۔ راجکمار کی خاطر داریاں اور گرمجوشیاں بھائیوں کو قنوج کھینچ لے گئیں جے چند آنکھیں فرش راہ کئے بیٹھا تھا۔ آلہا کو اپنی فوج کا سپہ سالار بنا دیا۔

(۵)

آلہا اور اودل کے چلے جانے کے بعد مہوبے میں بے تمیزیوں کا دَور دورہ ہوا پرمال کمزور فرمانبردار تھا۔ باجگزار راجاؤں نے علم بغاوت بلند کیا۔ ایسی کوئی طاقت نہ رہی جو شورش پسند عناصر کو قابو میں رکھ سکے دہلی کے راجہ پرتھی راج کی کچھ فوج مقام سمتا سے ایک کامیاب مہم سر انجام دینے کے بعد واپس آ رہی تھی علاقہ مہوبا میں خیمہ زن ہوئی اکھڑ سپاہیوں میں تلوار چلتے کتنی دیر لگتی ہے۔ چاہے راجہ پرمال کے ملازموں کی زیادتی ہو چاہے چوہان سپاہیوں کی نتیجہ یہ ہوا کہ چندیلوں اور چوہانوں میں اَن بن ہو گئی۔ جنگ چھڑ گئی چوہان تعداد میں کم تھے۔ چندیلوں نے آئین مہمان نوازی کو بالائے طاق رکھ کر چوہانوں کے خون سے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا اور یہ نہ سمجھے کہ مٹھی بھر سپاہیوں کے پیچھے سارے ملک پر آفت آ جائے گی۔ بے گناہوں کا خون رنگ

لائیگا۔ پرتھی راج کو یہ دلشکن خبر ملی۔ تو اُس کے غصّے کی کوئی حد نہ رہی۔ آندھی کی طرح مہوبے پر چڑھ دوڑا۔ اور سِرکوٹ جو علاقہ مہوبا کا ایک مشہور قصبہ تھا۔ مسمار کر کے مہوبے کی طرف بڑھا چندیلوں نے بھی فوج آراستہ کی۔ مگر پہلے ہی مقابلے میں اُن کے حوصلے پست ہو گئے آلہا اودل کے بغیر فوج بن دولھا کے برات تھی۔ ساری فوج تتر بتر ہو گئی۔ ملک میں تہلکہ پڑ گیا۔ اب کوئی دم میں پرتھی راج مہوبے میں آ پہنچے گا۔ اس خوف سے لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پرمال اپنے کئے پر بہت پچھتایا۔ مگر اب پچھتانا بے سود تھا۔ کوئی مفر نہ دیکھ کر اس نے پرتھی راج سے ایک ماہ کی مہلت جنگ کی التجا کی۔ چوہان راجہ آدابِ جنگ کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ اُس کی ہمّت عالی اُسے کمزور، بے خبر اور نامستعد دشمن پر وار کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اس معاملے میں اگر وہ جنگی آئین کا ایسی سختی سے پابند نہ ہوتا تو شہاب الدین کے ہاتھوں اُسے روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔ اُس کی عالی ہمتی ہی اسکی جان کی گاہک ہوئی۔ اُس نے پیغام منظور کر لیا چندیلوں کی جان میں جان آئی۔

اب مشورہ ہونے لگا کہ پرتھی راج سے کیونکر مقابلہ کیا جائے۔ رانی ملہنا بھی اس مشورے میں شریک تھی۔ کسی نے کہا مہوبے کے گرد ایک فصیل بنائی جائے۔ کوئی بولا ہم لوگ مہوبے کو ویران کر کے دکن کی طرف چلیں۔ پرمال زبان سے تو کچھ نہ کہتا تھا مگر اطاعت گذاری کے سوا اُسے اور کوئی چارہ نہ نظر آتا تھا۔ تب رانی ملہنا کھڑی ہو کر بولی۔

چندیل بنس کے راجپوتو! تم کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ کیا فصیلوں سے تم دشمن کو روک لوگے۔ جھاڑو سے کہیں آندھی رُکتی ہے۔ تم مہوبے کو ویران کر کے بھاگنے کی صلاح دیتے ہو۔ ایسی بزدلانہ صلاحیں عورتیں دیا کرتی ہیں۔ تمہاری دلیریاں، تمہاری جانبازیاں اب کہاں گئیں؟ ابھی بہت دن نہیں گزرے کہ چندیلوں کے نام سے راجے تھراتے تھے۔ چندیلوں کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔ تم نے چند سال کی زمانے میں سینکڑوں میدان جیتے تمہیں کبھی ہار نہیں ہوئی۔ تمہاری تلوار کی دمک کبھی ماند نہیں ہوئی۔ تم اب بھی وہی ہو۔ مگر تم

میں اب وہ پرشارتھ نہیں ہے وہ پرشارتھ بنا پھر بنس کے ساتھ مہوبے سے اُٹھ گیا دیول دیوی کے روٹھنے سے چاند کا دیوی بھی ہم سے روٹھ گئیں اب اگر کوئی یہ ہاری ہوئی بازی سنبھال سکتا ہے تو وہ آلھا ہے وہی دونوں بھائی اس نازک وقت میں تمہیں بچا سکتے ہیں اُنہیں کو مناؤ۔ اُنہیں کو سمجھاؤ ان پر مہوبے کے بہت حقوق ہیں۔ مہوبے کی آب و ہوا سے اُن کی پرورش ہوئی ہے۔ وہ مہوبے کے حقوق کبھی بھول نہیں سکتے اُنہیں ایشور نے بل اور ودیا دی ہے وہی اس وقت دیش کا بیڑا اُٹھا سکتے ہیں، رانی ملہنا کی باتیں لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئیں۔

(۶)

جگنا بھاٹ آلھا اور اودل کو قنوج سے لانے کیلئے روانہ ہُوا۔ یہ دونوں بھائی راجہ کنور لاکھن کے ساتھ شکار کھیلنے جا رہے تھے کہ جگنا نے پہنچ کر پرنام کیا۔ اُس کے چہرے سے خفت اور پریشانی برس رہی تھی۔ آلھا نے گھبرا کر پوچھا "کبیشر! یہاں کیسے بھول پڑے، مہوبے میں تو سب خیریت ہے ہم غریبوں کو کیونکر یاد کیا؟ جگنا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، بولا! اگر خیریت ہوتی تو تمہاری پناہ کیوں لیتا۔ مصیبت پڑنے پر دیوتاؤں کی یاد آتی ہے۔ مہوبے پر اس وقت اندر کا کوپ چھایا ہُوا ہے پرتھی راج چوہان علاقہ مہوبہ گھیرے پڑا ہے۔ نرسنگھ اور بیرسنگھ تلواروں کی نذر ہو چکے ہیں۔ سرسا راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ چندیلوں کا راج ویران ہُوا جاتا ہے۔ سارے ملک میں کہرام مچا ہُوا ہے۔ بڑی مشکلوں سے ایک مہینہ کی مہلت لی گئی ہے۔ اور مجھے راجہ پرمال نے تمہارے پاس بھیجا ہے اس مصیبت کے وقت ہمارا کوئی مددگار نہیں ہے کوئی ایسا نہیں ہے جو ہماری ہمت بندھائے جب سے تم نے مہوبے سے ناتا توڑا ہے تب سے راجہ پرمال کے ہونٹوں پر ہنسی نہیں آئی۔ جس پرمال کو اُداس دیکھ کر تم بے چین ہو جاتے تھے اُسی پرمال کی آنکھیں مہینوں سے نیند کو ترستی ہیں۔ رانی ملہنا جس کی گود میں تم کھیلتے رہے ہو رات دن تمہاری یاد میں روتی رہتی ہے۔ وہ اپنے جھروکے سے قنوج کی طرف آنکھیں لگا تمہاری راہ دیکھا کرتی ہے۔ اے بنا پھر بنس کے سپوتو! چندیلوں کی ناؤ اب ڈوب رہی ہے

چندیلوں کا نام اب مٹا جاتا ہے۔ اب موقع ہے کہ تم تلوار ہاتھ میں لو۔ اگر اس موقع پر تم نے گرتی ہوئی ناؤ کو نہ سنبھالا، تو تمہیں ہمیشہ کے لئے پچھتانا پڑے گا۔ کیونکہ اس نام کے ساتھ تمہارا اور تمہارے نامور باپ کا نام بھی ڈوب جائے گا۔

آلہا نے ترش ہو کر جواب دیا۔ ہمیں اس کی اب کچھ پرواہ نہیں ہے۔ ہمارا اور ہمارے باپ کا نام تو اسی وقت ڈوب گیا جب ہم بے خطا اور بے قصور مہوبے سے نکال دیئے گئے۔ مہوبا مٹی میں مل جائے۔ چندیلوں کا چراغ گل ہو جائے۔ اب ہمیں ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔ کیا ہماری خدمت کا یہی صلہ تھا جو ہم کو عطا ہوا ہے؟ ہمارے باپ نے مہوبے پر اپنی جان نثار کر دی۔ ہم نے گونڈوں کو شکست دی اور چندیلوں کو دیوگڑھ کا مالک بنا دیا۔ ہم نے جادو قوم سے مقابلہ کیا اور کٹھیار کے میدان میں چندیلوں کا جھنڈا گاڑ دیا۔ میں نے انہیں ہاتھوں سے کچھواہوں کی بڑھتی ہوئی لہر کو روکا۔ گیا کا میدان ہمیں نے جیتا۔ ریوان کا گھمنڈ ہمیں نے توڑا۔ میں نے ہی میو اسے خراج لیا۔ ہم نے یہ سب کچھ کیا اور اس کا ہم کو یہ صلہ عطا ہوا ہے۔ میرے باپ نے دس راجاؤں کو طوق اطاعت پہنایا۔ میں نے پرمال کی خدمت میں سات بار مہلک زخم کھائے۔ تین بار موت کے منہ سے نکل آیا۔ میں نے چالیس لڑائیاں لڑیں اور کبھی ہار کر نہ آیا۔ اودل نے سات خونریز معرکے فتح کئے۔ ہم نے چندیلوں کی دلاوری کا ڈنکا بجا دیا۔ چندیلوں کا نام ہم نے آسمان تک پہنچا دیا اور اس کا ہم کو یہ صلہ عطا ہوا ہے۔ پرمال کیوں اب اسی دغاباز ماہل کو اپنی مدد کے لئے نہیں بلاتے۔ جسے خوش کرنے کے لئے میرا دیس نکالا کیا تھا۔

ملہنا نے جواب دیا۔ آلہا! یہ راجپوتوں کی باتیں نہیں ہیں۔ تمہارے باپ نے جس راج پر جان نثار کر دی۔ وہی راج اب دشمن کے پاؤں تلے روندا جا رہا ہے۔ اسی باپ کے بیٹے ہو کر بھی کیا تمہارے خون میں جوش نہیں آتا۔ وہ راجپوت جو اپنی مصیبت میں گرفتار راجہ کو ترک کرتا ہے اس کے لئے جہنم کی آگ کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہے۔ تمہارے وطن پر ادبار کی گھٹا چھائی ہے۔ تمہاری مائیں اور بہنیں دشمن کی آبرو ریز نگاہوں کا نشانہ بن رہی ہیں۔ کیا اب بھی تمہارے خون میں جوش نہیں آتا۔ اپنے وطن کی یہ درگت دیکھ کر بھی تم قنوج میں چین کی نیند سو سکتے ہو؟

دیول دیوی کو ملکھنا کے آنے کی خبر ہوئی۔ اُس نے فوراً آلھا کو بلا کر کہا "بیٹا! پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ اور آج ہی مہوبے چلنے کی تیاری کرو۔"

آلھا کچھ جواب نہ دے سکا مگر اودل جھنجلا کر بولا۔ "ہم اب مہوبا نہیں جا سکتے کیا تمہیں وہ دن بھول گئے جب ہم کتّوں کی طرح مہوبے سے نکال دیئے گئے۔ مہوبا ڈوبے یا بچے، ہمارا جی اس سے بھر گیا۔ اب اس کے دیدار کی آرزو نہیں ہے۔ اب قنوج ہی ہمارا وطن ہے۔"

راجپوتنی بیٹے کی زبان سے یہ کفر نہ سُن سکی، طیش میں آ کر بولی "اودل! تجھے ایسی باتیں مُنہ سے نکالتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ کاش ایشور مجھے بانجھ ہی رکھتا کہ ایسے بیٹوں کی ماں نہ بنتی۔ کیا انہیں بناپھر بنس کے نام پر کلنک لگانے والوں کیلئے میں نے گربھ کی پیڑ سہی تھی۔ نالائقو! میرے سامنے سے دُور ہو جاؤ۔ مجھے اپنا مُنہ نہ دکھاؤ۔ تم جسراج کے بیٹے نہیں ہو۔ تم جس کی ران سے پیدا ہوئے ہو وہ جسراج نہیں ہو سکتا۔"

یہ زخم کاری تھا۔ شرم سے دونوں بھائیوں کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "ماتا! اب بس کرو، ہم زیادہ نہیں سُن سکتے۔ ہم آج ہی مہوبے جائیں گے اور راجہ پرمال کی خدمت میں اپنا خون بہائیں گے۔ ہم میدانِ جنگ میں اپنی تلواروں کی چمک سے اپنے باپ کا نام روشن کریں گے۔ ہم چوہان کے مقابلے میں اپنی بہادری کے جوہر دکھائیں گے اور دیول دیوی کے بیٹوں کا نام اَمر کر دیں گے۔"

(۷)

دونوں بھائی قنوج سے چلے۔ دیول بھی ساتھ تھی۔ جب یہ روٹھنے والے دیارِ وطن میں پہنچے تو سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ ٹوٹی ہوئی ہمتیں بندھ گئیں۔ ایک لاکھ چندیلے ان دلاوروں کا خیر مقدم کرنے کیلئے کھڑے تھے۔ بہت عرصے کے بعد غربت زدگانِ وطن بچھڑے ہوؤں سے ملے۔ آنکھوں نے خوشی کے آنسو بہائے۔ راجہ پرمال اُنکے آنے کی خبر پاتے ہی کیرت ساگر تک پیادہ پا آیا۔ آلھا اور اودل دوڑ کر اُسکے پاؤں سے لپٹ گئے۔ تینوں کی آنکھوں سے پانی برسا اور ساری کدورتیں اور رنجشیں دُھل گئیں۔

دشمن سر پر کھڑا تھا، زیادہ مہمان نوازیوں کا موقع نہ تھا۔ وہیں کیرت ساگر کے کنارے

رہبران قوم اور ارکان دربار کے مشورے سے آلھا فوج کا سپہ سالار بنایا گیا وہیں مرنے مارنے کیلئے عہد و پیمان ہوئے وہیں دلاوروں نے قسمیں کھائیں کہ میدان سے ہٹیں گے تو مر کر ہٹیں گے وہیں لوگ باہم گلے ملے اور اپنی قسمتوں کا فیصلہ کرنے چلے آج کسی کی آنکھوں میں اور چہرے پر افسردگی کے آثار نہ تھے عورتیں ہنس ہنس کر اپنے پیاروں کو جدا کرتی تھیں مرد ہنس ہنس کر نازنینوں سے جدا ہوتے تھے کیونکہ یہ آخری بازی ہے اسے جیتنا زندگی اور ہارنا موت ہے۔

اس مقام کے پاس جہاں اب اورئی کا قصبہ آباد ہے دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور اٹھارہ دن تک خونریزیوں کا بازار گرم رہا۔ خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ پرتھی راج خود جنگ میں شریک تھا دونوں دل دل کھول کر لڑے۔ دلاوروں نے خوب ارمان نکالے اور دونوں طرف کی فوجیں وہیں کٹ مریں۔ تین لاکھ آدمیوں میں صرف تین آدمی زندہ بچے ایک پرتھی راج۔ دوسرا چند بھاٹ تیسرا آلھا۔ ایسی خونریز ثابت قدم اور فیصلہ کن لڑائی شاید ہی کسی ملک اور کسی زمانے میں ہوئی ہو۔ دونوں ہی ہارے اور دونوں ہی جیتے۔ چندیل اور چوہان ہمیشہ کیلئے خاک میں مل گئے کیونکہ تھانیسر کی لڑائی کا فیصلہ بھی اسی میدان میں ہو گیا چوہانوں میں جتنے تجربہ کار سپاہی تھے۔ وہ سب اورئی میں کام آئے شہاب الدین سے مقابلہ پڑا تو نو آموز ناتجربہ کار سپاہی میدان میں لائے گئے۔ اور نتیجہ وہی ہوا جو ہو سکتا تھا۔ آلھا کا کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں گیا۔ کہیں غم سے ڈوب مرا یا فقیر ہو گیا۔

عوام میں اب تک یہ عقیدہ ہے کہ وہ زندہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ وہ امر ہو گیا۔ یہ سب درست ہے کیونکہ آلھا واقعی امر ہے۔ اور اُسے کبھی فنا نہ ہوگی۔ اس کا نام ہمیشہ برقرار رہے گا۔

پریم پچیسی

حصّہ دوم

مُصنّفہ

منشی پریم چند

مصنّف

پریم بتیسی ۔ بازار حسُن ۔ دُودھ کی قیمت

جلوۂ ایثار ۔ نرملا ۔ دیہات کے افسانے وغیرہ

قیمت مکمل۔ اٹھارہ روپے

مطبوعہ:۔ جمال پریس دہلی

ملنے کا پتہ :۔

آزاد بُک ڈپو۔ ہال بازار۔ امرتسر

فہرست مضامین

خون سفید

(۱)

چیت کا مہینہ تھا - لیکن وہ کھلیان جہاں اناج کے سنہرے انبار لگتے تھے - جاں بلب مویشیوں کے آماجگاہ بنے ہوئے تھے - جن گھروں سے پھاگ اور بسنت کی الاپیں سنائی دیتی تھیں - وہاں آج تقدیر کا رونا تھا - سارا چوماسا گذر گیا پانی کی ایک بوند نہ گری - جیٹھ میں ایک بار موسلا دھار مینہ برسا تھا - کسان پھولے نہ سمائے - خریف کی فصل بودی - لیکن فیاض اندر نے اپنا سارا خزانہ شاید ایک ہی بار لٹا دیا - پودے اُگے - بڑھے پھر سوکھ گئے - مرغزاروں میں گھاس نہ جمی - بادل آتے - گھٹائیں اُمڈتیں - ایسا معلوم ہوتا کہ جل تھل ایک ہو جائیگا - مگر وہ نحوست کی نہیں - آرزوؤں کی گھٹائیں تھیں - کسانوں نے بہت جپ تپ کئے - اینٹ اور پتھر دیوتوں کے نام سے پوج گئے - پانی کی اُمید میں خون کے پرنالے بہ گئے - لیکن اندر کسی طرح نہ پسیجے - نہ کھیتوں میں پودے تھے - نہ چراگاہوں میں گھاس نہ تالابوں میں پانی - عجیب مصیبت کا سامنا تھا - جدھر دیکھئے خستہ حال افلاس اور فاقہ کشی کے دلخراش نظارے دکھائی دیتے تھے - لوگوں نے پہلے گہنے اور برتن گرو رکھے - اور تب بیچ ڈالے - پھر مویشیوں کی باری آئی اور جب روزی کا کوئی سہارا نہ رہا - تب اپنے وطن پر جان دینے والے کسان بیوی بچوں کو لے کر مزدوری کرنے کو نکلے - جا بجا محتاجوں اور مزدوروں کی پرورش کے لئے سرکار کی جانب سے امدادی تعمیرات جاری ہو گئی تھیں - جیسے

جہاں سمجھتا ہُوا۔ اُدھر جا نکلا۔

(۲)

شام کا وقت تھا۔ جادو رائے تھکا ماندہ خستہ حال آکر زمین پر بیٹھ گیا اور بیوی سے مایوسانہ لہجے میں بولا۔ "درخواست نامنظور ہو گئی"

یہ کہکر آنگن میں زمین پر لیٹ گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور آنتیں سُکڑی ہوئی تھیں آج دو دن سے اُس نے دانے کی صورت نہیں دیکھی۔ گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا۔ گہنے کپڑے برتن بھانڈے سب پیٹ میں سما گئے تھے۔ گاؤں کا ساہوکار نگاہ عصمت کی طرح آنکھیں چُرانے لگا۔ صرف تقاوی کا سہارا تھا۔ اُسکی درخواست دی تھی لیکن افسوس وہ بھی نامنظور ہو گئی۔ اُمید کا جھلملاتا ہُوا چراغ گُل ہو گیا۔

دیوکی نے شوہر کو ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے شوہر دن بھر کا تھکا ماندہ گھر آیا ہے اُسے کیا کھلائے، شرم کے مارے وہ ہاتھ پاؤں دھونے کیلئے پانی بھی نہیں لائی۔ جب ہاتھ پاؤں دھوکر وہ منتظر اور گرسنہ انداز سے اُسکی طرف دیکھے گا۔ تو وہ اُسے کیا کھانے کو دیگی۔ اس نے خود کئی دن سے دانے کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ لیکن اسوقت اُسے جو صدمہ ہُوا وہ فاقہ کشی کی تکلیف سے بدرجہا زیادہ سخت تھا۔ عورت گھر کی لکشمی ہے۔ گھر کے آدمیوں کو کھانا پلانا وہ اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اور خواہ یہ اُس کی زیادتی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ناداری اور بینوائی سے جو خانگی صدمہ اُس کو ہوتا ہے۔ وہ مردوں کو نہیں ہو سکتا۔

یکایک اُس کا بچہ سادھو نیند سے چونکا اور مٹھائیوں کی صبر آزما خواہش سے بھرا ہُوا آکر باپ سے لپٹ گیا۔ اس بچے نے آج صبح کو چنے کی روٹی کا ایک ٹکڑا کھایا تھا۔ اور تب سے کئی بار اُٹھا۔ اور کئی بار روتے روتے سو گیا۔ چار برس کا نادان بچہ اُسے مٹھائیوں اور بارش میں کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ جادو رائے نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ اُسکی طرف خطاوار نگاہوں سے دیکھا اُسکی گردن جھک گئی اور بیکسی آنکھوں میں نہ سما سکی

(۳)

دوسرے دن یہ کنبہ بھی گھر سے نکلا۔ جس طرح مرد کے دل سے غیرت اور عورت کی آنکھ سے حیا نہیں نکلتی اُسی طرح اپنی محنت سے روٹی کمانے والا انسان بھی مزدوری کی کھوج میں گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ لیکن فاقہ کشی! آہ تو سب کچھ کر سکتی ہے غیرت اور غیرت، شرم اور حیا یہ سب چمکتے ہوئے تارے تیری سیاہ گھٹاؤں کے پردے میں چھپ جاتے ہیں صبح کا وقت تھا۔ یہ دونوں غم نصیب گھر سے نکلے۔ جادو رائے نے لڑکے کو پیٹھ پر لیا۔ دیوکی نے وہ بینوائی کی گٹھڑی سر پر رکھی جس پر افلاس کو بھی ترس آتا۔ دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں، دیوکی روتی تھی۔ جادو خاموش تھا۔ گاؤں کے دو چار آدمیوں سے راستے میں مُٹھ بھیڑ ہوئی۔ مگر کسی نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ کہاں جاتے ہو کسی کے دل میں ہمدردی باقی نہ تھی۔

سورج ٹھیک سر پر تھا جب یہ لوگ لال گنج پہنچے۔ دیکھا تو میلوں تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے لیکن ہر ایک چہرے پر فاقہ کشی اور مصیبت کا ایک دفتر تھا۔ بیساکھ کی وہ جلتی ہوئی دھوپ آگ کے جھونکے زور زور سے سرراتے ہوئے چلتے تھے اور وہاں ہڈیوں کے بے شمار ڈھانچے جن کے بدن پر جامۂ عریانی کے سوا کوئی لباس نہ تھا مٹی کھودنے میں مصروف تھے گویا مرگھٹ تھا جہاں مُردے اپنے ہاتھوں اپنی قبریں کھود رہے تھے۔

بوڑھے اور جوان مرد اور بچے سب کچھ اس بیکسانہ ہمت اور یاس سے کام میں لگے ہوئے تھے گویا موت اور فاقہ کشی اُنکے سامنے بیٹھی ہوئی گھور رہی ہے اس آفت میں نہ کوئی کسی کا دوست تھا نہ ہمدرد۔ رحم، شرافت اور اخلاق یہ سب انسانی جذبات ہیں جنکا خالق انسان ہے قدرت نے جانداروں کو صرف ایک خاصیت عطا کی ہے اور وہ خود غرضی ہے۔ انسانی جذبات جو فارغ البالی کے سنگار ہیں اکثر بیوفا دوستوں کیطرح ہم سے دغا کر جاتے ہیں۔ لیکن یہ فطری خاصیت دم آخر تک ہمارا گلا نہیں چھوڑتی

(۴)

آٹھ دن گذر گئے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ کیمپ کا کام ختم ہو چکا تھا۔ کیمپ سے

کچھ دور آم کا ایک گھنا باغ تھا۔ وہیں ایک پیڑ کے نیچے جادو رائے اور دیوکی بیٹھے ہوئے تھے دونوں ایسے خستہ حال تھے کہ اُنکی صورت نہیں پہچانی جاتی تھی، وہ آزاد کاشتکار نہیں رہے۔ وہ اب فاقہ کش مزدور ہو گئے ہیں۔

جادو رائے نے بچے کو زمین پر سُلا دیا۔ اُسے کئی دن سے بخار آ رہا ہے۔ کنول سا چہرہ مُرجھا گیا ہے۔ دیوکی نے اسے آہستہ سے ہلا کر کہا "بیٹا آنکھیں کھولو۔ دیکھو سانجھ ہو گئی ہے"۔ سادھو نے آنکھیں کھول دیں۔ بخار اُتر گیا تھا۔ بولا۔ کیا ہم گھر آ گئے ماں؟ گھر کی یاد آ گئی، دیوکی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اُس نے کہا "نہیں بیٹا! تم اچھے ہو جاؤ گے تو گھر چلیں گے۔ اُٹھ کر دیکھو۔ کیسا اچھا باغ ہے۔

سادھو ماں کے ہاتھوں کے سہارے اُٹھا اور بولا۔ اماں مجھے بڑی بھوک لگی ہے لیکن تمہارے پاس تو کچھ نہیں ہے مجھے کیا کھانے کو دو گی؟

دیوکی کے کلیجے میں چوٹ لگی۔ ضبط کر کے بولی۔ نہیں بیٹا! تمہارے کھانے کو میرے پاس سب کچھ ہے۔ دادا پانی لاتے ہیں تو میں نرم نرم روٹیاں بنائے دیتی ہوں۔

سادھو نے ماں کی گود میں سر رکھ دیا اور بولا۔ اماں میں نہ ہوتا تو تمہیں اتنا دُکھ نہ ہوتا۔

یہ کہکر وہ پھوٹ پھوٹ رونے لگا۔ یہ وہی بے سمجھ بچہ ہے، جو دو ہفتہ پہلے مٹھائیوں کیلئے دنیا سر پر اُٹھا لیتا تھا۔ افلاس نے اور فکر نے کیسا تغیر کر دیا ہے یہ مصیبت کے احساس کا اثر ہے، کتنا دردناک، کتنا دل شکن!

اسی اثنا میں کئی آدمی لالٹین لئے ہوئے وہاں آئے۔ پھر گاڑیاں آئیں اُن پر ڈیرے اور خیمے لدے ہوئے تھے دم کے دم میں وہاں خیمے کھڑے ہو گئے سارے باغ میں چہل پہل نظر آنے لگی، دیوکی روٹیاں سینک رہی تھی۔ سادھو دھیرے دھیرے اُٹھا اور حیرت سے تاکتا ہوا ایک ڈیرے کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا۔

(۵)

پادری موہن داس خیمے سے باہر نکلے تو سادھو انہیں کھڑا دکھائی دیا اُسکی

صورت پر انہیں ترس آگیا۔ محبت کا دریا اُمڈ آیا۔ بچے کو گود میں اُٹھایا اور خیمے میں لاکر ایک گدّے دار کوچ پر بٹھا دیا۔ تب اُسے بسکٹ اور کیلے کھانے کو دیئے۔ لڑکے نے اپنے بہترین زمانے میں اِن نعمتوں کی صورت نہ دیکھی تھی۔ بخار کی بے چینی کم ہونے والی بھوک لگی ہوئی تھی اُس نے خوب سیر ہو کر کھایا اور تب احسان مند نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پادری صاحب کے پاس جاکر بولا۔ تم ہم کو روز ایسی چیز کھلاؤ گے؟

پادری صاحب اِس بھولے پن پر مسکرا کر بولے۔ میرے پاس اس سے بھی اچھی چیزیں ہیں۔ اس پر سادھو رام نے کہا اب میں روز تمہارے ساتھ رہوں گا ماں کے پاس ایسی چیزیں کہاں، وہ تو مجھے چنے کی روٹیاں کھلاتی ہے۔

اُدھر دیوکی نے روٹیاں بنائیں، اور سادھو کو پکارنے لگی۔ سادھو نے ماں کے پاس جاکر کہا۔ مجھے صاحب نے اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دی ہیں۔ صاحب بڑے اچھے ہیں۔

دیوکی نے کہا۔ میں نے تمہارے لئے نرم نرم روٹیاں پکائی ہیں۔ آؤ تمہیں کھلادوں۔

سادھو بولا۔ اب میں نہ کھاؤں گا۔ صاحب کہتے تھے کہ میں روز اچھی اچھی چیزیں کھلاؤں گا۔ میں اب اُن کے ساتھ رہوں گا۔

ماں نے سمجھا لڑکا ہنسی کر رہا ہے۔ اُسے چھاتی سے لگا کر بولی۔ کیوں بیٹا! ہم کو بھول جاؤ گے۔ میں تمہیں کتنا پیار کرتی ہوں۔؟

سادھو طفلانہ متانت سے بولا۔ تم تو مجھے روز چنے کی روٹیاں دیتی ہو تمہارے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ صاحب مجھے کیلے اور آم کھلائیں گے۔ یہ کہکر وہ پھر خیمے کی طرف بھاگا اور رات کو وہیں سو رہا۔

پادری موہن داس کا وہاں تین دن قیام رہا۔ سادھو دن بھر انہیں کے ساتھ رہتا۔ صاحب نے اُسے میٹھی میٹھی دوائیں دیں۔ اسکا بخار بھی جاتا رہا۔ وہ بھولے بھالے لوگ صاحب کو دعائیں دیتے۔ بچہ چنگا ہے اور آرام سے ہے۔ صاحب کو پرماتما سدا سکھی رکھے۔ انہوں نے بچے کی جان رکھ لی۔

چوتھے دن رات ہی کو پادری صاحب نے وہاں سے کوچ کیا اور صبح کو دیوکی

اُٹھی تو سادھو کا بھی وہاں پتہ نہ تھا۔ دیوکی نے سمجھا کہیں ٹہلنے گیا ہوگا۔ اس نے جادو سے کہا۔ یہاں تو نہیں ہے۔ اُس نے بھی یہی کہا۔ کہیں ٹہلنے گیا ہوگا۔ لیکن جب سورج نکل آیا اور کام پر چلنے کا وقت آپہنچا۔ تب جادو راکو کچھ اندیشہ ہوا اُس نے کہا۔ تم یہیں بیٹھی رہنا۔ میں ابھی اُسے لئے آتا ہوں۔

اُس نے قریب و جوار کے سب باغ چھان ڈالے اور دس بجتے بجتے ناکام لوٹ آیا سادھو نہ ملا۔ دیوکی نے زار زار رونا شروع کیا۔

پھر دونوں اپنے لال کی تلاش میں نکلے طرح طرح کے وسوسے دل میں آ رہے تھے۔ دیوکی کو پورا یقین تھا کہ صاحب نے اس پر کوئی منتر ڈال دیا لیکن جادو کو اس منتر کے طلسم میں کچھ خفیف سا شک تھا۔ بچہ اتنی دور انجان رستے پر اکیلا نہیں جا سکتا۔ تاہم دونوں گاڑی کے پہیوں اور گھوڑے کی ٹاپوں کے نشان دیکھتے چلے۔ یہاں تک کہ وہ ایک سڑک پر آپہنچے، وہاں گاڑی کے بہت سے نشان تھے خاص لیک کی تمیز نہ ہو سکی گھوڑے کی ٹاپ بھی ایک جھاڑی کی طرف جا کر غائب ہو گئی۔ اُمید کا سہارا ٹوٹ گیا دوپہر ہو گئی تھی۔ دونوں بے چین، مایوسی سے نیم جاں ہو گئے۔ وہیں ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ دیوکی بلاپ کرنے لگی۔ جادو نے غمگساری کا فرض ادا کرنا شروع کیا۔

جب دھوپ کی تیزی ذرا کم ہو گئی۔ تو دونوں پھر آگے چلے۔ لیکن اُمید کی بجائے مایوسی ساتھ تھی۔ گھوڑے کی ٹاپوں کے ساتھ اُمید کا دھندلا نشان غائب ہو گیا تھا۔

شام ہو گئی۔ جا بجا مویشی موت کے انتظار میں بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ یہ دونوں ہیبت کے مارے ہمت ہار کر درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ درخت پر فاختہ کا ایک جوڑا بسیرا لئے ہوئے تھا۔ اُن کا ننھا سا بچہ آج ایک شکرے کے چنگل میں پھنس گیا تھا دونوں دن بھر بے چین اُڑتے رہے۔ ہمت ہار کر بیٹھ رہے۔ اُمید میں اضطراب اور بیکلی ہے مایوسی میں تشفی و تسکین۔ دیوکی اور جادو کی مایوسی میں بھی اُمید کی جھلک دکھائی دیتی تھی، اس لئے وہ بے چین تھے۔

تین دن تک یہ دونوں اپنے کھوئے ہوئے لال کی تلاش کرتے رہے دانے سے بھینٹ نہیں

پیاس سے بے چین ہوتے تو پانی کے دو چار گھونٹ حلق کے نیچے اتار لیتے امید کی بجائے مایوسی کا سہارا تھا۔ ہمت کی بجائے بے ہمتی کا ساتھ۔ اشک اور غم کے سوا کوئی زادِ راہ نہیں۔ کبھی بچے کے پاؤں کے نشان دیکھتے تو انکے دلوں میں امید و بیم کا ایک طوفان سا اٹھ جاتا۔ لیکن ہر قدم انہیں منزلِ مقصود سے دور لئے جاتا تھا۔

(۶)

اس واقعہ کو چودہ سال گذر گئے اور متواتر چودہ سال ملک میں رام کا راج رہا۔ زمانہ کبھی اندر نے شکایت کا موقع دیا۔ اُمنڈی ہوئی ندی کی طرح انبار خانے غلّے سے لبریز تھے۔ اُجڑے گاؤں آباد ہو گئے مزدور کسان ہو بیٹھے۔ کسان جائیداد کی تلاش میں دوڑتے وہی جیت کے دن تھے۔ کھلیانوں میں اناج کے پہاڑ کھڑے تھے بھاٹ اور بھکاری کسانوں پر دنیا کی نعمتوں کی بارش کرتے نظر آتے تھے۔ سناروں کے دروازے پر سارے دن اور آدھی رات تک گاہکوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ درزی کو سر اٹھانے کی فرصت نہ تھی اکثر دروازوں پر گھوڑے ہنہنا رہے تھے

زمانے جیا درائے کے ساتھ بھی مساعدت کی اس کے گھر پر اب بجائے کھپریل کے پکّی چھت ہے۔ دروازے پر خوش قامت بیلوں کی جوڑی بندھی ہوئی ہے وہ اب اپنی بہل میں سوار ہو کر بازار جایا کرتا ہے۔ اس کا جسم اب اتنا سڈول نہیں ہے۔ پیٹ پر فارغ البالی کا خاص اثر نظر آتا ہے۔ بال بھی سفید ہو چلے ہیں۔ دیوکی کا شمار بھی گاؤں کی بڑی بوڑھی عورتوں میں ہوتا ہے۔ اور نسوانی مناقشات میں اکثر اس کے فیصلے ناطق سمجھے جاتے ہیں۔ جب وہ کسی پڑوسی کے گھر جاتی ہے تو وہاں کی بہوئیں خوف سے تھرتھرانے لگتی ہیں اس کی زبان تیز اور زبانِ شعلہ ریز کی سارے گاؤں میں دھاک بندھی ہوئی ہے مہین کپڑے اب اسے نہیں بھاتے لیکن گہنوں کے بارے میں وہ اتنی کفایت شعار نہیں ہے۔

ان کی زندگی کا دوسرا پہلو اس سے کم روشن نہیں ہے۔ ان کے دو اولادیں ہیں لڑکا مادھو سنگھ اب کھیتی باڑی کے کام میں باپ کی مدد کرتا ہے۔ لڑکی کا نام

شیو گوری ہے وہ اب ماں کے ساتھ چکی پیستی ہے اور خوب گاتی ہے۔ برتن دھونا اُسے پسند نہیں لیکن چوکا لگانے میں مشتاق ہے اُس کی گڑیوں کا کبھی بیاہ سے جی نہیں بھرتا آئے دن شادیاں ہوتی رہتی ہیں۔

گم گشتہ سادھو کی یاد تازہ ہے اور کبھی رُلائے بغیر نہیں رہتا دیوکی دن بھر اُس لاڈلے بیٹے کی سُدھ میں بے قرار رہتی ہے

شام ہو گئی تھی۔ بیل دن بھر کے تھکے سر جھکائے آتے تھے پجاریوں نے ٹھاکر دوارے میں گھنٹہ بجانا شروع کیا۔ آجکل فصل کے دن ہیں روز پوجا ہوتی ہے۔ جادو رائے ناریل لیے ہوئے تھے شیو گوری راستے میں کھڑی اُن بیلوں کو گن رہی تھی جو اُس کے عالیشان محل کی ذرا بھی عزت نہ کر کے اُسے روندتے چلے جاتے تھے

ناقوس اور گھنٹے کی آواز سُنتے ہی جادو رائے پرنام کرنے کیلئے اُٹھے کہ یکایک ایک شریف نوجوان بھونکتے ہوئے کُتوں کو دھتکارتا، بائیسکل کو ہاتھوں سے ڈھکیلتا ہوا اُنکے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جھک کر قدموں پر سر رکھ دیا۔ جادو رائے نے غور سے دیکھا اور تب دونوں لپٹ گئے۔ مادھو بھونچکا ہو کر بائیسکل کو دیکھنے لگا۔ شیو گوری روتی گھر میں بھاگ گئی۔ دیوکی سے بولی۔ دادا کو صاحب نے پکڑ لیا ہے۔ دیوکی گھبرائی ہوئی باہر آئی۔ سادھو اُسے دیکھتے ہی پاؤں پر گر پڑا۔ دیوکی لڑکے کو چھاتی سے لگا کر زار زار رونے لگی۔ گاؤں کے مرد اور عورتیں بچے جمع ہو گئے۔ میلہ سا لگ گیا

(۷)

سادھو نے کہا۔ ماتا جی اور پتا جی! مجھ بدنصیب سے جو کچھ قصور ہوا ہو اُسے معاف کیجئے میں نے اپنی نادانی سے خود بہت تکلیفیں اُٹھائیں اور آپ کو بہت دکھ دیا لیکن اب مجھے اپنی گود میں لیجئے۔

دیوکی نے رو کر کہا۔ جب تم ہم کو چھوڑ کر بھاگے تھے ہم لوگ تمہیں تین دن تک بے دانہ بے پانی ڈھونڈتے رہے۔ جب نراس ہو گئے تب اپنے نصیبوں کو رو رو کر بیٹھ گئے روتے روتے ایک یگ بیت گیا۔ بتاؤ بیٹا! تم کیسے بھٹکے اور کہاں رہے

سادھو نے ندامت آمیز محبت سے جواب دیا۔ ماتاجی حال کیا کہوں۔ میں بہر را رہے اُٹھ کر بھاگا۔ پادری صاحب کے بڑاو کا پتہ شام ہی کو پوچھ لیا تھا۔ بس پوچھتا ہوا دوپہر کو اُن کے پاس پہنچ گیا۔ صاحب نے مجھے بہتیرا سمجھایا کہ گھر لوٹ جاؤ۔ لیکن میں راضی نہ ہوا تب اُنہوں نے مجھے پونا بھیج دیا۔ میری طرح سیکڑوں لڑکے تھے۔ وہاں بسکٹ اور نارنگیوں کا کیا ذکر۔ اب مجھے آپ لوگوں کی یاد آئی اور میں اکثر رونا۔ مگر بچپن کی عمر تھی۔ دھیرے دھیرے اُنہیں لڑکوں میں ہل مل گیا۔ جب سے ہوش آیا اپنا پرایا سمجھنے لگا ہوں۔ تب سے اپنی نادانی پر ہاتھ ملتا رہا ہوں۔ رات دن آپ لوگوں کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ آج آپ لوگوں کی دعا سے وہ مبارک دن دیکھنا نصیب ہوا۔ بہت دن تک اناتھ رہا۔ اب مجھے اپنی سیوا میں رکھئے میں محبت اور پیار کا بھوکا ہوں۔ مدتوں سے مجھے یہ نعمت میسر نہیں ہوئی وہ نعمت مجھے دیجئے گاؤں کے بزرگ جمع تھے۔ بوڑھے جگن سنگھ بولے۔ تو کیوں بیٹا! تم اتنے دنوں پادریوں کے ساتھ رہے اُنہوں نے تم کو بھی پادری بنا لیا ہوگا؟

سادھو نے سر جھکا کر کہا۔ جی ہاں یہ تو ان کا دستور ہی ہے۔

جگن سنگھ نے جادو رائے کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ بڑی کٹھن بات ہے۔

سادھو بولا۔ برادری جو پرایشچت کرائے گی میں شوق سے پورا کروں گا۔ مجھ سے جو کچھ برادری کا اپرادھ ہوا ہے نادانی میں ہوا ہے۔ پھر بھی سزا کیلئے تیار ہوں۔

جگن سنگھ نے جادو رائے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور دور اندیشانہ انداز سے بولے ہندو دھرم میں ایسا کبھی نہیں ہوا ہے۔ یوں تمہارے باپ اور ماں چاہے تمہیں اپنے گھر میں رکھ لیں۔ تم اُن کے لڑکے ہو۔ مگر برادری اس کام میں شریک نہ ہوگی بولو جادو رائے کیا کہتے ہو کچھ تمہارے من کی بات بھی تو معلوم ہو۔

جادو رائے بڑے دبدھے میں پڑا ہوا تھا ایک طرف بیٹے کی محبت کھینچتی تھی۔ دوسری طرف برادری کا خوف دامنگیر تھا۔ جس لڑکے کیلئے رونے مدتیں گزر

گئیں آج وہی گھڑا سامنے آنکھوں میں آنسو بھرے کہتا ہے، پتا جی! مجھے اپنی گود میں لیجئے اور میں تیرتھ کے دیوتا کیطرح خاموش ہوں۔ افسوس ان بے رحم بھائیوں کو کیا کروں، کیسے سمجھاؤں۔

لیکن ماں کی ممتا نے جوش مارا، دیوکی سے ضبط نہ ہوا اس نے بے باکی سے کہا میں اپنے لال کو اپنے گھر میں رکھوں گی۔ کلیجے سے لگاؤں گی۔ اتنے دنوں کے بعد میں نے پایا ہے اُسے نہیں چھوڑ سکتی۔

جگن سنگھ تیز ہو کر بولے۔ چاہے برادری چھوٹ جائے۔

دیوکی نے بھی تیز ہو کر جواب دیا۔ ہاں چاہے برادری چھوٹ جائے۔ لڑکے بالوں ہی کیلئے آدمی برادری کی آڑ پکڑتا ہے جب لڑکا ہی نہ رہا تو برادری ہمارے کس کام آئے گی۔

اس پر کئی ٹھاکر لال لال آنکھیں نکال کر بولے۔ ٹھکرائن! برادری کی تو یہ مرجاد کرتی ہو۔ لڑکا چاہے کسی راستے پہ جائے لیکن برادری چوں نہ کرے ایسی برادری کہیں اور ہوگی، ہم صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ اگر یہ لڑکا تمہارے گھر میں رہا تو برادری بھی دکھا دے گی کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے۔

جگن سنگھ کبھی کبھی جادو رائے سے قرض لیا کرتے تھے، مصلحت آمیز لہجے میں بولے۔ بھابھی برادری یہ تھوڑا کہتی ہے کہ لڑکے کو گھر سے نکال دو۔ لڑکا اتنے دنوں کے بعد گھر آیا ہے ہمارے سر آنکھوں پر ہے۔ بس ذرا کھانے پینے اور چھوت چھات کا بچاؤ رہنا چاہیے۔ بولو جادو بھائی اب برادری کو کہاں تک دبانا چاہیے

جادو رائے نے سادھو کی طرف سائلانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ بیٹا! جہاں تم نے ہمارے ساتھ اتنا سلوک کیا ہے وہاں جگن بھائی کی بات مان لو

سادھو نے کسی قدر نا ملائم لہجے میں کہا کیا مان لوں۔ یہی کہ اپنوں میں غیر بن کر رہوں۔ ذلت اٹھاؤں۔ مٹی کا گھڑا بھی میرے چھونے سے ناپاک ہو جائے۔ نا! یہ میری ہمت سے باہر ہے۔ میں اتنا بے حیا نہیں ہوں۔

جادو رائے کو لڑکے کی یہ سخت گیری ناگوار گزری۔ وہ چاہتے تھے کہ اس وقت برادری کے لوگ جمع ہیں اُنکے سامنے اسطرح سمجھوتہ ہو جائے پھر کون دیکھتا ہے کہ ہم اُسے کسطرح رکھتے ہیں چڑھ کر بولے اتنی بات مانی پڑے گی

سادھو رائے اس پہلو کو نہ سمجھ سکے، باپ کی اس بات میں انہیں بے دردی کا رنگ نظر آیا۔ بولے میں آپکا لڑکا رہوں گا۔ آپکی محبت اور شفقت کی آرزو مجھے یہاں تک لائی ہے میں اپنے گھر میں رہنے آیا ہوں اگر یہ ممکن نہیں ہے تو میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ جسقدر جلد ہو سکے یہاں سے بھاگ جاؤں جن کے خون سفید ہو گئے ہیں اُن کے درمیان رہنا فضول ہے۔

دیو کی نے رو کر کہا۔ للّو! میں تمہیں اب نہ جانے دوں گی۔

سادھو کی آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن مسکرا کر بولا۔ میں تو تیری تھالی میں کھاؤں گا۔ دیو کی نے اسکی طرف مادرانہ شفقت سے بھری ہوئی آنکھیں اٹھائیں اور بولی۔ میں نے تو تجھے چھاتی سے دودھ پلایا ہے تو میری تھالی میں ہی کھائے گا۔ تو کیا میرا بیٹا ہی نہیں ہے۔ کوئی اور تو نہیں ہو گیا۔

سادھو ان باتوں کو سُن کر متوالا ہو گیا۔ ان میں کتنا پیار، کتنا اپنا پن تھا۔ بولا آیا تو اسی ارادے سے تھا کہ اب کہیں نہ جاؤں گا۔ لیکن برادری نے میرے سبب سے تمہیں سیٹا کر دیا تو مجھ سے نہ سہا جائے گا۔ مجھ سے ان گنوار جاہلوں کا غرور برداشت نہ ہو گا۔ اسوقت مجھے جانے دو۔ جب موقع ملیگا درشن کرنے آیا کروں گا۔ تمہاری محبت دل سے نہیں مٹ سکتی، لیکن یہ غیر ممکن ہے کہ میں اس گھر میں رہوں۔ الگ کھانا کھاؤں الگ بیٹھ کر۔ اسلئے مجھے معاف کرنا۔

دیو کی گھر میں سے پانی لایا سادھو منہ ہاتھ دھونے لگا۔ شیو گوری نے ماں کا

اشارہ پایا۔ تو ڈرتے ڈرتے سادھو کے پاس گئی۔ سادھو نے ادب سے ڈنڈوت کی۔ سادھو نے پہلے ان دونوں کو تعجب سے دیکھا۔ پھر اپنی ماں کو مسکراتے دیکھ کر سمجھ گیا۔ دونوں لڑکوں کو چھاتی سے لگایا۔ اور تینوں بھائی بہن پریم سے ہنسنے کھیلنے لگے۔ ماں کھڑی یہ پاک نظارہ دیکھتی تھی اور اُمنگ سے پھولی نہ سماتی تھی۔

جل پان کر کے سادھو نے بائسکل سنبھالی اور ماں باپ کے سامنے سر جھکا کر چل کھڑا ہوا وہیں جہاں سے وہ بے زار ہو کر آیا تھا۔ اُسی دائرے میں جہاں سب بیگانے تھے۔ کوئی اپنا نہ تھا۔

دیوکی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور چاند رائے آنکھوں میں آنسو بھرے جگر میں ایک اینٹھن سی محسوس کرتا ہوا سوچتا تھا۔ ہائے! میرا لال یوں مجھ سے الگ ہوا جاتا ہے۔ ایسا لائق اور ہونہار لڑکا ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ اور صرف اسلئے کہ ہمارے خون اب سفید ہو گئے ہیں۔

صرف ایک آواز

(۱)

صبح کا وقت تھا۔ ٹھاکر درشن سنگھ کے گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ آج رات کو چندر گرہن ہونے والا تھا۔ ٹھاکر صاحب اپنی بوڑھی ٹھکرائن کے ساتھ گنگا جی جاتے تھے۔ اس لئے سارا گھر اُن کی پرشور تیاری میں مصروف تھا۔ ایک بہو اُن کا پھٹا کرتہ ٹانک رہی تھی۔ دوسری بہو اُن کی پگڑی لئے سوچتی تھی کہ کیونکر اس کی مرمت کروں۔ دونوں لڑکیاں ناشتہ تیار کرنے میں محو تھیں۔ جو زیادہ دلچسپ کام تھا۔ بچوں نے اپنی عادت کے موافق ایک کہرام مچا رکھا تھا۔ کیونکہ ہر ایک آنے جانے کے موقع پر اُن کا جوش گریہ امنگ پر ہوتا تھا۔ جانے کے وقت ساتھ جانے کیلئے روتے۔ آنے کے وقت اس لئے روتے کہ شیرینی کی تقسیم خاطر خواہ نہیں ہوئی۔ بوڑھی ٹھکرائن بچوں کو پھسلاتی تھیں اور اپنی بہوؤں کو سمجھاتی تھیں۔ دیکھو خبردار! جب تک اُگرہ نہ ہو جائے گھر سے باہر نہ نکلنا۔ ہنسیا، چھری کلہاڑی انہیں ہاتھ سے مت چھونا۔ سمجھائے دیتی ہوں۔ ماننا چاہے نہ ماننا تمہیں میری بات کی کون پرواہ ہے۔ منہ میں پانی کی بوند نہ پڑے۔ نارائن کے گھر بپت پڑی ہے۔ جو سادھو بھکاری دروازے پر آجائے اُسے پھیرنا مت بہوؤں نے سنا اور نہیں سنا۔ وہ منا رہی تھیں کہ کسطرح یہ یہاں سے ٹلیں پھاگن کا مہینہ ہے گانے کو ترس گئے۔ آج خوب گانا بجانا ہوگا۔

ٹھاکر صاحب تھے بوڑھے لیکن ضعف کا اثر دل تک نہیں پہنچا تھا۔

اس بات کا گھمنڈ تھا۔ کہ کوئی کمبھ بغیر گنگا اشنان کے نہیں چھوٹا۔ اُن کی علمی قابلیت حیرت انگیز تھی۔ صرف تیروں کو دیکھ کر مہینوں پہلے سورج گرہن اور دوسری تقریبوں کے دن بتا دیتے تھے۔ اسلئے گاؤں والوں کی نگاہ میں اُن کی عزت اگر پنڈتوں سے زیادہ نہ تھی۔ تو کم بھی نہ تھی۔ جوانی میں فوجی ملازمت کی تھی اُس کی گرمی اب تک باقی تھی مجال تھی کہ کوئی ان کی طرف ترچھی آنکھ سے دیکھ سکے۔ ہمت اور حوصلہ کے کاموں میں اب بھی پیشقدمی کر جاتے تھے کسی کام کو مشکل بتا دینا اُن کی ہمت کو تحریک دینا تھا۔ جہاں سب کی زبانیں بند ہو جائیں۔ وہاں وہ شیروں کی طرح گرجتے تھے جب گاؤں میں داروغہ جی تشریف لاتے۔ تو ٹھاکر صاحب ہی کا دل گردہ تھا۔ کہ اُن سے آنکھیں ملا کر دو دو بات کر سکیں جھگڑا پنڈت ہمیشہ اُن سے مُنہ چھپایا کرتے۔ غرض ٹھاکر صاحب کی حیثیت، رعونت اور اعتماد نفس اُنہیں ہر برات میں دولہا بننے پر مجبور کر دیتی تھی۔ ہاں کمزوری اتنی تھی کہ اپنی آلھا بھی آپ ہی گا لیتے اور مزے لے لے کر کیونکہ تصنیف کو مصنف ہی خوب بیان کرتا ہے۔

(۲)

جب دوپہر ہوتے ہوتے ٹھاکر اور جھگڑا اپنے گاؤں سے چلے تو سینکڑوں آدمی اُن کے ساتھ تھے اور جب سڑک پر پہنچے تو یاتریوں کا ایسا تانتا لگا ہوا تھا گویا کوئی بازار ہے ایسے بوڑھے لاٹھیاں ٹیکتے یا ڈولیوں پر سوار چلے جاتے تھے جنہیں تکلیف دینے کی ملک الموت نے بھی کوئی ضرورت نہ سمجھی تھی، اندھے دوسروں کی لکڑی کے سہارے قدم بڑھائے آتے تھے۔ بعض آدمیوں نے اپنی بوڑھی ماتاؤں کو پیٹھ پر لاد لیا تھا۔ کسی کے سر پر کپڑوں کا بقچہ، کسی کے کندھے پر لوٹا ڈور کسی کے کندھے پر کانوڑ۔ کتنے ہی آدمیوں نے پیروں پر چیتھڑے لپیٹ لئے تھے، جوتے کہاں سے لائیں۔ مگر مذہبی جوش کی یہ برکت تھی کہ من کسی کا میلا نہ تھا سب کے چہرے شگفتہ، باتیں کرتے سرگرم رفتار تھے۔ کچھ عورتیں گا رہی تھیں۔

چاند سورج دونوں لوک کے مالک۔ ایک وہ ناؤ اُنھوں یہ بہتی ہم جانی ہم ہی پر بہتی ایسا معلوم ہوتا تھا یہ آدمیوں کی ایک ندی تھی جو سینکڑوں چھوٹے چھوٹے نالوں اور دھاروں کو لیتی ہوئی سمندر سے ملنے کیلئے جا رہی تھی۔

جب یہ لوگ گنگا کے کنارے پہنچے تو سہ پہر کا وقت تھا۔ میلوں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ اس شاندار نظارہ سے دلوں پر رعب اور احترام کا ایسا رعب ہوتا تھا کہ بے اختیار "گنگا ماتا کی جے" کی صدائیں بلند ہو جاتی تھیں۔ لوگوں کے اعتقاد ندی کی طرح اُمڈے ہوئے تھے اور وہ ندی! وہ لہراتا ہوا نیل زار وہ تشنہ کاموں کی پیاس بجھانے والی۔ وہ نامرادوں کی آس وہ برکتوں کی دیوی۔ وہ پاکیزگی کا سرچشمہ وہ مشت خاک کو پناہ دینے والی گنگا ہنستی تھی مسکراتی اُچھلتی تھی کیا اس لئے کہ آج وہ اپنی عام عزت پر پھولی نہ سماتی تھی۔ یا اُس لئے کہ وہ اُچھل اُچھل کر اپنے پریمیوں سے گلے ملنا چاہتی تھی۔ جو اس کے درشنوں کیلئے منزلیں طے کر کے آئے تھے۔ اُس کے لباس کی تعریف کس زبان سے ہو جس پر آفتاب نے درخشاں تارے ٹانکے تھے جس کے کناروں کو اس کی کرنوں نے رنگ برنگ خوشنما اور متحرک پھولوں سے سجایا تھا۔

ابھی گرہن لگنے میں گھنٹوں کی دیر تھی۔ لوگ اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ کہیں مداریوں کے شعبدے تھے۔ کہیں چورن والے کی شعلہ بیانیوں کے معجز۔ کچھ لوگ مینڈھوں کی کشتی دیکھنے کیلئے جمع تھے ٹھاکر صاحب اپنے چند معتقدوں کے ساتھ سیر کو نکلے انہوں نے گوارا نہ کیا کہ ان عامیانہ دلچسپیوں میں شریک ہوں۔ یکایک انہیں ایک وسیع شامیانہ تنا ہوا نظر آیا جہاں زیادہ تر تعلیم یافتہ آدمیوں کا مجمع تھا۔ ٹھاکر صاحب نے اپنے ساتھیوں کو ایک کنارے پر کھڑا کر دیا اور خود ایک مغرورانہ انداز سے تاکتے ہوئے فرش پر جا بیٹھے کیونکہ اُنہیں یقین تھا کہ یہاں ان پر دیہاتیوں کی نگاہ رشک پڑے گی۔ اور ممکن ہے ایسے نکتے بھی معلوم ہو جائیں جو معتقدوں کو اُنکی ہمہ دانی کا یقین دلانے میں کام دے سکیں۔

یہ ایک اخلاقی جلسہ تھا دو ڈھائی ہزار آدمی بیٹھے ہوئے ایک شیریں بیان مقرر کی تقریر سُن رہے تھے۔ فیشن ایبل لوگ زیادہ تر اگلی صفوں میں جلوہ افروز تھے جنہیں سرگوشیوں کا اس سے بہتر موقعہ نہیں مل سکتا تھا۔ کتنے ہی خوش پوش حضرات اس لئے مکدر نظر آتے تھے کہ اُن کی بغل میں کمتر درجہ کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے تقریر بظاہر دلچسپ تھی۔ وزن زیادہ تھا۔ اور چٹخارے کم۔ اس لئے تالیاں نہیں بجتی تھیں۔

(۲)

حضرت واعظ نے دوران تقریر میں فرمایا۔

میرے پیارے دوستو! یہ ہمارا اور آپ کا فرض ہے۔ اس سے زیادہ اہم، زیادہ نتیجہ خیز اور قوم کے لئے زیادہ مبارک اور کوئی فرض نہیں ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ اُن کے عادات اور اخلاق کی حالت نہایت افسوسناک ہے مگر یقین مانئے یہ سب ہماری کرنی ہے ان کی اس شرمناک تمدنی حالت کا ذمہ دار ہمارے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ اب اس کے سوا اس کا اور کوئی علاج نہیں ہے کہ ہم اس نفرت اور حقارت کو جو اُنکی طرف سے ہمارے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے دھوئیں اور خوب مل کر دھوئیں۔ یہ آسان کام نہیں ہے جو سیاہی کئی ہزار برسوں سے جمی ہوئی ہے وہ آسانی سے نہیں مٹ سکتی۔ جن لوگوں کے سایہ سے ہم پرہیز کرتے آئے ہیں۔ جنہیں ہم نے حیوانوں سے بھی ذلیل سمجھ رکھا ہے اُن سے گلے ملنے میں ہم کو ایثار ہمت اور بے نفسی سے کام لینا پڑے گا۔ اس ایثار سے جو کرشن میں تھا اس ہمت سے جو رام میں تھی اس بے نفسی سے جو چیتنیہ اور گوبند میں تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ آج ہی اُن سے شادی کے رشتے جوڑیں، یا اُن کے نوالہ پیالہ میں شریک ہوں۔ مگر کیا یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ آپ اُن کے ساتھ عام ہمدردی عام انسانیت عام اخلاق سے پیش آئیں؟ کیا یہ واقعی غیر ممکن امر ہے آپ نے کبھی عیسائی مشنریوں کو دیکھا ہے آہ! جب میں ایک اعلٰے درجے کی حسین، نازک اندام سیمتن

لیڈی کو اپنی گود میں ایک سیہ فام بچّہ لئے ہوئے دیکھتا ہوں، جس کے بدن پر پھوڑے پڑے ہیں، خون ہے۔ اور غلاظت ہے، وہ نازنین اس بچے کو چومتی ہے، پیار کرتی ہے، چھاتی سے لگاتی ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس دیوی کے قدموں پر سر رکھ دوں۔ اپنا نیچا پن اپنی خودمائی۔ اپنی چھوٹی بڑائی، اپنی تنگ ظرفی مجھے کبھی اتنی صفائی سے نظر نہیں آتی۔ ان دیویوں کیلئے زندگی میں کیا کیا نعمتیں نہیں تھیں خوشیاں آغوش کھولے ہوئے اُن کی منتظر کھڑی تھیں اُن کیلئے دولت کی تن آسانیاں تھیں محبت کی پُر لطف دلاویزیاں تھیں۔ اپنے یگانوں اور عزیزوں کی ہمدردیاں تھیں اور اپنے پیارے وطن کی کشش تھی۔ لیکن ان دیویوں نے اُن تمام نعمتوں اور تمام دنیوی برکتوں کو خدمت سچّی بے غرض خدمت پر قربان کر دیا ہے۔ وہ ایسی ملکوتی قربانیاں کر سکتی ہیں کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اپنے اچھوت بھائیوں سے ہمدردی کا سلوک کر سکیں؟ کیا ہم واقعی ایسے پست ہمت ایسے بودے ایسے بے رحم ہیں؟ اسے خوب سمجھ لیجئے، کہ آپ اُنکے ساتھ کوئی رعایت کوئی مہربانی نہیں کر رہے ہیں۔ یہ اُن پر کوئی احسان نہیں ہے یہ آپ ہی کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے اس لئے میرے بھائیو اور دوستو! آیئے اس موقع پر شام کے وقت پوتر گنگا ندی کے کنارے کاشی کے پوتر استھان میں ہم مضبوط دل سے عہد کریں کہ آج سے ہم اچھوتوں کے ساتھ برادرانہ سلوک کرینگے اُن کی تقریبوں میں شریک ہوں گے۔ اور اپنی تقریبوں میں اُنہیں بلائیں گے اُن کے گلے ملیں گے اور اُنہیں اپنے گلے لگائیں گے اُن کی خوشیوں میں خوش اور اُن کے دردوں میں دردمند ہوں گے۔ اور چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے چاہے طعنہ و تضحیک اور تحقیر کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے ہم اس عہد پر قائم رہیں گے آپ میں صدہا پرجوش نوجوان ہیں جو بات کے دھنی اور ارادے کے مضبوط ہیں۔ کون یہ عہد کرتا ہے۔ کون اپنی اخلاقی دلیری کا ثبوت دیتا ہے؟ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو جائے اور للکار کر کہے کہ میں یہ پرتگیا کرتا ہوں اور مرتے دم تک اسی پر قایم اور ثابت قدم رہوں گا۔

( )

آفتاب گنگا کی گود میں جا بیٹھا تھا۔ اور ماں محبت اور غرور سے متوالی جوش سے اُمڈی ہوئی رنگ میں کیسر کو شرماتی اور چمک میں سونے کو لجاتی تھی۔ چاروں طرف ایک رعب افزا خاموشی چھائی تھی۔ اس سناٹے میں سنیاسی کی گرمی اور حرارت سے بھری ہوئی باتیں گنگا کی لہروں اور آسمان سے سر ٹکرانے والے مندروں میں سما گئیں۔ گنگا ایک متین مادرانہ مایوسی کے ساتھ ہنسی اور دیوتاؤں نے افسوس سے سر جھکا لیا۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔

سنیاسی کی صدائے بلند فضا میں جا کر غائب ہو گئی۔ مگر اس مجمع میں کسی شخص کے دل تک نہ پہنچی۔ وہاں قومی خدائیوں کی کمی نہ تھی۔ اسٹیجوں پر قومی تماشے کھیلنے والے کالجوں کے ہونہار نوجوان قوم کے نام پر مٹنے والے اخبار نویس۔ قومی جماعتوں کے ممبر سکریٹری اور پریسیڈنٹ۔ رام اور کرشن کے سامنے سر جھکانے والے سیٹھ اور ساہوکار قومی کالجوں کے عالی حوصلہ پروفیسر اور اخباروں میں قومی ترقیوں کی خبریں پڑھ کر خوش ہونے والے دفتروں کے کارکن، ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے۔ آنکھوں پر سنہری عینکیں لگائے فربہ اندام اور خوش وضع وکیلوں کی ایک پوری فوج آراستہ تھی۔ مگر سنیاسی کی اُس آتشیں تقریر پر ایک دل بھی نہ پگھلا۔ کیونکہ وہ پتھر کے دل تھے جن میں درد و گداز نہ تھا۔ جن میں خواہش تھی۔ مگر عمل نہ تھا۔ جن میں بچوں کی سی خواہش تھی مگر مردوں کا سا ارادہ نہ تھا۔

ساری مجلس پر سکوت کا عالم طاری تھا۔ ہر شخص سر جھکائے فکر میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔ ندامت کسی کو سر اُٹھانے نہ دیتی تھی اور آنکھیں خفت سے زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہی سر ہیں۔ جو قومی چرچوں پر اچھل پڑتے تھے۔ یہ وہی آنکھیں ہیں جو کسی وقت قومی غرور کی سُرخی سے لبریز ہو جاتی تھیں۔ مگر قول اور فعل میں آغاز اور انجام کا فرق ہے۔ ایک فرد کو بھی کھڑے ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ مقراض کی طرح چلنے والی زبانیں بھی ایسی عظیم الشان ذمہ داری کے خوف سے بند ہو گئیں۔

ٹھاکر درشن سنگھ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے اس نظارہ کو بہت غور اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے مذہبی عقائد پر چاہے راسخ ہوں یا نہ ہوں لیکن تمدنی معاملات میں وہ کبھی پیشقدمی کے خطادار نہیں ہوئے تھے۔ اس پیچیدہ اور وحشتناک راستے میں انہیں اپنی عقل و تمیز اور ادراک پر بھی بھروسہ نہیں ہوتا تھا یہاں منطق اور استدلال کو بھی اُن سے ہار ماننی پڑتی تھی اس میدان میں وہ اپنے گھر کی مستورات کی تعمیل کرنا ہی اپنا فرض سمجھتے تھے چاہے اُنہیں بذاتہ کسی معاملہ میں کچھ اعتراض بھی ہو۔ لیکن یہ نسوانی معاملہ تھا اور اسمیں وہ مداخلت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس سے خاندانی نظام میں شورش اور تلاطم پیدا ہو جانے کا زبردست احتمال رہتا تھا اگر کسی وقت اُن کے بعض سرگرم نوجوان دوست اس کمزوری پر انہیں آڑے ہاتھوں لیتے تو وہ بہت دانشمندی سے کہا کرتے تھے بھئی یہ عورتوں کے معاملے ہیں اُنکا جیسا دل چاہتا ہے کرتی ہیں۔ میں بولنے والا کون ہوں۔ غرض یہاں اُن کی قوتِ گرامی اُن کا ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔ یہ اُن کیلئے وادیٔ طلسم تھی۔ جہاں ہوش و حواس مسخ ہو جاتے تھے اور کورانہ تقلید کا پیر تسمہ پا گردن پر سوار ہو جاتا تھا۔

لیکن یہ للکار سن کر وہ اپنے تئیں قابو میں نہ رکھ سکے۔ یہی وہ موقع تھا جب اُن کی ہمتیں آسمان پر جا پہنچتی تھیں جس بیڑے کو کوئی نہ اُٹھائے اُسے اُٹھانا اُن کا کام تھا۔ امتناع سے اُنہیں روحانی مناسبت تھی۔ ایسے موقع پر وہ نتیجہ اور مصلحت سے بغاوت کر جاتے تھے اور اُن کے اس حوصلہ میں حرص شہرت کو اتنا دخل نہیں تھا جتنا اپنے فطری میلان کو۔ ورنہ یہ غیر ممکن تھا کہ ایک ایسے جلسے میں جہاں علم و تہذیب کی نمود تھی۔ جہاں طلائی عینکوں سے روشنی اور گوناگوں لباسوں سے فکرِ نازک کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ ایک دیہاتی کسان کو زبان کھولنے کا حوصلہ ہوتا۔ ٹھاکر نے اس نظارے کو غور اور دلچسپی سے دیکھا اُس کے پہلو میں گدگدی سی ہوئی زندہ دلی کا جوش رگوں میں دوڑا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور مردانہ لہجے میں للکار

کر بولا۔ میں یہ پرتگیا کرتا ہوں اور مرتے دم تک اُس پر قایم رہوں گا۔

(۶)

اتنا سننا تھا کہ دو ہزار آنکھیں انداز ترحم سے اُس کی طرف تاکنے لگیں۔ سبحان اللہ کیا وضع تھی۔ گاڑھے کی ڈھیلی مرزائی۔ گھٹنوں تک چڑھی ہوئی دھوتی۔ سر پر ایک گرانبار اُلجھا ہوا صافہ۔ کندھے پر چنوٹی اور تمباکو کا وزنی بٹوا۔ مگر بشرے سے متانت اور استقلال نمایاں تھا۔ غرور آنکھوں کے تنگ ظرف سے باہر نکلا پڑتا تھا اس کے دل میں اب اس شاندار مجمع کی عزت باقی نہ رہی تھی وہ پُرانے وقتوں کا آدمی تھا جو اگر پتھر کو پوجتا تھا تو اسی پتھر سے ڈرتا بھی تھا۔ جس کیلئے اکادشی برت محض حفظ صحت کی تدبیر اور گنگا محض صحت بخش پانی کا ذخیرہ نہ تھی۔ اُس کے عقیدے میں بیداری حزی نہ ہو۔ لیکن شکوک نہیں تھے۔ غرض اُس کا اخلاق پابند عمل تھا۔ اور اس کی بنیاد کچھ تقلید اور معاوضے پر تھی۔ مگر زیادہ تر خوف پر۔ جو نور عرفان کے بعد تہذیب نفس کی سب سے بڑی طاقت ہے گیروے بانے کی عزت و احترام کرنا اُس کے مذہب اور ایمان کا ایک جزو تھا۔ سنیاس میں اس کی رُوح کو اپنا فرماں گزار بنانے کی ایک زندہ طاقت چھپی ہوئی تھی۔ اور اس طاقت نے اپنا اثر دکھایا لیکن مجمع کی اس حیرت نے بہت جلد تمسخر کی صورت اختیار کی۔ پڑھنی لگا ہیں آپس میں کہنے لگیں آخر گنوار ہی تو ٹھہرا۔ دہقانی ہے۔ کبھی ایسی تقریریں کاہے کو سُنی ہوں گی۔ بس اُبل پڑا۔ او تھلے گڈھے میں اتنا پانی بھی نہ سما سکا۔ کون نہیں جانتا کہ ایسی تقریروں کا منشا تفریح ہوتا ہے۔ دس آدمی آئے۔ اکٹھے بیٹھے۔ کچھ سُنا کچھ گپ شپ ماری اور اپنے اپنے گھر لوٹے۔ نہ یہ کہ قول قرار کرنے بیٹھیں۔ عمل کرنے کیلئے قسمیں کھائیں۔

مگر مایوس اور دل گرفتہ سنیاسی سوچ رہا تھا۔ افسوس! جس ملک کی روشنی میں اتنا اندھیرا ہے۔ وہاں کبھی روشنی کا ظہور ہونا مشکل نظر آتا ہے اس روشنی پر اس اندھیری مُردہ اور بے جان روشنی پر میں جہالت کو ترجیح دیتا ہوں جہالت میں صفائی ہے اور ہمت ہے۔ اُس کے دل میں اور زبان میں پردہ نہیں ہوتا۔ نہ

قول اور فعل میں اختلاف کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ علم جہالت کے سر جھکائے۔ اس سارے مجمع میں صرف ایک شخص ہے جس کے پہلو میں مردوں کا دل ہے اور گو اُسے بیدار مغزی کا دعویٰ نہیں، لیکن میں اس کی جہالت پر ایسی ہزاروں بیدار مغزیوں کو قربان کر سکتا ہوں۔ تب وہ پلیٹ فارم سے نیچے اُترے اور درشن سنگھ کو گلے سے لگا کر کہا:

" ایشور تمہیں پرتگیا پر قائم رکھے "

انلصر

(۱)

ناگ پنچمی آئی۔ ساٹھے کے زندہ دِل نوجوانوں نے خوش رنگ جانگھئے بنوائے اکھاڑے میں ڈھول کی مردانہ صدائیں بلند ہوئیں۔ قریب و جوار کے زور آزما اکٹھے ہوئے اور اکھاڑے پر تمبولیوں نے اپنی دکانیں سجائیں۔ کیونکہ آج زور آزمائی اور دوستانہ مقابلے کا دِن ہے۔ عورتوں نے گوبر سے اپنے آنگن لیپے اور گاتی بجاتی کٹوروں میں دودھ چاول لئے ناگ پوجنے چلیں۔

ساٹھے اور پاٹھے دو ملحق موضع تھے۔ دونوں گنگا کے کنارے زراعت میں زیادہ مشقت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اسی لئے آپس میں فوجداریوں کی گرم بازاری تھی ازل سے اُن کے درمیان رقابت چلی آتی تھی۔ ساٹھے والوں کو یہ زعم تھا کہ اُنہوں نے پاٹھے والوں کو کبھی سر نہ اُٹھانے دیا۔ علیٰ ہذا پاٹھے والے اپنے رقیبوں کو زک دینا ہی زندگی کا مقدم کام سمجھتے تھے اُن کی تاریخ فتوحات کی روایتوں سے بھری ہوئی تھی پاٹھے کے چرواہے یہ گیت گاتے ہوئے چلتے تھے۔

ساٹھے والے کائر سگرے۔ پاٹھے والے ہیں سردار

اور ساٹھے کے دھوبی گاتے

ساٹھے والے ساٹھ ہاتھ کے۔ جن کے ہاتھ سدا تروار

اُن لوگن کے جنم نسائے جن پاٹھے مان لین اوتار

غرض رقابت کا یہ جوش بچوں میں ماں کے ساتھ داخل ہوتا تھا اور اس کے اظہار کا سب سے موزوں اور تاریخی موقع یہی ناگ پنچمی کا دن تھا۔ اس دن کیلئے سال بھر تیاریاں ہوتی رہتی تھیں آج اُن میں معرکے کی کشتی ہونے والی تھی۔ ساٹھے کو

کو گوپال پر ناز تھا۔ پاٹھے کو بلدیو کا غرّہ۔ دونوں سورما اپنے اپنے فریق کی دعائیں اور آرزوئیں لئے ہوئے اکھاڑے میں اُترے۔ تماشائیوں پر مرکزی کشش کا اثر ہوا۔ موضع کے کے چوکیداروں نے لٹھ اور ڈنڈوں کا یہ جمگھٹ دیکھا اور دونوں کی انگیٹھی کی طرح لال آنکھیں تو تجربہ سابقہ کی بنا پر بے پتہ ہو گئے۔ ادھر اکھاڑے میں داؤ پیچ ہوتے رہے بلدیو اُلجھتا تھا۔ گوپال پینترے بدلتا تھا۔ اُسے اپنی طاقت کا زعم تھا۔ اسے اپنے کرتب کا بھروسہ۔ تب یکایک بہت سے آدمی خوشی سے نعرے مار مار اُچھلنے لگے۔ کپڑے اور برتن اور پیسے اور بتاسے لٹائے جانے لگے کسی نے اپنا پرانا صافہ پھینکا کسی نے اپنی بوسیدہ ٹوپی ہوا میں اُڑا دی۔ ساٹھے کے منچلے جوان اکھاڑے میں پل پڑے اور گوپال کو گود میں اُٹھا لائے۔ بلدیو اور اسکے رقیبوں نے گوپال کو لہو کی آنکھوں سے دیکھا اور دانت پیس کر رہ گئے۔

(۲)

دس بجے رات کا وقت اور ساون کا مہینہ۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں تاریکی کا یہ عالم تھا۔ گویا روشنی کا وجود ہی نہیں رہا۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تھی۔ مگر تاریکی کو اور زیادہ تاریک کرنے کیلئے مینڈکوں کی آواز زندگی کا پتہ دیتی تھی۔ ورنہ چاروں طرف موت تھی۔ خاموش خوفناک اور متین ساٹھے کے جھونپڑے اور مکانات اس اندھیرے میں بہت غور سے دیکھنے پر کالی کالی بھیڑوں کی طرح نظر آتے تھے۔ نہ بچے روتے تھے نہ عورتیں گاتی تھیں۔ پیراتما پارسا رام نام بھی نہ جپتے تھے۔

مگر آبادی سے بہت دور کئی پر شور نالوں اور ڈھاک کے جنگلوں سے گذر کر جوار اور باجرے کے کھیت تھے۔ اور اُن کی مینڈوں پر ساٹھے کے کسان جا بجا منڈیا ڈالے ہوئے کھیتوں کی رکھوالی کر رہے تھے۔ تلے زمین اوپر تاریکی۔ میلوں تک سناٹا چھایا ہوا۔ کہیں جنگلی سوروں کے غول کہیں نیل گایوں کے ریوڑ۔ چلم کے سوا کوئی ساتھی نہیں آگ کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ ذرا کھٹکا ہوا اور چونک پڑے۔ تاریکی خوف کا دوسرا نام ہے۔ جب ایک مٹی کا ڈھیر ایک ٹھونٹھا درخت اور ایک تودہ گاہ بھی متحرک اور متجسّس

بن جاتے ہیں۔ تاریکی ان میں جان ڈال دیتی ہے۔ لیکن یہ مضبوط ہاتھوں والے مضبوط جگر والے مضبوط ارادے والے یکساں ہیں کہ یہ سب سختیاں جھیلتے ہیں۔ تاکہ اپنے زیادہ خوش نصیب بھائیوں کیلئے عیش اور تکلف کے سامان بہم پہنچائیں۔ انہیں رکھوالیوں میں آج کا ہیرو سیابھٹے کا مایۂ ناز گوپال بھی ہے۔ جو اپنی منیڈیا میں بیٹھا ہوا ہے اور نیند کو بھگانے کیلئے دھیمے سروں میں یہ نغمہ گا رہا ہے۔

میں تو توسے نینا لگائے پچھتائی رے

دفعتاً اسے کسی کے پاؤں میں آہٹ معلوم ہوئی۔ جیسے ہرن کتوں کی آواز کو کان لگا کر سنتا ہے۔ اسی طرح گوپال نے بھی کان لگا کر سنا۔ نیند کی غنودگی دور ہو گئی۔ لٹھ کندھے پر رکھا۔ اور منڈیا سے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ وہ باہر نکلا ہی تھا کہ اس کے سر پر لاٹھی کا بھرپور ہاتھ پڑا۔ وہ تیورا کر گرا۔ اور رات بھر وہیں بے سدھ پڑا رہا۔ معلوم نہیں اس پر کتنی چوٹیں پڑیں۔ حملہ آوروں نے تو اپنی دانست میں اس کا کام تمام کر ڈالا۔ لیکن حیات باقی تھی۔ یہ پابھٹے کے غیرتمند لوگ تھے۔ جنہوں نے اندھیرے کی آڑ میں اپنی ہار کا بدلہ لیا تھا۔

(۲)

گوپال ذات کا اہیر تھا۔ نہ پڑھا نہ لکھا۔ بالکل اکھڑ۔ دماغ روشن ہی نہیں ہوا۔ تو جسم کیوں گھلتی۔ پورے چھ فٹ کا قد۔ گٹھا ہوا بدن۔ للکار کر گاتا تو سننے والے میل بھر پر بیٹھے ہوئے اس کی تانوں کا مزہ لیتے۔ گانے بجانے کا عاشق۔ ہولی کے دنوں میں مہینہ بھر تک گاتا۔ ساون میں ملار اور بھجن تو روزمرہ کا شغل تھا۔ نڈر ایسا کہ بھوت اور پشاچ کے وجود پر اسے عالمانہ شکوک تھے۔ لیکن جس طرح شیر اور پلنگ بھی سرخ شعلوں سے ڈرتے ہیں۔ اسی طرح سرخ صافے سے اس کی روح لرزاں ہو جاتی تھی۔ اگرچہ سابھٹے کے ایک جوان ہمت سورما کیلئے یہ بے معنی خوف غیر معمولی بات تھی۔ لیکن اس کا کچھ بس نہ تھا۔ سپاہی کی وہ خوفناک تصویر جو بچپن میں اس کے دل پر کھینچی گئی تھی۔ نقش کالحجر بن گئی تھی۔ شرارتیں گئیں۔ بچپن گیا۔ مٹھائی کی بھوک گئی

لیکن سپاہی کی تقدیر ابھی تک قائم تھی۔ آج اُس کے دروازے پر سُرخ صافے والوں کی ایک فوج جمع تھی۔ لیکن گوپال زخموں سے چور درد سے بیتاب ہونے پر بھی اپنے مکان کے ایک تاریک گوشے میں چھپا ہوا بیٹھا تھا۔ نمبردار اور مکھیا، پٹواری اور چوکیدار مرعوب انداز سے کھڑے داروغہ کی خوشامد کر رہے تھے۔ کہیں اہیر کی داد فریاد سُنائی دیتی تھی۔ کہیں مودی کی گریہ وزاری۔ کہیں تیلی کی چیخ پکار۔ کہیں قصاب کی آنکھوں سے لہو جاری۔ کلار کھڑا اپنی قسمتوں کو رو رہا تھا۔ فحش اور مغلظات کی گرم بازاری تھی۔ داروغہ جی نہایت کار گزار افسر تھے گالیوں سے بات کرتے تھے۔ صبح کو چارپائی سے اُٹھتے ہی گالیوں کا وظیفہ پڑھتے۔ مہترنے آ کر فریاد کی۔ "حضور انڈے نہیں ہیں"۔

داروغہ جی ہنٹر لے کر دوڑے اور اس غریب کا بھرکس نکال دیا۔ سارے گاؤں میں ہلچل پڑی ہوئی تھی۔ کانسٹیبل اور چوکیدار راستوں پر یوں اکڑتے چلتے تھے گویا اپنی سسرال میں آئے ہیں۔ جب گاؤں کے سارے آدمی آ گئے تو داروغہ جی نے افسرانہ انداز تحکم سے فرمایا "موضع میں ایسی سنگین واردات ہوئی۔ اور اس بدقسمت گوپال نے رپٹ تک نہ کی"

مکھیا صاحب بید لرزاں کی طرح کانپتے ہوئے بولے۔ "حضور اب معافی دی جائے"

داروغہ جی نے غضبناک نگاہوں سے اسکی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ اس کی شرارت ہے۔ دُنیا جانتی ہے کہ اخفاء جرم ارتکاب جرم کے برابر ہے۔ میں اس بدمعاش کو اس کا مزہ چکھا دوں گا۔ وہ اپنی طاقت کے زعم میں پھولا ہوا ہے اور کوئی بات نہیں لات کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے"۔

مکھیا صاحب سر بسجود ہو کر بولے۔ "حضور اب معافی دی جائے"۔

داروغہ جی چیں بہ جبیں ہو گئے اور جھنجھلا کر بولے۔ "ارے حضور کے بچے! کچھ سٹھیا تو نہیں گیا ہے۔ اگر اسی طرح معافی دینی ہوتی۔ تو مجھے کیا کتے نے کاٹا تھا کہ یہاں تک دوڑا آتا۔ نہ کوئی معاملہ نہ معاملے کی بات۔ بس معافی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ مجھے زیادہ فرصت نہیں ہے۔ میں نماز پڑھتا ہوں جب تک تم اپنا صلاح مشورہ کر لو اور مجھے ہنسی خوشی رخصت کرو۔ ورنہ غوث خاں کو جانتے ہو۔ اُس کا مارا پانی بھی نہیں مانگتا"۔

داروغہ تقویٰ و طہارت کے بڑے پابند تھے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے اور تیسوں روزے رکھتے۔ عیدوں میں دھوم دھام سے قربانیاں ہوتیں۔ اس سے زیادہ حسن ارادات کسی انسان میں اور کیا ہو سکتا ہے۔

(۴)

مکھیا صاحب دبے پاؤں رازدارانہ انداز سے گورا کے پاس آئے اور بولے "یہ داروغہ بڑا کائیاں ہے۔ پچاس سے نیچے تو بات ہی نہیں کرتا۔ درجہ اول کا تھانیدار ہے میں نے بہت کہا۔ بیچارہ غریب آدمی ہے۔ گھر میں کچھ سُبھیتا نہیں۔ مگر وہ ایک نہیں سُنتا۔"

گورا نے گھونگھٹ میں مُنہ چھپا کر کہا "دادا ان کی جان بچ جائے کوئی طرح کی آنچ نہ آنے پائے روپے پیسے کی کون بات ہے اسی دن کیلئے تو کمایا جاتا ہے۔"

گوپال کھاٹ پر پڑا یہ سب باتیں سُن رہا تھا۔ اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ لکڑی گانٹھ ہی پر ٹوٹتی ہے۔ ناکردہ گناہ دیتا ہے۔ مگر کچلا نہیں جا سکتا۔ وہ جوش سے اُٹھ بیٹھا۔ اور بولا "پچاس روپیہ کی کون کہے میں پچاس کوڑیاں بھی نہ دوں گا۔ کوئی گدر (غدر) ہے۔ میں نے کسور (قصور) کیا کیا ہے۔"

مکھیا کا چہرہ فق ہو گیا۔ بزرگانہ لہجے میں بولے۔ رساں رساں (آہستہ آہستہ) بولو۔ کہیں سُن لے تو غضب ہو جائے۔

لیکن گوپال بپھرا ہوا تھا۔ اکڑ کر بولا "میں ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔ دیکھیں کون میرے پھانسی لگا دیتا ہے۔"

گورا نے ملامت آمیز لہجے میں کہا "اچھا جب میں تم سے پیسے مانگوں تو مت دینا۔ یہ کہکر گورا نے جو اس وقت لونڈی کے بجائے رانی بنی ہوئی تھی چھپر کے ایک کونے میں سے روپیوں کی ایک پوٹلی نکالی۔ اور مکھیا کے ہاتھ میں رکھ دی۔ گوپال دانت پیس کر اُٹھا۔ لیکن مکھیا صاحب فوراً سے پہلے سرک گئے۔ داروغہ جی نے گوپال کی بات سُن لی تھیں اور دعا کر رہے تھے۔ کہ اے خدا اس مردود شقی کی تالیف قلب کر آتنے میں مکھیا نے باہر آکر پچیس روپے کی پوٹلی دکھائی۔ پچیس راستے ہی میں غائب ہو گئے تھے

داروغہ جی نے خدا کا شکر کیا۔ دعا مستجاب ہوئی۔ روپیہ جیب میں رکھا اور رسد پہنچانے والوں کے انبوہ کثیر کو روتے اور بلبلاتے چھوڑ کر ہوا ہو گئے۔ مودی کا گلا گھٹ گیا۔ قصاب کے گلے پر چھری پھر گئی۔ تیلی پس گیا۔ مکھیا صاحب نے گوپال کی گردن پر احسان رکھا۔ گویا رسد کے دام گرہ سے دیئے۔ گاؤں میں سرخرو ہو گئے۔ وقار بڑھ گیا۔ ادھر گوپال نے گورا کی خوب خبر لی۔ گاؤں میں رات بھر یہی چرچا رہا۔ گوپال بہت بچا اور اس کا سہرا مکھیا کے سر تھا۔ بلائے عظیم آئی تھی۔ وہ ٹل گئی۔ پتروں نے دیوان ہردول نے نیم تلے والی دیبی نے تالاب کے کنارے والی ستی نے گوپال کی رکشا کی۔ یہ انہیں کا پرتاپ تھا دیوی کی پوجا ہونی ضروری تھی۔ ستیہ نارائن کی کتھا بھی لازمی ہو گئی۔

(۵)

پھر صبح ہوئی۔ لیکن گوپال کے دروازے پر آج سرخ پگڑیوں کے بجائے لال ساڑیوں کا جمگھٹ تھا۔ گورا آج دیوی کی پوجا کرنے جاتی تھی اور گاؤں کی عورتیں اس کا ساتھ دینے آئی تھیں۔ اس کا گھر سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ جو خس اور گلاب سے کم دلاویز نہ تھی۔ عورتیں سہانے گیت گا رہی تھیں۔ بچے خوش ہو ہو کر دوڑتے تھے۔ دیوی کے چبوترے پر اس نے مٹی کا ہاتھی چڑھایا۔ ستی کی مانگ میں سیندور ڈالا۔ دیوان صاحب کو بتاسے اور حلوہ کھلایا۔ ہنومان جی کو لڈو سے زیادہ رغبت ہے انہیں لڈو چڑھائے۔ تب گاتی بجاتی گھر کو آئی اور ستیہ نارائن کی کتھا کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مالن پھول کے ہار کیلے کی شاخیں اور بندھن واریں لائی۔ کمہار نئے نئے چراغ اور ہانڈیاں دے گیا۔ باری ہرے ڈھاک کے پتل اور دونے رکھ گیا۔ کہار نے آکر مٹکوں میں پانی بھرا۔ بڑھئی آکر گوپال اور گورا کے لئے دو نئی پیڑھیاں بنائیں۔ نائن نے آنگن لیپا اور چوک بنائی۔ دروازے پر بندھن واریں بندھ گئیں۔ آنگن میں کیلے کی شاخیں گڑ گئیں۔ پنڈت جی کے لئے سنگھاسن سج گیا۔ فرائض باہمی کا نظام خود بخود اپنے مقررہ دائرے پر چلنے لگا۔ یہی نظام تمدن ہے۔ جس نے دیہات کی زندگی کو تکلفات سے بے نیاز بنا رکھا ہے لیکن افسوس ہے کہ اب ادنےٰ اور اعلےٰ کی بے معنی اور بیہودہ قیود نے ان باہمی فرائض کو امداد

حسنہ کے رتبے سے ہٹا کر ان پر ذلّت اور نیچے پن کا داغ لگا دیا ہے۔

شام ہوئی۔ پنڈت موٹے رام جی نے کندھے پر جھولی ڈالی۔ ہاتھ میں سنکھ لیا اور کھڑاؤں پر کھٹ پٹ کرتے گوپال کے گھر آ پہنچے۔ آنگن میں ٹاٹ بچھا ہوا تھا گاؤں کے معززین کتھا سننے کیلئے آ بیٹھے۔ گھنٹی بجی۔ سنکھ پھونکا گیا اور کتھا شروع ہوئی۔ گوپال بھی گاڑھے کی چادر اوڑھے ایک کونے میں دیوار کے سہارے سے بیٹھا ہوا تھا۔ مکھیا۔ نمبردار اور پٹواری نے ازراہ ہمدردی اس سے کہا:۔

"ستیہ نارائن کی مہما تھی کہ تم پر کوئی آنچ نہ آئی۔"

گوپال نے انگڑائی لے کر کہا۔

"ستیہ نارائن کی مہما نہیں، یہ اندھیر ہے۔"

بانکا زمیندار

(۱)

ٹھاکر پردمن سنگھ ایک ممتاز وکیل تھے۔ اور اپنے حوصلہ و ہمت کے لئے سارے شہر میں مشہور۔ اُن کے اکثر احباب کہا کرتے کہ اجلاس عدالت میں انکے مردانہ کمالات زیادہ نمایاں طور پر ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ اسی کی برکت تھی کہ باوجود اس کے کہ انہیں شاذ ہی کبھی معاملہ میں سُرخروئی حاصل ہوتی تھی، اُن کے موکلوں کے حسن عقیدت میں ذرا بھر بھی فرق نہیں آتا تھا۔ صدر انصاف پر جلوہ فرما ہونے والے بزرگوں کی بے خوف آزادی پر کسی قسم کا شبہ کرنا کفر ہی کیوں نہ ہو، مگر شہر کے واقفکار لوگ علانیہ کہتے تھے کہ ٹھاکر صاحب جب کسی معاملے میں ضد پکڑ لیتے ہیں تو ان کا بدلا ہوا تیور اور تمتمایا ہوا چہرہ انصاف کو بھی اپنا تابع فرمان بنا لیتے ہیں۔ ایک سے زیادہ موقعوں پر اُن کے جیوٹ اور جگر نے وہ معجزے کر دکھائے تھے جہاں انصاف اور قانون نے جواب دے دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ٹھاکر صاحب مردانہ اوصاف کے سچے جوہر شناس تھے۔ اگر موکل کو فن زور آزمائی میں کچھ دستگاہ ہو تو یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ انکی خدمات حاصل کرنے کے لئے مال و زر کا منت کش بنے۔ اسی لئے ان کے یہاں شہر کے پہلوانوں اور پھکیتوں کا ہمیشہ جمگھٹا رہتا تھا اور یہی وہ زبردست، پُر تاثیر اور عملی نکتہ قانون تھا، جس کی تردید کیلئے میز انصاف کو بھی تامل ہوتا تھا۔ وہ غرور اور بیجے غیرت کی دل سے قدر کرتے تھے۔ ان کے بے تکلف کے آستانے بہت اونچے تھے۔ وہاں جھکنے کی ضرورت نہ تھی۔ انسان خوب سر اُٹھا کر جا سکتا تھا۔ یہ معتبر روایت ہے کہ ایک بار انہوں نے کسی مقدمہ کو

باوجود بہت منت و اصرار کے ہاتھ میں لینے سے انکار کیا۔ موکل گو اکھڑ دہقانی تھا۔ اُس نے جب منت سے کام نکلتے نہ دیکھا تو ہمت سے کام لیا۔ وکیل صاحب کرسی سے نیچے گر پڑے اور بپھرے ہوئے دہقانی کو سینے سے لگا لیا۔

(۲)

دولت کو زمین سے ازلی مناسبت ہے۔ زمین میں عام کشش کے سوا ایک خاص قوت ظاہر ہوتی ہے، جو ہمیشہ دولت کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ سود اور تمسک اور تجارت یہ دولت کی درمیانی منزلیں ہیں۔ زمین اس کی منزل مقصود ہے۔ ٹھاکر ریودمن سنگھ کی نگاہیں بہت عرصے سے ایک بہت زرخیز موضع پر لگی ہوئی تھیں لیکن بینک کا اکاؤنٹ کبھی حوصلہ کو قدم نہیں بڑھانے دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ اُسی موضع کا زمیندار ایک قتل کے معاملہ میں ماخوذ ہوا۔ اُس نے صرف رسم و رواج کے موافق ایک اسامی کو دن بھر دھوپ اور جیٹھ کی جلتی ہوئی دھوپ میں کھڑا رکھا تھا لیکن اگر آفتاب کی حرارت یا جسمانی کمزوری یا پیاس کی شدت اُس کی جان لیوا بن جائے، تو اس میں زمیندار کی کیا خطا تھی، یہ وکلائے شہر کی زیادتی تھی، کہ کوئی اس کی حمایت پر آمادہ نہ ہوا، یا ممکن ہے، زمیندار کی تہیدستی کو بھی اس میں کچھ دخل ہو۔ بہر حال اُس نے چاروں طرف سے ٹھوکریں کھا کر ٹھاکر صاحب کی پناہ لی۔ مقدمہ نہایت کمزور تھا۔ پولیس نے اپنی پوری طاقت سے دھاوا کیا تھا اور اس کی کمک کیلئے حکومت اور اختیار کے تازہ دم رسالے تیار تھے ٹھاکر صاحب آزمودہ کار سپہ سالار کی طرح سانپ کے ماند میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے لیکن اس موقع پر اُنہیں خشک مصلحت کے مقابلہ میں اپنی دعاؤں کا پلہ جھکتا ہوا نظر آیا۔ زمیندار کی تشفی کی اور وکالت نامہ داخل کر دیا۔ اور پھر ایسی جانفشانی سے مقدمہ کی پیروی کی۔ کچھ اس طرح جان لڑائی کہ میدان سے فتح و نصرت کے شادیانے بجاتے ہوئے نکلے۔ زبان خلق۔ اس فتح کا سہرا اُنکی قانونی دسترس کے سر نہیں اُنکے مردانہ اوصاف کے سر رکھتی ہے۔ ان دنوں وکیل صاحب نظائر و دفعات کی ہمت

شکن پیچیدگیوں میں اُلجھنے کے بجائے دنگل کی حوصلہ بخش دلچسپیوں میں زیادہ منہمک رہتے تھے۔ لیکن یہ مطلق قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ زیادہ واقفکار لوگ کہتے ہیں کہ انار کے بم گولوں اور سیب و انگور کی گولیوں نے پولیس کے اس حملۂ پرشور کو منتشر کر دیا۔ الغرض میدان ہمارے ٹھاکر صاحب کے ہاتھ رہا۔ زمیندار کی جان بھی موت کے منہ سے نکل آیا۔ پیروں پر گر پڑا۔ بولا ٹھاکر صاحب! میں اس قابل تو نہیں کہ آپکی خدمت کر سکوں۔ ایشور نے آپکو بہت کچھ دیا ہے لیکن کرشن بھگوان نے غریب سداما کے سوکھے چاول خوشی سے قبول کئے تھے۔ میرے پاس بزرگوں کی یادگار ایک چھوٹا ویرانہ موضع ہے۔ اُسے آپکی نذر کرتا ہوں۔ آپکے لائق تو نہیں لیکن میری خاطر اسے قبول کیجئے میں آپکا جس کبھی نہ بھولوں گا۔ وکیل صاحب پھڑک اُٹھے دو چار بار عارفانہ انکار کے بعد اس نذر کو قبول کر لیا۔ منہ مانگی مُراد بھر آئی۔

(۳)

اس موضع کے لوگ نہایت سرکش اور فتنہ پرداز تھے جنہیں اس بات کا فخر تھا کہ کبھی کوئی زمیندار انہیں پابند عنان نہیں کر سکا۔ لیکن جب انہوں نے اپنی باگ ڈور ریپودمن سنگھ کے ہاتھوں میں جاتے دیکھی تو چوکڑیاں بھول گئے۔ ایک بے لگام گھوڑے کی طرح سوار کو کنکھیوں سے دیکھا۔ کنوتیاں کھڑی کیں کچھ ہنہنائے اور تب گردنیں جھکا دیں۔ سمجھ گئے کہ یہ جگر کا مضبوط اور آسن کا پکا شہسوار ہے۔

اساڑھ کا مہینہ تھا کسان گہنے اور برتن بیچ بیچ کر بیلوں کی تلاش میں جا بجا دوڑا پھرتے تھے۔ گاؤں کی بوڑھی بنیائن نومی دُلہن بنی ہوئی تھی اور فاقہ کش چمار بارات کا دولہا تھا۔ مزدور موقع کے بادشاہ بنے ہوئے تھے۔ ٹپکتی ہوئی چھتیں ان کی نگاہِ کرم کی منتظر۔ گھاس سے ڈھکے ہوئے کھیت اُن کے دستِ شفقت کے محتاج۔ جسے چاہتے تھے بساتے تھے، جسے چاہتے اُجاڑتے تھے۔ آم اور جامن کے پیڑوں پر آٹھوں پہر نشانہ باز لڑکوں کا محاصرہ رہتا تھا۔ بوڑھے گردنوں میں جھولیاں لٹکائے پہر رات سے ٹپکے کی کھوج میں گھومتے نظر آتے تھے۔ جو باوجود دھرم اُپاسی

کے بچوں اور حباب سے زیادہ دلچسپ اور پُرمزہ شغل تھا۔ نالے پُرشور، ندیاں اُتھاہ چاروں طرف ہریالی اور سبزہ اور نزہت کا حسن لبسیط۔ انہیں دنوں ٹھاکر صاحب مرگ بے ہنگام کی طرح گاؤں میں آئے۔ ایک سجی ہوئی برات تھی۔ ہاتھی اور گھوڑے اور ساز و سامان۔ لٹھیتوں کا ایک رسالہ ساتھ۔ گاؤں کے لوگوں نے یہ طمطراق اور کرّ و فر دیکھا تو رہے سہے ہوش اُڑ گئے۔ گھوڑے کھیتوں میں اینڈنے لگے اور گنڈے گلیوں میں۔ شام کے وقت ٹھاکر صاحب نے اپنے اسامیوں کو بلایا اور تب بہ آواز بلند بولے، میں نے سنا ہے کہ تم لوگ بڑے سرکش ہو اور میری سرکشی کا حال تم کو معلوم ہی ہے۔ اب اینٹ اور پتھر کا سامنا ہے، بولو کیا منظور ہے۔

ایک بڑھے کسان نے بید لرزاں کی طرح کانپتے ہوئے جواب دیا، سرکار آپ ہمارے راجہ ہیں، ہم آپ سے اینٹھ کر کہاں جائیں گے۔

ٹھاکر صاحب تیور بدل کر بولے۔ "تو تم لوگ سب کے سب کل صبح تک تین سال کا پیشگی لگان داخل کر دو۔ اور خوب دھیان دے کر سن لو، کہ میں حکم کو دُہرانا نہیں جانتا۔ ورنہ میں گاؤں میں ہل چلوا دوں گا۔ اور گھروں کو کھیت بنوا دوں گا۔" سارے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ تین سال کا پیشگی لگان اور اتنی جلدی فراہم ہونا غیر ممکن تھا۔ رات اسی ہیص بیص میں کٹی۔ ابھی تک منت سماجت کی برقی تاثیر کی اُمید باقی تھی۔ صبح بہت انتظار کے بعد آئی تو قیامت بن کر آئی۔ ایک طرف تو جبر و تشدد اور ظلم و تحکم کے ہنگامے گرم تھے۔ دوسری طرف دیدۂ گریاں اور آہ سرد اور نالہ بیداد کے غریب کسان اپنے اپنے بقچے لادے بیکسانہ انداز سے تاکتے آنکھوں میں التجا ہوئی بچوں کو ساتھ لئے روتے بلکتے کسی نامعلوم دیار غربت کو چلے جاتے تھے۔ شام ہوئی تو گاؤں شہر خموشاں بنا ہوا تھا۔

یہ خبریں بہت جلد چاروں طرف پھیل گئیں۔ لوگوں کو ٹھاکر صاحب کے انسان ہونے پہ شکوک ہونے لگے۔ گاؤں ویران پڑا ہوا تھا۔ کون اُسے آباد کرے۔ کس

کے بچے اُس کی گلیوں میں کھیلیں، کس کی عورتیں کنوؤں پر پانی بھریں۔ راہ چلتے مسافر تباہی کا یہ نظارہ آنکھوں سے دیکھتے اور افسوس کرتے۔ نہیں معلوم بیچارے غربت زدوں پر کیا گزری آہ! جو محنت کی کمائی کھاتے۔ اور سر اُٹھا کر چلتے تھے۔ اب دوسروں کی غلامی کر رہے ہیں۔

اسی طرح ایک پورا سال گزر گیا۔ تب گاؤں کے نصیب جاگے۔ زمین زرخیز تھی مکانات موجود۔ رفتہ رفتہ ظلم کی یہ داستان پھیکی پڑ گئی۔ منچلے کسانوں کی ہولناک نگاہیں اُس پر پڑنے لگیں۔ بلا سے زمیندار ظالم ہے۔ جابر ہے، بے رحم ہے، ہم اُسے منا لیں گے۔ تین سال کی پیشگی لگان کا کیا ذکر۔ وہ جیسے خوش ہوگا۔ خوش کریں گے اُس کی گالیوں کو دُعا سمجھیں گے۔ اُس کے جوتے اپنے سر آنکھوں پر رکھیں گے۔ وہ راجہ ہیں، ہم ان کے چاکر ہیں۔ زندگی کی کشمکش اور جنگ میں خودداری اور عزت کو نباہنا کیسا مشکل کام ہے۔ دوسرا ساڑھ آیا۔ تو وہ گاؤں پھر وہی گلزار بنا ہوا تھا۔ بچے پھر اپنے دروازوں پر گھروندے بنانے لگے۔ مردوں کے بلند نغمے کھیتوں میں سنائی دیئے اور عورتوں کے سہانے گیت چکیوں پر زندگی کے دلفریب جلوے نظر آنے لگے۔

سال بھر اور گزرا۔ جب ربیع کی دوسری فصل آئی۔ تو سنہری بالوں کو کھیتوں میں لہراتے دیکھ کر کسانوں کے دل لہرانے لگتے تھے۔ سال بھر کی اُفتادہ زمین نے سونا اُگل دیا تھا۔ عورتیں خوش تھیں کہ اب کے نئے نئے گہنے بنوائیں گے۔ مرد خوش تھے۔ کہ اچھے اچھے بیل مول لیں گے۔ اور داروغہ جی کی مسرت کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب نے یہ خوش آیند خبریں سنیں اور دیہات کی سیر کو چلے وہی تزک و احتشام، وہی لٹھیتوں کا رسالہ، وہی گنڈوں کی فوج۔ گاؤں والوں نے اُن کی خاطر و تعظیم کی تیاریاں شروع کیں۔ موٹے تازے بکروں کا ایک پورا گلہ چوپال کے دروازے پر باندھا۔ لکڑی کے انبار لگا دیئے۔ دودھ کے حوض بھر دیئے۔ ٹھاکر صاحب گاؤں کے مینڈے پر پہنچے تو پورے ایکسو آدمی ان کی پیشوائی کے لئے

دست بستہ کھڑے تھے۔ لیکن پہلی چیز کی فرمائش جو ہوئی وہ لیمونیڈ اور برف
اسامیوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ یہ پانی کی بوتل اس وقت وہاں آبِ
حیات کے داموں بک سکتا تھا۔ مگر بے چارے دہقان! امیروں کے چونچلے کیا
جانیں۔ مجرموں کی طرح سر جھکائے دم بخود کھڑے تھے۔ چہرہ پر خفت اور ندامت تھی۔
ایشور! بات بگڑ گئی ہے۔ اب تمہیں سنبھالو۔ برف کی ٹھنڈک نہ ملی تو ٹھاکر صاحب
کے پیاس کی آگ اور بھی تیز ہو گئی کڑک کر بولے۔ میں شیطان نہیں ہوں۔ کہ بکریوں
کے خون سے پیاس بجھاؤں۔ مجھے ٹھنڈا برف چاہیئے۔ اور یہ پیاس تمہارے اور تمہاری
عورتوں کے آنسوؤں ہی سے بجھے گی۔ احسان فراموش، کم ظرف میں نے تمہیں زمین دیا
مکان دیئے حیثیت دی اور اس کا صلہ یہ ہے کہ میں کھڑا پانی کو ترستا رہوں۔ تم اس قابل نہیں
کہ تمہارے ساتھ رعایت کی جائے۔ کل شام تک میں تم میں سے کسی آدمی کی شکل اس
گاؤں میں نہ دیکھوں۔ ورنہ قہر ہو جائے گا۔ تم جانتے ہو کہ مجھے اپنا حکم دہرانے کی عادت
نہیں ہے۔ رات تمہاری ہے۔ جو کچھ لے جا سکو لے جاؤ۔ لیکن شام کو میں کسی کی منحوس
صورت نہ دیکھوں۔ رونا پیٹنا فضول ہے میرا دل پتھر ہے اور کلیجہ لوہے کا۔ آنسوؤں
سے نہیں پسیجتا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ دوسری رات کو سارے گاؤں میں کوئی دیا جلانے والا تک نہ رہا
پھولتا پھلتا ہوا گاؤں بھوت کا ڈیرا بن گیا۔

(۵)

عرصہ دراز تک یہ واقعہ قرب و جوار کے منچلے قصہ گویوں کیلئے دلچسپیوں کا ماخذ
بنا رہا۔ ایک صاحب نے اس پر اپنی طبع موزوں کی جولانیاں بھی دکھائیں۔ بے چارے
ٹھاکر صاحب ایسے بدنام ہوئے کہ گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ بہت کوشش کی کہ گاؤں
آباد ہو جائے۔ کس کی جان بھاری تھی کہ اس اندھیر نگری میں قدم رکھتا جہاں فوری
کی سزا پھانسی تھی۔ کچھ مزدور پیشہ لوگ قسمت کا جوا کھیلنے آئے مگر چند مہینوں سے
زیادہ نہ جم سکے۔ اجڑا ہوا گاؤں کھویا ہوا اعتبار ہے۔ جو بہت مشکل سے جمتا ہے۔

جب کوئی بس نہ چلا تو ٹھاکر صاحب نے مجبور ہو کر اراضی معاف کا عام اعلان کر دیا۔ لیکن اس رعایت نے رہی سہی ساکھ بھی کھو دی۔ تین سال گزر جانے کے بعد ایک روز وہاں بنجاروں کا قافلہ آیا۔ شام ہو گئی تھی۔ اور پورب طرف سے تاریکی کی لہر بڑھتی چلی آتی تھی۔ بنجاروں نے دیکھا سارا گاؤں ویران پڑا ہوا ہے۔ جہاں آدمیوں کے گھروں میں گدھ اور گیدڑ رہتے تھے۔ اس طلسم کا راز سمجھ میں نہ آیا۔ مکانات موجود زمین زرخیز سبزہ سے لہراتے ہوئے کھیت اور انسان کا نام نہیں، کوئی اور گاؤں قریب نہ تھا۔ وہیں فروکش ہو گئے۔ جب صبح ہوئی۔ بیلوں کے گلوں کی گھنٹیوں نے پھر اپنا نغمہ بیمین الاپنا شروع کیا۔ اور قافلہ گاؤں سے کچھ دور نکل گیا۔ تو ایک چرواہے نے جور و جبر کی یہ داستان طویل انہیں سنائی۔ سیر و سیاحت نے انہیں مشکلات کا عادی بنا دیا تھا۔ آپس میں کچھ مشورہ کیا اور فیصلہ ہو گیا ٹھاکر صاحب کے در دولت پر جا پہنچے اور نذرانے داخل کر دیئے۔ گاؤں پھر آباد ہو گیا۔

یہ بنجارے بلا کے جفاکش، آہنی ہمت اور ارادہ کے لوگ تھے جن کے آتے ہی گاؤں میں لکشمی کا راج ہو گیا۔ پھر گھروں میں سے دھوئیں کے بادل اٹھے، کولہواڑوں نے پھر دھانی چادریں زیب تن کیں، تلسی کے چبوترے پر پھر چراغ جلے رات کو رنگین طبع نوجوانوں کی الاپیں سنائی دینے لگیں، سبزہ زاروں میں پھر مویشیوں کے گلے دکھائی دیئے کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے چرواہے کی بانسری کی مدھم اور رسیلی صدا، درد اور اثر میں ڈوبی ہوئی اس قدرتی منظر میں جادو کی کشش پیدا کرنے لگی۔

بھادوں کا مہینہ تھا، کپاس کے پھولوں کی سرخ و سفید ملاحت، تل کی اودی بہار اور سن کی شوخ زردی کھیتوں میں اپنے بوقلموں حسن کے جلوے دکھاتی تھی۔ کسانوں کی منڈھیوں اور چھپروں پر بھی گل و ثمر کی رنگ آمیزیاں نظر آتی تھیں اس پر پانی کی ہلکی ہلکی پھواریں حسن قدرت کیلئے مشاطہ کا کام دے رہی تھیں جس طرح عارفوں کے دل نور حقیقت سے لبریز ہوتے ہیں، اسی طرح ساگر اور تالاب شفاف پانی سے لبریز تھے۔ شاید راجہ اندر کیلاش کی طراوت بخش بلندیوں سے اتر کر اب میدانوں میں آ گئے

تھے۔ اسی لئے سیر چشم قدرت نے حسن اور برکت اور امید کے توشے خانے کھول دیئے تھے۔
وکیل صاحب کو بھی تمنائے سیر نے گدگدایا۔ حسب معمول اپنے رئیسانہ کروفر کے ساتھ گاؤں میں آ پہنچے۔ دیکھا تو قناعت اور فراغت کی برکتیں چاروں طرف نمودار تھیں۔

(۶)

گاؤں والوں نے انکی تشریف آوری کی خبر سنی۔ سلام کو حاضر ہوئے۔ وکیل صاحب نے انہیں اچھے کپڑے پہنے خودداری کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ ان سے بہت خندہ پیشانی سے ملے فصل کی کیفیت پوچھی بوڑھے ہرداس نے ایک ایسے لہجے میں جس سے کامل ذمہ داری اور امامت کی شان ٹپکتی تھی جواب دیا۔ حضور کے قدموں کی برکت سے سب چین ہے کوئی تکلیف نہیں آپکی دی ہوئی نعمت کھاتے ہیں آپ کا جس گاتے ہیں۔ ہمارے راجہ اور سرکار جو کچھ ہیں آپ ہیں اور آپ کیلئے جان تک حاضر ہے۔

ٹھاکر صاحب نے تیور بدل کر کہا۔ میں اپنی خوشامد سننے کا عادی نہیں ہوں بوڑھے ہرداس کی پیشانی پر بل پڑے۔ غرور کو چوٹ لگی بولا مجھے بھی خوشامد کرنے کی عادت نہیں ہے

ٹھاکر صاحب نے اینٹھ کر جواب دیا۔ تمہیں رئیسوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں طاقت کیطرح تمہاری عقل بھی بڑھاپے کے نذر ہو گئی۔

ہرداس نے اپنے ساتھیوں کیطرف دیکھا۔ غصہ کی حرارت سے سب کی آنکھیں پھیلی اور استقلال کی سردی سے ماتھے سکڑے ہوئے تھے۔ بولا۔ ہم آپ کی رعیت ہیں۔ لیکن ہم کو اپنی آبرو پیاری ہے۔ اور چاہے اپنے زمیندار کو اپنا سر دے دیں آبرو نہیں دے سکتے۔

ہرداس کے کئی منچلے ساتھیوں نے بلند آواز میں تائید کی۔ آبرو جان کے پیچھے ہے۔ ٹھاکر صاحب کے غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ زور سے بولے! تم لوگ زبان سنبھال کر باتیں کرو۔ ورنہ جس طرح گلے میں جھولیاں لٹکائے آئے تھے اسیطرح نکال دیئے جاؤ گے۔ میں رپودمن سنگھ ہوں۔ جس نے تم جیسے کتنے ہی ہیکڑوں کو اسی جگہ پیروں سے کچلوا ڈالا ہے۔ یہ کہکر انہوں نے اپنے رسالے کے سردار

ارجن سنگھ کو بلا کر کہا۔ ٹھاکر! اب ان چیونٹیوں کے پر نکل آئے ہیں، کل شام تک ان حشرات سے میرا گاؤں پاک و صاف ہو جائے۔

ہرداس کھڑا ہو گیا۔ غصہ اب چنگاری بن کر آنکھوں سے نکل رہا تھا۔ بولا، ہم نے اس گاؤں کو چھوڑنے کیلئے نہیں بسایا ہے جب تک جئیں گے اسی گاؤں میں رہیں گے، یہیں پیدا ہوں گے اور یہیں مریں گے۔ آپ بڑے آدمی ہیں اور بڑوں کی سمجھ بھی بڑی ہوتی ہے۔ ہم لوگ اکھڑ گنوار ہیں، ناحق غریبوں کے جان کے پیچھے نہ پڑیئے۔ خون خرابہ ہو جائے گا۔ لیکن آپکو یہی منظور ہے تو ہماری طرف سے بھی آپ کے سپاہیوں کو چنوتی ہے، جب چاہیں دل کے ارمان نکال لیں۔

اتنا کہکر ٹھاکر صاحب کو سلام کیا اور چل دیا۔ اس کے پیچھے اس کے ساتھی بھی انداز پُر غرور کے ساتھ اکڑتے ہوئے چلے۔ ارجن سنگھ نے ان کے تیور دیکھے سمجھ گیا کہ یہ لوہے کے چنے ہیں، لیکن شہدوں کا سرغنہ تھا۔ کچھ اپنے نام کی لاج تھی۔ دوسرے دن شام کے وقت جب رات اور دن میں مٹ بھیڑ ہو رہی تھی، ان دونوں جماعتوں کا سامنا ہوا۔ پھر وہ دھول دھپا ہوا کہ زمین تھرا گئی۔ زبانوں نے منہ کے اندر وہ حشر دکھائے کہ آفتاب مارے خوف کے پچھم میں جا چھپا۔ تب لاٹھیوں نے سر اٹھایا لیکن قبل اس کے کہ وہ ٹھاکر صاحب کی دعا اور شکریہ کی مستحق ہوں، ارجن سنگھ نے دانشمندی سے کام لیا۔ تاہم ان کے چند آدمیوں کے لئے گڑ اور ہلدی پینے کے سامان ہو چکے تھے۔

وکیل صاحب نے اپنی فوج کی یہ حالت زار دیکھی۔ کسی کے کپڑے پھٹے ہوئے، کسی کے جسم پر گرد جمی ہوئی۔ کوئی ہانپتے ہانپتے بیدم، خون بہت کم نظر آیا۔ کیونکہ یہ ایک بے بہا جنس ہے اور اسے ڈنڈوں کی زد سے بچا لیا گیا تھا تو انہوں نے ارجن سنگھ کی پیٹھ ٹھونکی اور ان کی شجاعت و جانبازی کی خوب داد دی۔ رات کو ان کے سامنے لڈو اور امرتیوں کی ایسی بارش ہوئی کہ یہ سب گرد و غبار دھل گیا۔ صبح کو اس رسالہ نے ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کی راہ لی۔ اور قسم کھا گئے کہ اب بھول کر

بھی اس گاؤں کا رُخ نہ کریں گے۔

تب ٹھاکر صاحب نے گاؤں کے آدمیوں کو چوپال میں طلب کیا۔ اُن کے اشارہ کی دیر تھی، سب لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اختیار اور حکومت اگر مسندِ غرور سے اُتر آئے تو دشمنوں کو بھی دوست بنا سکتی ہے۔ جب سب آدمی آگئے، تو ٹھاکر صاحب ایک ایک کر کے اُن سے بغل گیر ہوئے۔ اور کہا، میں ایشور کا بہت مشکور ہوں۔ کہ مجھے اس گاؤں کے لئے جن آدمیوں کی تلاش تھی، وہ لوگ مل گئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ گاؤں کئی بار اُجڑا اور کئی بار بسا۔ اس کا سبب یہی تھا، وہ لوگ میرے معیار پر پورے نہ اُترے تھے۔ میں اُن کا دشمن نہیں تھا۔ لیکن میری دلی آرزو یہ تھی کہ اس گاؤں میں وہ لوگ آباد ہوں۔ جو ظلم و ستم کا مردوں کی طرح سامنا کریں۔ جو اپنے حقوق اور رعائتوں کو مردوں کی طرح حفاظت کریں۔ جو حکومت کے غلام نہ ہوں۔ جو رعب اور اختیار کی نگاہ تیز دیکھ کر بچوں کی طرح خوف سے سہم نہ جائیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ بہت نقصان اور ندامت اور بدنامی کے بعد میری تمنائیں پوری ہو گئی ہیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ آپ نا موافق ہواؤں اور متلاطم موجوں کا کامیابی سے مقابلہ کریں گے۔ میں آج اس گاؤں سے دست بردار ہوتا ہوں۔ آج سے یہ آپ کی ملکیت ہے۔ آپ ہی اس کے زمیندار اور مختار ہیں۔ ایشور سے میری یہی دُعا ہے کہ آپ پھولیں پھلیں اور سرسبز ہوں۔

ان الفاظ نے دلوں پر تسخیر کا کام کیا۔ لوگ آقا پرستی کے جوش سے مست ہو ہو کر ٹھاکر صاحب کے پیروں سے لپٹ گئے اور کہنے لگے۔ ہم آپ کے قدموں سے جیتے جی جُدا نہ ہوں گے۔ آپ کا سا مربی اور قدر دان اور رعایا پرور بزرگ ہم کہاں پائیں گے۔ جانبازانہ عقیدت اور ہمدردی، وفاداری اور احسان کا ایک بڑا دردناک اور موثر نظارہ آنکھوں کے سامنے پیش ہو گیا۔ لیکن ٹھاکر صاحب اپنے فیاضانہ ارادہ پر ثابت قدم رہے۔ اور گو پچاس سال سے زیادہ گزر گئے ہیں، لیکن ابھی

بنجاروں کے ورثا ابھی تک موضع صاحب گنج کے معافی دار ہیں۔ عورتیں ابھی تک ٹھاکر ریودمن سنگھ کی پوجا اور منتیں کرتی ہیں۔ اور گو اب اس موضع کے کئی نوجوان دولت اور حکومت کی بلندیوں پر پہنچ گئے ہیں۔ لیکن بوڑھے اور اکھڑ ہری داس کے نام پر اب بھی فخر کرتے ہیں اور بھادوں سدی اکادشی کے دن اب بھی اس مبارک فتح کی یادگار میں جشن منائے جاتے ہیں۔

تریا چرتر

(۱)

سیٹھ مگن داس جی کا نخلِ حیات بے ثمر تھا۔ کوئی ایسی انسانی روحانی یا طبی کوشش نہ تھی، جو انہوں نے نہ کی ہو۔ یوں شادی میں مسئلہ توحید کے قائل تھے مگر ضرورت اور اصرار سے مجبور ہو کر ایک دو نہیں، پانچ شادیاں کیں، یہاں تک کہ عمر کے چالیس سال گزر گئے۔ اور خانہ تاریک روشن نہ ہوا۔ بے چارے بہت رنجیدہ رہتے۔ یہ مال و زر یہ کروفر یہ امیرانہ اہتمام یہ تزک احتشام کیا ہوں گے۔ میرے بعد ان کا کیا حشر ہوگا۔ کون ان سے حظ اٹھائے گا۔ یہ خیال بہت افسوسناک تھا۔ آخر یہ صلاح ہوئی کہ کسی لڑکے کو گود لینا چاہیئے، مگر یہ مسئلہ خاندانی نزاعات کے باعث کئی سالوں تک معرض التوا میں رہا۔ جب سیٹھ جی نے دیکھا کہ بیویوں میں اب تک بدستور کشمکش ہو رہی ہے تو انہوں نے اخلاقی جرأت سے کام لیا، اور ایک ہونہار یتیم لڑکے کو گود لے لیا۔ اس کا نام رکھا گیا مگن داس۔ اس کا سن پانچ چھ سال سے زائد نہ تھا۔ بلا کا ذہین اور باتمیز، مگر عورتیں سب کچھ کر سکتی ہیں۔ دوسرے کے بچے کو اپنا نہیں سمجھ سکتیں۔ یہاں تو پانچ عورتوں کا جتھا تھا اگر ایک اسے پیار کرتی، تو باقی چار عورتوں کا فرض تھا کہ اس سے نفرت کریں۔ ہاں سیٹھ جی اس کے ساتھ بالکل اپنے لڑکے کی سی محبت کرتے تھے، پڑھانے کو ماسٹر رکھے سواری کیلئے گھوڑے۔ رئیسانہ خیال کے آدمی تھے راگ رنگ کا سامان بھی مہیا تھا گانا سیکھنے کا لڑکے نے شوق کیا تو اس کا بھی انتظام ہو گیا۔ غرض جب مگن داس سن شباب کو پہنچا تو رئیسانہ مشاغل میں اسے درجۂ کمال حاصل تھا۔ اس کا گانا سن کر استاد

رنگ کا نوں پر ہاتھ رکھتے۔ شہسوار ایسا کہ دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو جاتا قد و قامت میں شکل و شباہت میں اُس کا سا البیلا جوان دہلی میں کم ہوگا۔ شادی کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ناگپور کے کروڑپتی سیٹھ مکھن لال بہت ہرائے ہوئے تھے ان کی لڑکی سے شادی ہو گئی۔ دھوم دھام کا ذکر کیا جائے تو قصہ شب ہجر سے بھی طول ہو جائے مکھن لال کا اُسی شادی میں دیوالہ نکل گیا۔ اسوقت مگن داس سے زیادہ قابل رشک آدمی اور کون ہوگا؟ اُسکی زندگی کی بہار اُمنگوں پر تھی اور مُرادوں کے پھول اپنی شبنمی تازگی میں کھل کھل کر حسن اور شگفتگی کا سماں دکھا رہے تھے۔ مگر تقدیر کی دیوی کچھ اور ہی سامان کر رہی تھی۔ وہ سیر و سیاحت کے ارادہ سے جاپان گیا ہوا تھا کہ دہلی سے خبر آئی کہ "ایشور نے تمہیں ایک بھائی دیا ہے۔ مجھے اتنی خوشی ہے کہ زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہ سکوں۔ تم بہت جلد لوٹ آؤ۔"

مگن داس کے ہاتھ سے تار کا کاغذ چھوٹ گیا۔ اور سر میں ایسا چکر آیا کہ گویا کسی بلندی سے گر پڑا ہے۔

(۲)

مگن داس کی کتابی واقفیت بہت کم تھی۔ مگر طبعی شرافت سے وہ خالی نہ تھا ہاتھوں کی فیاضی نے جو فراغت کی برکت ہے۔ دل کو بھی فیاض بنا دیا تھا اُسے اتفاقات کی اس کایا پلٹ سے صدمہ تو ضرور ہوا۔ آخر انسان ہی تھا۔ مگر اُس نے استقلال سے کام لیا۔ اور ایک اُمید و بیم کی حالت میں وطن کو روانہ ہوا۔ رات کا وقت تھا جب اپنے دروازے پر پہنچا۔ تو بزم نشاط آراستہ دیکھی اُس کے قدم آگے نہ بڑھے لوٹ پڑا۔ اور ایک دُکان کے چبوترے پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ اتنا تو اُسے یقین تھا کہ سیٹھ جی اُس کیساتھ اُسی اخلاق اور محبت سے پیش آئیں گے بلکہ شاید اب اور بھی عنایت کرنے لگیں۔ سیٹھانیاں بھی اب اُس کے ساتھ مغائرت کا برتاؤ نہ کریں گی ممکن ہے منجھلی بہو جو اس بچے کی خوش نصیب ماں تھیں اُس سے محترز رہیں مگر باقی چاروں کی جانب سے خاطر و مدارت میں کوئی شک نہیں تھا۔ ان کے حسد سے وہ نا بلد

اُٹھا سکتا تھا، تاہم اُس کی غیرت نے گوارا نہ کیا۔ کہ جس گھر میں آقا کی حیثیت سے رہتا تھا۔ اُسی گھر میں اب ایک دست نگر کی حیثیت سے زندگی بسر کرے اُس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ اب یہاں رہنا نامناسب ہے نہ مصلحت مگر جاؤں کہاں؟ نہ کوئی ایسا فن سیکھا نہ کوئی علم حاصل کیا جس سے کسب معاش کی صورت پیدا ہوتی۔ رئیسانہ مشاغل اسی وقت تک قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ جب تک کہ وہ رئیسوں کے زیور کمال رہیں۔ ذریعہ معاش بن کر وہ پایۂ عزت سے گر جاتے ہیں۔ اپنی مزدوری حاصل کرنا تو اُس کے لئے کوئی ایسا مشکل کام نہ تھا۔ کسی سیٹھ ساہوکار کے یہاں منیب بن سکتا تھا۔ کسی کارخانہ کی طرف سے ایجنٹ ہو سکتا تھا۔ مگر اُس کے کندھے پر ایک بھاری جوا رکھا ہوا تھا۔ اُسے کیا کرے، ایک بڑے سیٹھ کی لڑکی جس نے نازو نعمت میں پرورش پائی۔ اُس سے یہ بے نوائی کی تکلیفیں کیونکر جھیل جائیں گی۔ کیا مکھن لال کی لاڈلی بیٹی ایک ایسے شخص کے ساتھ رہنا پسند کرے گی جسے نان شبینہ کا بھی ٹھکانا نہیں مگر اس فکر میں اپنی جان کیوں کھپاؤں۔

میں نے اپنی مرضی سے شادی نہیں کی۔ میں برابر انکار کرتا رہا۔ سیٹھ جی نے زبردستی میرے پیروں میں بیڑی ڈالی ہے۔ اب وہی اسکے ذمہ دار ہیں۔ مجھ سے کوئی واسطہ نہیں لیکن جب اُس نے دوبارہ ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور کیا تو مفر کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ بالآخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے ناگپور چلوں۔ ذرا اُن مہارانی کے طور طریق کو دیکھوں۔ باہر ہی باہر اُن کے مزاج اور خواص کی جانچ کروں اُس وقت طے کروں گا۔ کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اگر ریاست کی بو اُن کے دماغ سے نکل گئی ہے اور میرے ساتھ روکھی روٹیاں انہیں کھانا منظور ہیں تو ازیں چہ بہتر لیکن اگر وہ امیرانہ تکلفات کی دلدادہ ہیں تو میرے لئے راستہ صاف ہے۔ پھر میں ہوں اور غم دنیا۔ ایسی جگہ جاؤں جہاں کسی آشنا کی صورت خواب میں بھی نہ دکھائی دے۔ افلاس کی ذلت ذلت نہیں رہتی۔ اگر اجنبیوں میں زندگی بسر کی جائے یہ ہم چشموں کی کنکھیاں اور سرگوشیاں ہیں۔ جو افلاس کو عذاب بنا دیتی ہیں۔ یوں دل میں زندگی کا نقشہ بنا کر

مگن داس اپنی ہمت مردانہ کے بھروسہ پر ناگپور کی طرف چلا۔ اس ملاح کی طرح جو بغیر کشتی یا بادبان کے دریا کی اُٹھتی ہوئی لہروں میں اپنے تئیں ڈالدے۔

(۴)

شام کے وقت سیٹھ مکھن لال کے پُر فضا باغ میں سورج کی زرد کرنیں مرجھائے ہوئے پھولوں سے گلے مل کر رخصت ہو رہی تھیں۔ باغ کے وسط میں ایک پختہ کنواں تھا اور ایک مولسری کا درخت۔ کنوئیں کے منہ پر تاریکی کی نیلگوں نقاب تھی درخت کے سر پر روشنی کی سنہری چادر۔ اسی درخت کے نیچے ایک بوڑھی مالن بیٹھی ہوئی پھولوں کے ہار اور گجرے گوندھ رہی تھی۔ اتنے میں ایک نوجوان تھکا ماندہ کنوئیں پر آیا اور لوٹے سے پانی بھر کر پینے کے بعد جگت پر بیٹھ گیا۔ مالن نے پوچھا۔ کہاں جاؤگے؟

مگن داس نے جواب دیا کہ "جانا تو تھا بہت دور۔ مگر یہیں رات ہو گئی یہاں کہیں ٹھہرنے کا ٹھکانہ مل جائے گا؟"

مالن:۔ چلے جاؤ سیٹھ جی کے دھرم سالے میں، بڑے آرام کی جگہ ہے۔

مگن داس:۔ دھرم سالے میں تو مجھے ٹھہرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ کوئی ہرج نہ ہو تو یہیں پڑ رہوں۔ یہاں کوئی رات کو رہتا ہے؟

مالن:۔ بھائی میں یہاں ٹھہرنے کو نہ کہوں گی یہ جو ہوئی بائی جی کی بیٹھک ہے جھروکے میں بیٹھ کر سیر کیا کرتی ہیں کہیں دیکھ پائیں تو میرے گھر میں ایک بال بھی نہ رہنے دیں۔

مگن داس:۔ بائی جی کون؟

مالن:۔ یہی سیٹھ جی کی بیٹی اندرا بائی۔

مگن داس:۔ یہ گجرے تم انہیں کے لئے بنا رہی ہو کیا؟

مالن:۔ اور سیٹھ جی کے یہاں ہے ہی کون؟ پھولوں کے گہنے بہت پسند کرتی ہیں

مگن داس:۔ شوقین عورت معلوم ہوتی ہیں؟

مالن:۔ بھائی یہ تو بڑے آدمیوں کی باتیں ہیں۔ وہ شوق نہ کریں تو ہمارا نباہ کیسے ہو۔ اور دھن ہے کس لئے۔ اکیلی جان پر دس لونڈیاں ہیں سنا کرتی تھی کہ بھاگوان

پریم پچیسی حصہ دوم

آدمی کیا ہیں بھوت ہوتے ہیں۔ وہ آنکھوں دیکھا، آپ ہی آپ پنکھا چلنے لگے، آپ ہی آپ سارے گھر میں دن کا سا اجالا ہو جائے۔ تم جھوٹ سمجھتے ہو گے، مگر میں آنکھوں کی دیکھی بات کہتی ہوں۔

اس احساس فضیلت کے ساتھ جو کسی بے علم آدمی کے سامنے اپنی معلومات کے بیان کرنے میں ہوتا ہے۔ بڑھیا مالن اپنی ہمہ دانی کا اظہار کرنے لگی۔ مگن داس نے اُکسایا "ہوگا بھائی بڑے آدمیوں کی باتیں نرالی ہوتی ہیں، لکشمی کے بس میں سب کچھ ہے مگر اکیلی جان پر دس لونڈیاں؟ سمجھ میں نہیں آتا۔"

مالن نے بگڑ کر چڑچڑے پن سے جواب دیا "تمہاری سمجھ موٹی ہو تو کوئی کیا کرے۔ کوئی پان لگاتی ہے، کوئی پنکھا جھلتی ہے، کوئی کپڑے پہناتی ہے، دو ہزار روپیہ میں تو شیشہ گاڑی آئی تھی، چاہو تو منہ دیکھ لو۔ اس پر ہوا کھانے جاتی ہیں۔ ایک بنگالن گانا بجانا سکھاتی ہے، میم پڑھانے آتی ہے، شاستری جی سنسکرت پڑھاتے ہیں، کاگد پر ایسی صورت بناتی ہے کہ اب بولی اور اب بولی۔ بے چاری کے بھاگ پھوٹ گئے۔ دلی کے سیٹھ لگن داس کے بالک لڑکے سے بیاہ ہوا تھا۔ رام کی لیلا ستر برس کے مردے کو لڑکا دیا، کون پتیائے گا۔ جب سے یہ سناؤنی آئی ہے تب سے بہت اُداس رہتی ہے۔ ایک دن روتی تھیں، باپ نے دیکھ لیا، سمجھانے لگے۔ لڑکی کو بہت چاہتے ہیں۔ سنتی ہوں داماد کو یہیں بلا کر رکھیں گے۔ نارائن کرے میری رانی دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ مالی مر گیا تھا، انہوں نے آڑ نہ دی ہوتی تو گھر گھر کے ٹکڑے مانگتی۔"

مگن داس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ بہتر ہے اب یہاں سے اپنی عزت آبرو لیے ہوئے چل دو، یہاں میرا نباہ نہ ہوگا۔ اندرا رئیس زادی ہے تم اس قابل نہیں ہو، کہ اس کے شوہر بن سکو۔ مالن سے بولا "تو دھرم سالے میں جاتا ہوں، جانے وہاں کھاٹ واٹ مل جاتی ہے کہ نہیں، مگر رات تو کاٹنی ہے کسی طرح کٹ ہی جائے گی۔ رئیسوں کے لیے مخملی گدے چاہئیں، ہم مزدوروں کے لیے پوال ہی بہت ہے۔"

یہ کہکر اُس نے لٹیا اُٹھائی۔ ڈنڈا سنبھالا۔ اور بادلِ پُر درد ایک طرف کو چل دیا۔

اس وقت اندرا اپنے جھروکے پر بیٹھی ہوئی اِن دونوں کی باتیں سُن رہی تھی کیا اتفاق کی خوبی ہے کہ عورت کو جنّت کی نعمتیں حاصل اور اُس کا شوہر آوارہ وطن جسے رات کاٹنے کا ٹھکانا نہیں۔

(۴)

مگن داس مایوسانہ خیالات میں ڈوبا ہوا شہر سے باہر نکل آیا اور ایک سرائے میں ٹھہرا جو صرف اسلئے مشہور تھی کہ وہاں شراب کی ایک دکان تھی۔ یہاں قرب و جوار سے مزدور لوگ آآکر غم غلط کیا کرتے تھے۔ جو بھولے بھٹکے مسافر یہاں ٹھہرتے اُنہیں ہوشیاری اور چوکسی کا عملی سبق مل جاتا تھا۔ مگن داس تھکا ماندہ تھا ہی ایک پیڑ کے نیچے چادر بچھا کے سو رہا۔ اور جب صبح کو نیند کھلی تو اُسے کسی پیر و مرشد کی زندہ تلقینِ معرفت کا کرشمہ نظر آیا۔ جس کی پہلی منزل ترکِ دنیا ہے۔ اسکی مختصر لٹھیا جسمیں دو ایک کپڑے اور زادِ راہ اور لٹیا ڈور بندھی ہوئی تھی غائب ہو گئی تھی۔ بجز اُن کپڑوں کے جو اُس کے بدن پر تھے۔ اب اُس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ اور بھوک جو افلاس میں اور بھی تیز ہو جاتی ہے اُسے بے چین کر رہی تھی۔ مگر مستقل مزاج آدمی تھا۔ اُس نے قسمت کا رونا نہیں رو دیا۔ گزران کی تدبیریں سوچنے لگا۔ سیاق و سباق میں اُسے اچھی دستگاہ تھی مگر اس حیثیت میں اس سے فائدہ اُٹھانا غیر ممکن تھا۔ اس نے فنِ نغمہ میں بہت ریاض کیا تھا۔ کسی رنگین مزاج رئیس کے دربار میں اُس کی قدر ہو سکتی تھی۔ مگر اُس کی مردانہ غیرت نے اس پیشہ کو اختیار کرنیکی اجازت نہ دی۔ ہاں وہ اعلےٰ درجہ کا شہسوار تھا۔ اور یہ فن شان و شعداری کے ساتھ اُس کی معاش کا وسیلہ بن سکتا تھا۔ یہ مصمم ارادہ کر کے اُس نے قدم ہمت آگے بڑھائے۔ بظاہر یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا تھا مگر وہ اپنا بوجھ ہلکا ہو جانے سے اس وقت بہت رنجیدہ خاطر نہیں تھا۔ مرد انہ

ہمت کا آدمی ایسی اُفتادوں کو اُسی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جس سے ایک ہوشیار طالب علم امتحان کے سوالات کو دیکھتا ہے۔ اُسے اپنی ہمت آزمانے کا ایک مشکل سے عہدہ برا ہونے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اس کی ہمت نادانستہ طور پر مضبوط ہو جاتی ہے۔ فی الواقع ایسے معرکے مردانہ حوصلہ کے لئے تحریک کا کام دیتے ہیں۔ مگن داس اس جوش سے قدم بڑھاتا چلا جاتا تھا۔ گویا کامیابی کی منزل سامنے نظر آ رہی ہے مگر شاید وہاں کے گھوڑوں نے شرارت اور سرکشی سے توبہ کر لی تھی۔ زیادہ خلیق طور پر خوشگام وسبک خرام واقع ہوئے تھے۔ وہ جس گاؤں میں جاتا۔ ہمت یاس کو اُکسانے والا جواب پاتا۔ بالآخر شام کے وقت جب آفتاب اپنی منزل مقصود پر جا پہنچا تھا اس کی منزل دشوار تمام ہوئی۔ ناگر گھاٹ کے ٹھاکر اٹل سنگھ نے اس فکر معاش کا خاتمہ کیا

یہ ایک بڑا گاؤں تھا۔ پختہ مکانات تھے۔ مگر اُنمیں آسمانی رُوحیں آباد تھیں کئی سال پہلے پلیگ نے آبادی کے بڑے حصے کو عالم سفلی سے اُٹھا کر عالم علوی میں پہنچا دیا تھا اس وقت پلیگ کے موجودہ اور خانہ برانداز جانشین گاؤں کے نوجوان اور شوقین زمیندار صاحب اور حلقہ کے کارگزار اور ذی رُعب تھانیدار صاحب تھے ان کی متفقہ سرگرمیوں سے گاؤں میں سٹ بگ کا رواج تھا۔ مال و دولت کو لوگ جزو جان سمجھتے تھے اسے گناہ کی طرح چھپاتے تھے۔ گھر گھر میں روپے رہتے ہوئے لوگ قرض لے لے کر کھاتے پھٹے حالوں رہتے۔ اسی میں نباہ تھا۔ کاجل کی کوٹھڑی تھی۔ سفید کپڑے پہننا اُن پر دھبہ لگاتا تھا۔ حکومت اور جبر کا بازار گرم تھا۔ اہیروں کے یہاں انجن کیلئے بھی دودھ نہ تھا۔ تھانہ میں دودھ کی ندی بہتی تھی۔ مویشی خانہ کے محرر دودھ کی کلیاں کرتے تھے۔ اسی اندھیر نگری کو مگن داس نے اپنا مسکن بنایا ٹھاکر صاحب نے غیر معمولی فیاضی سے کام لے کر اسے رہنے کیلئے ایک مکان بھی دے دیا جو صرف بہت وسیع معنوں میں مکان کہا جا سکتا تھا۔ اسی گوشۂ قناعت میں وہ ایک ہفتہ سے زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہے اور کپڑے میلے ہو رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے اب ان باتوں کی حس ہی نہیں رہی زندہ ہے مگر زندگی

رخصت ہو گئی ہے۔ ہمت اور حوصلہ مشکل کو آسان کر سکتے ہیں۔ آندھی اور طوفان سے بچا سکتے ہیں۔ مگر بدقسمتی ان کے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ ٹوٹی ہوئی ناؤ پر بیٹھ کر ملار گانا ہمت کا کام نہیں، حماقت کا کام ہے۔

ایک روز جب شام کے وقت وہ اندھیرے میں گھاٹ پر پڑا ہوا تھا۔ ایک عورت اُس کے دروازے پر آ کر بھیک مانگنے لگی۔ مگن داس کو آواز مانوس معلوم ہوئی۔ باہر آ کر دیکھا تو وہی چمپا مالن تھی۔ کپڑے تار تار، مصیبت کی روتی ہوئی تصویر۔ بولا مالن تمہاری یہ کیا حالت ہے۔ مجھے پہچانتی ہو؟

مالن نے چونک کر دیکھا اور پہچان گئی۔ رو کر بولی، بیٹا! اب تمہارا میرا کہاں ٹھکانا لگے، تم نے میرا بنا بنایا گھر اجاڑ دیا۔ نہ اُس دن تم سے باتیں کرتی نہ مجھ پر یہ بپت پڑتی۔ بائی نے تمہیں بیٹھے دیکھ لیا۔ باتیں بھی سنیں۔ صبح ہوتے ہی مجھے بلایا اور برس پڑیں، ناک کٹوا لو گی، منہ پہ کالکھ لگوا دوں گی، چڑیل، کٹنی، تو میری بات کسی غیر آدمی سے کیوں چلائے۔ دوسروں سے میرا چرچا کیوں کرے۔ وہ کیا تیرا داماد تھا۔ جو تو اُس سے میرا دکھڑا رو رہی تھی، جو کچھ منہ میں آیا بکتی رہیں۔ مجھ سے بھی نہ سہا گیا۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی۔ بولی بائی جی مجھ سے قصور ہوا لیجئے اب جاتی ہوں تمہیں ناک کٹتی ہے تو میرا نباہ یہاں نہ ہو گا۔ ایشور نے منہ دیا ہے تو آہار بھی دے گا۔ چار گھر سے مانگوں گی تو میرے پیٹ کو ہو جائے گا۔ اُس چھوکری نے مجھے کھڑے کھڑے نکلوا دیا۔ بتاؤ میں نے تم سے اُس کی کون سی شکایت کی تھی۔ اس کی کیا چرچا کی تھی۔ میں تو اس کا بکھان کر رہی تھی۔ مگر بڑے آدمیوں کا غصہ بھی بڑا ہوتا ہے۔ اب بتاؤ میں کس کی ہو کر رہوں۔ آٹھ دن اسی طرح ٹکڑے مانگتے ہو گئے۔ ایک بھتیجی انہیں کے یہاں لونڈیوں میں نوکر تھی۔ اُسی دن اُسے بھی نکال دیا۔ تمہاری بدولت جو کبھی نہ کیا تھا وہ کرنا پڑا۔ تمہیں کاہے کو دوش لگاؤں قسمت میں جو کچھ لکھا تھا وہ دیکھنا پڑا۔

مگن داس سناٹے میں آ گیا۔ آہ مزاج کا یہ عالم ہے۔ یہ غرور یہ شان تحکم مالن

کو تشفی دی۔ اُس کے پاس اگر دولت ہوتی تو اُسے مالا مال کر دیتا۔ سیٹھ مکھن لال کی صاحبزادی کو بھی معلوم ہو جاتا کہ رزق کی کنجی اسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ بولا۔ تم فکر نہ کرو۔ میرے گھر میں آرام سے رہو۔ اکیلے میرا جی بھی نہیں لگتا۔ سچ کہو تو مجھے تمہاری طرح ایک عورت کی تلاش تھی۔ اچھا ہوا تم آگئیں۔

مالن نے دامن پھیلا کر دعائیں دیں۔ بیٹا تم جگ جگ جیو۔ بڑی عمر ہو۔ یہاں کوئی گھر ملے تو مجھے دلا دو۔ میں یہاں رہوں گی۔ تو میری بھتیجی کہاں جائے گی۔ وہ بے چاری شہر میں کس کے آسرے رہے گی۔ مگن داس کا خون حمیت جوش میں آیا۔ ان پر یہ آفت میری لائی ہوئی ہے۔ ان کی اس آوارہ گردی کا ذمہ دار میں ہوں۔ بولا کوئی ہرج نہ ہو۔ تو اُسے بھی یہیں لے آؤ۔ میں دن کو یہاں بہت کم رہتا ہوں۔ بولا کوئی ہرج نہ ہو۔ تو اُسے بھی یہیں لے آؤ۔ میں دن کو یہاں بہت کم رہتا ہوں۔ رات کو باہر چارپائی ڈال کر پڑا رہا کروں گا۔ میری وجہ سے تم لوگوں کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ یہاں دوسرا مکان ملنا دشوار ہے۔ یہی جھونپڑا بڑی مشکلوں سے ملا ہے۔ یہ اندھیر نگری ہے۔ جب تمہارا بھتیجا کہیں لگ جائے تو چلی جانا۔

مگن داس کو کیا معلوم تھا کہ حضرت عشق اُس کی زبان پر بیٹھے ہوئے اس سے یہ باتیں کہلا رہے ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے کہ عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔

(۵)

ناگپور اس گاؤں سے بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ چمپا اُسی دن چلی گئی اور تیسرے دن رمبھا کے ساتھ لوٹ آئی۔ یہ اُس کی بھتیجی کا نام تھا۔ اُس کے آنے سے جھونپڑے میں جان سی پڑ گئی۔ مگن داس کے ذہن میں مالن کی لڑکی کی جو تصویر تھی۔ اسکو رمبھا سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ وہ جنس حسن کا مشتاق جوہری تھا۔ مگر ایسی صورت جس پر شباب کی مستانہ اور فتنہ خیز دلاویزیاں نثار ہو رہی ہوں اُس کی نظر سے کبھی نہیں گزری تھی۔ اُس کی جوانی کا چاند اپنی سنہری اور متین شان کے ساتھ چمک رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ مگن داس دروازہ پر پڑا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ رمبھا سر پر گھڑا رکھے

پانی بھرنے کو نکلی۔ مگن داس نے اُسے دیکھا اور ایک لمبی سانس لیکر اُٹھ بیٹھا خط وخال بہت ہی دلفریب تازہ پھول کی طرح شگفتہ چہرہ۔ آنکھوں میں متین سادگی کا جلوہ۔ مگن داس کو اُس نے بھی دیکھا۔ چہرہ پر حیا کی سُرخی نمودار ہو گئی۔ عشق نے پہلا وار کیا۔

مگن داس سوچنے لگا۔ کیا تقدیر یہاں کوئی اور گل کھلانے والی ہے۔ کیا دِل مجھے یہاں بھی چین نہ لینے دیگا۔ رمبھا تو یہاں ناحق آئی۔ ناحق ایک غریب کا خون تیرے سر پر ہوگا۔ میں تو اب تیرے ہاتھوں بک چکا مگر کیا تو بھی میری ہو سکتی ہے۔ لیکن نہیں اتنی عجلت نہیں دِل کا سودا سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے۔ تم کو ابھی ضبط کرنا ہوگا۔ رمبھا حسین ہے۔ مگر جھوٹے موتی کی آب و تاب اُسے سچا نہیں بنا سکتی۔ تمہیں کیا خبر کہ اس بھولی نازنین کے کان حرفِ محبت سے آشنا نہیں ہو چکے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا باغِ حسن کسی گلچیں کی دست درازیوں سے آلودہ نہیں ہو چکا۔ اگر چند دِنوں کی دلبستگی کیلئے ایک مشغلہ کی ضرورت ہے تو تم آزاد ہو۔ مگر یہ نازک معاملہ ہے ذرا سنبھل کے قدم رکھنا۔ پیشہ ور ذاتوں میں حسنِ ظاہری اکثر اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔

تین مہینے گزر گئے۔ مگن داس رمبھا کو جوں جوں مشتاقانہ نگاہوں سے دیکھتا توں توں اس پر پریم کا رنگ گاڑھا ہوتا جاتا تھا۔ وہ روز اُسے کنوئیں سے پانی نکالتے دیکھتا وہ روز گھر میں جھاڑو دیتی۔ روز کھانا پکاتی۔ آہ مگن داس کو اُن جوار کی روٹیوں میں جو مزہ آتا تھا وہ کبھی نعمتوں کے خوانِ لطیف میں بھی نہ آیا تھا۔ اُسے اپنی کوٹھری ہمیشہ صاف اور ستھری ملتی۔ نہ جانے کون اس کے بستر بچھا دیتا۔ کیا یہ رمبھا کی عنایت تھی۔ اس کی نگاہیں کیسی شرمیلی تھیں۔ اُس نے اُسے کبھی اپنی طرف شوخ نگاہوں سے تاکتے نہیں دیکھا وہ آواز کیسی میٹھی۔ اس کی ہنسی کی آواز کبھی اُس کے کان میں نہیں آئی۔ اگر مگن داس اُس کے پریم میں متوالا ہو رہا تھا۔ تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ اُس کی گرسنہ نگاہیں اضطراب اور اشتیاق میں ڈوبی ہوئی ہمیشہ رمبھا کو ڈھونڈا کرتیں۔ وہ جب کبھی

دوسرے گاؤں کو جاتا تو میلوں تک اس کی پُر امید اور بیتاب آنکھیں مڑ مڑ کر عزیز کے دروازے کی طرف آتیں۔ اُسکی شہرت قرب و جوار میں پھیل گئی تھی مگر اُسکی خلقی مروت اور کشادہ ظرفی سے اکثر لوگ بے جا فائدہ اٹھاتے۔ انصاف پسند حضرات تو خاطر و مدارات سے کام نکال لیتے اور جو لوگ زیادہ دانشمند تھے۔ وہ متواتر تقاضوں کے منتظر رہتے۔ چونکہ مگن داس اس فن سے بیگانہ محض تھا۔ اسلئے باوجود شب و روز کی دوا دوش کے افلاس سے اُس کا گلا نہ چھوٹتا۔ جب وہ رمبھا کو چکی پیستے ہوئے دیکھتا تو گیہوں کے ساتھ اس کا دل بھی پس جاتا تھا۔ وہ کنوئیں سے پانی نکالتی تو اس کا کلیجہ نکل آتا۔ جب وہ پڑوس کی عورتوں کے کپڑے سیتی تو کپڑوں کیساتھ مگن داس کا دل چھد جاتا مگر کچھ بس نہ تھا نہ قابو۔

مگن داس کی رمز شناس نگاہوں کو اسمیں تو کوئی شک نہیں تھا کہ اسکی کشش محبت بالکل بے اثر نہیں ہے ورنہ رمبھا کی وفادارانہ خاطرداریوں کو کس خیال سے منسوب کرتا۔ وفا ہی وہ جادو ہے۔ جو غرورِ حسن کا سر بھی نیچا کر سکتی ہے۔ مگر عاشقانہ رسائی پیدا کرنے کا مادہ اسمیں بہت کم تھا۔ کوئی دوسرا منچلا عاشق اتنے دنوں میں اپنے عمل تسخیر میں کامیاب ہو چکا ہوتا۔ لیکن مگن داس نے دلِ عاشق کا پایا تھا اور زبان معشوق کی۔

ایک روز شام کے وقت چمپا کسی کام سے بازار گئی ہوئی تھی اور مگن داس حسب معمول چارپائی پر پڑا خواب دیکھ رہا تھا۔ کہ رمبھا ایک شانِ رعنائی کے ساتھ آ کر اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اسکا بھولا چہرہ کنول کی طرح کھلا ہوا تھا اور آنکھوں سے ہمدردی کا پاک جذبہ جھلک رہا تھا۔ مگن داس نے اُس کی طرف پہلے حیرت اور پھر محبت کی نگاہوں سے دیکھا اور دل پر زور ڈال کر بولا۔ آؤ رمبھا! تمہیں دیکھنے کو بہت دنوں سے آنکھیں ترس رہی تھیں۔

رمبھا نے بھولے پن سے کہا۔ "میں یہاں نہ آتی تو تم مجھ سے کبھی نہ بولتے"

مگن داس کا حوصلہ بڑھا۔ بولا۔ "بلا مرضی پائے تو کتا بھی نہیں آتا۔"

رمبھا مسکرائی ۔ کلی کھل گئی ۔ "میں تو آپ ہی چلی آئی ۔"

مگن داس کا کلیجہ اُچھل پڑا ، اُس نے جرأت کرکے رمبھا کا ہاتھ پکڑ لیا اور جذبہ سے کانپتی ہوئی آواز سے بولا ۔ "نہیں رمبھا ایسا نہیں ہے ، یہ میری مہینوں کی تپسیا کا پھل ہے ۔"

مگن داس نے بیتاب ہو کر اُسے گلے سے لگا لیا ۔ جب وہ چلنے لگی تو اپنے عاشق کی طرف محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولی اب یہ پریت ہم کو نبھانی ہوگی ۔

پو پھٹنے کے وقت جب سورج دیوتا کے آمد کی تیاریاں ہو رہی تھیں مگن داس کی آنکھ کھلی ۔ رمبھا آٹا پیس رہی تھی ۔ اُس پرسکون سناٹے میں چکی کی گھمر گھمر بہت بھلی معلوم ہوتی تھی ۔ اور اس سے سُر ملا کر رمبھا اپنے دلکش انداز سے گاتی تھی ۔

"جھلنیا موری پانی میں گری ۔
میں جانوں پیا مجھ کو منیہیں، رام اُلٹی منالوں تجھ کو پڑی ۔
جھلنیا موری پانی میں گری ۔"

سال بھر گزر گیا ۔ مگن داس کی محبت اور رمبھا کے سلیقہ نے مل کر اس ویران جھونپڑے کو کنج باغ بنا دیا ۔ اب وہاں گائیں تھیں ، پھولوں کی کیاریاں تھیں اور کئی دیہاتی وضع کے مونڈھے تھے ، فراغت اور آسائش کی برکتیں نمودار تھیں ۔

ایک روز صبح کے وقت مگن داس کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ ایک معزز آدمی انگریزی لباس پہنے اُسے ڈھونڈتا ہوا آ پہنچا ۔ اور اُسے دیکھتے ہی دوڑ کر گلے سے لپٹ گیا ۔ مگن داس اور وہ دونوں ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے وہ اب وکیل ہو گیا تھا ۔ مگن داس نے بھی اب اُسے پہچانا اور کچھ جھینپتا جھجکتا اس سے بغل گیر ہو گیا ۔ بڑی دیر تک دونوں دوست باتیں کرتے رہے ۔ باتیں کیا تھیں واقعات اور اتفاقات کی ضخیم داستان تھی ۔ کئی مہینے ہوئے سیٹھ لگن جی کا چھوٹا بچہ چیچک کی نذر ہو گیا ۔ سیٹھ جی نے فرط ملال سے خودکشی کرلی ۔ اب مگن داس ساری جائداد کوٹھی ، علاقہ اور مکانات کا بلاشرکت غیرے مالک و مختار تھا ۔ سیٹھانیوں میں

خانہ جنگیاں ہو رہی تھیں۔ ملازموں نے غبن و خیانت کو اپنا وطیرہ بنا رکھا تھا
مگر سیٹھانی اُسے بُلانے کیلئے خود آنے پر آمادہ تھیں۔ مگر وکیل صاحب نے انہیں روکا
تھا۔ جب مگن داس نے مسکرا کر پوچھا "تمہیں کیونکر معلوم ہُوا کہ میں یہاں ہوں" تو وکیل صاحب
نے فرمایا "مہینہ بھر سے تمہارے ہی سراغ میں ہوں۔ سیٹھ مکھن لال نے اتنا پتہ بتلا دیا
تم دہلی پہنچے اور میں نے اپنا مہینہ بھر کا بل پیش کیا۔"

رمبھا بیقرار تھی کہ یہ کون ہے اور ان میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ دس بجتے
بجتے وکیل صاحب مگن داس سے ایک ہفتہ کے اندر آنے کا وعدہ لے کر رخصت
ہوئے۔ اُسی وقت رمبھا آ پہنچی اور پوچھنے لگی۔ یہ کون ہے ان کا تم سے کیا کام تھا

مگن داس نے جواب دیا۔ جمراج کا دوت۔"

رمبھا۔ کیا اشگون بکتے ہو۔

مگن۔ نہیں رمبھا یہ اشگون نہیں ہے یہ سچ مچ میری موت کا فرشتہ تھا۔ میری
خوشیوں کے باغ کو روندنے والا۔ میری ہری بھری کھیتی کو اجاڑنے والا۔ رمبھا!
میں نے تمہارے ساتھ دغا کی ہے۔ میں نے تمہیں اپنے فریب کے جال میں پھنسایا
ہے مجھے معاف کر دو۔ محبت نے مجھ سے یہ سب کروایا۔ میں مگن ٹھاکر نہیں ہوں
میں سیٹھ مگن داس کا بیٹا اور سیٹھ مکھن لال کا داماد ہوں۔

مگن داس کو خوف تھا کہ رمبھا یہ سنتے ہی چونک پڑے گی اور شاید اُسے ظالم
دغاباز کہنے لگے۔ مگر اُس کا خیال غلط نکلا۔ رمبھا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر صرف
اتنا کہا۔ "تو کیا تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟"

مگن داس نے اُسے گلے لگا کر کہا۔ "ہاں۔"

رمبھا۔ کیوں؟

مگن۔ اسلئے کہ اندرا بہت ہوشیار، حسین اور دولت مند ہے۔

رمبھا۔ میں تمہیں نہ چھوڑوں گی۔ کبھی اندرا کی لونڈی تھی اب اُنکی سوت بنونگی۔ تم
جتنی میری محبت کرو گے۔ اتنی اندرا کی تو نہ کرو گے۔ کیوں۔

مگن داس اس بھولے پن پر متوالا ہو گیا۔ مسکرا کر بولا، اب اندرا تمہاری لونڈی بنے گی، مگر سنتا ہوں، وہ بہت سُندر ہیں۔ کہیں میں اُنکی صورت پر لبھا نہ جاؤں مردوں کا حال تم نہیں جانتیں۔ مجھے اپنے ہی سے ڈر لگتا ہے۔

رمبھا نے پُر یقین نگاہوں سے دیکھ کر کہا، کیا تم بھی ایسا کرو گے؟ اُنہہ جو جی میں آئے کرنا، میں تمہیں نہ چھوڑوں گی۔ اندرا رانی بنے میں لونڈی ہوں گی، کیا اتنے پر بھی مجھے چھوڑ دو گے۔

مگن داس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں بولا، پیاری! میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ دہلی نہ جاؤں گا۔ یہ تو میں کہنے ہی نہ پایا کہ سیٹھ جی کا سرگباش ہو گیا۔ بچہ اُن سے پہلے ہی چل بسا تھا۔ افسوس سیٹھ جی کے آخری درشن بھی نہ کر سکا۔ اپنا باپ بھی اتنی محبت نہیں کر سکتا۔ انہوں نے مجھے اپنا وارث بنایا ہے۔ وکیل صاحب کہتے تھے، کہ سیٹھ انیوں تین لاکھ بن ہے۔ نوکر چاکر لوٹ مار مچا رہے ہیں۔ وہاں کا یہ حال ہے اور میرا دل وہاں جانے پر راضی نہیں ہوتا۔ دل تو یہاں ہے۔ وہاں کون جائے۔"

رمبھا ذرا دیر تک سوچتی رہی۔ پھر بولی۔" تو میں تمہیں چھوڑ دوں گی اتنے دن تمہارے ساتھ رہی۔ زندگی کا سکھ لوٹا۔ اب جب تک جیوں گی۔ اس سکھ کا دھیان کرتی رہوں گی، مگر تم مجھے بھول تو نہ جاؤ گے؟ سال میں ایک بار دیکھ لیا کرنا اور اسی جھونپڑے میں۔"

مگن داس نے بہت ضبط کیا، مگر آنسو نہ تھم سکے۔ بولے رمبھا یہ باتیں نہ کرو کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا، اس لئے نہیں کہ تمہارے اوپر احسان ہے، تمہاری خاطر نہیں، اپنی خاطر۔ وہ راحت، وہ محبت وہ آنند جو مجھے یہاں میسر ہے اور کہیں نہیں مل سکتا۔ خوشی کے ساتھ زندگی بسر ہو، یہی انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ مجھے ایشور نے وہ خوشی یہاں دے رکھی ہے۔ تو میں اسے کیوں چھوڑوں مال و دولت کو میرا سلام ہے۔ مجھے اس کی ہوس نہیں ہے۔"

رمبھا پھر متین لہجہ میں بولی۔ میں تمہارے پاؤں کی بیڑی نہ بنوں گی چاہے

تم ابھی مجھے نہ چھوڑو۔ لیکن تھوڑے دنوں میں تمہاری یہ محبت نہ رہے گی

مگن داس کو تازیانہ لگا۔ جوش سے بولا "تمہارے سوا اس دل میں اب کوئی اور جگہ نہیں پا سکتا۔

رات زیادہ آ گئی تھی۔ اشٹمی کا چاند خواب گاہ میں جا چکا تھا۔ دوپہر کے کنول کی طرح صاف و شفاف آسمان میں ستارے کھلے ہوئے تھے۔ کسی کھیت کے رکھوالے کے بانسری کی آواز جیسے ٹھمری نے تاثیر، سناٹے نے سر طلسم اور تاریکی نے روحانیت کی دلکشی بخشی تھی۔ کانوں میں آ رہی تھی۔ گویا کوئی مبارک روح ندی کے کنارے بیٹھی ہوئی۔ پانی کی لہروں سے یا دور بہرے ساحل کے خاموش ذیر گشتی درختوں سے اپنی زندگی کی داستان غم سنا رہی ہے۔

مگن داس سو گیا۔ مگر رمبھا کی آنکھوں میں نیند نہ آئی۔

(۷)

صبح ہوئی تو مگن داس اٹھا۔ اور رمبھا! رمبھا! پکارنے لگا۔ مگر رمبھا رات ہی کو اپنی بچی کے ساتھ وہاں سے کہیں چلی گئی تھی۔ مگن داس کو اس مکان کے در و دیوار پر ایک حسرت سی چھائی ہوئی معلوم ہوئی۔ گویا گھر کی جان نکل گئی تھی۔ وہ گھبرا کر اس کوٹھری میں گیا۔ جہاں رمبھا روز چکی پیستی تھی مگر افسوس! آج چکی بے حس و حرکت تھی۔ پھر وہ کنوئیں کی طرف دوڑا گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوا کہ کوئی نے اسے نگل جانے کیلئے اپنا منہ کھول دیا ہے تب وہ بچوں کی طرح چیخ اٹھا اور روتا ہوا پھر اس جھونپڑی میں آیا۔ جہاں کل رات تک محبت کا باس تھا۔ مگر آہ! اس وقت وہ ماتم کدہ بنی ہوئی تھی۔ جب ذرا آنسو تھمے تو اس نے گھر میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ رمبھا کی ساڑی الگنی پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک پٹاری میں وہ کنگن رکھا ہوا تھا۔ جو مگن داس نے اسے دیا تھا۔ برتن سب دھلے ہوئے تھے صاف اور ستھرے۔ مگن داس سوچنے لگا۔ رمبھا تو نے رات کو کہا تھا۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔ کیا تو نے وہ بات دل سے کہی تھی۔ میں نے تو سمجھا تھا تو دل لگی کر رہی ہے نہیں

تو میں تجھے کلیجے میں چھپا لیتا۔ میں تو تیرے لئے سب کچھ چھوڑے بیٹھا تھا۔ تیری محبت میرے لئے سب کچھ تھی۔ آہ میں یوں بے چین ہوں۔ کیا تو بے چین نہیں ہے؟ ہائے تو رو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تو اب بھی لوٹ آئے گی۔ پھر مجسم تصورات کا ایک جمگھٹ اس کے سامنے آیا۔ وہ نازک ادائیاں وہ متوالی نگاہیں وہ بھولی بھالی باتیں، وہ خود فراموشانہ مہر انگیزیاں وہ جان بخش تبسّم، وہ عاشقانہ دلجوئیاں وہ پریم کا نشہ، وہ دائمی شگفتہ مزاجی، وہ لچک لچک کر کنوئیں سے پانی لانا۔ وہ صورتِ انتظار وہ پُر محبّت اضطراب۔ یہ سب تصویریں اس کی نگاہوں کے سامنے حسرتناک بیتابی کے ساتھ پھرنے لگیں۔ مگن داس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور رقت و درد کے اُمڈتے ہوئے دریا کو مردانہ ضبط سے روک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ناگ پور جانے کا قطعی فیصلہ ہو گیا۔ تکیہ کے نیچے سے صندوق کی کنجی اُٹھائی۔ تو کاغذ کا ایک ٹکڑا نکل آیا۔ یہ رمبھا کا الوداعی خط تھا۔

"پیارے میں بہت رو رہی ہوں، میرے پیر نہیں اُٹھتے مگر میرا جانا ضروری ہے تمہیں جگاؤں گی تو تم جانے نہ دوگے۔ آہ! کیسے جاؤں! اپنے پیارے پتی کو کیسے چھوڑوں، قسمت مجھ سے یہ آنند کا گھر چھڑا رہی ہے۔ مجھے بے وفا مت کہنا میں تم سے پھر کبھی ملوں گی۔ میں جانتی ہوں، کہ تم نے میرے لئے یہ سب کچھ تیاگ دیا ہے مگر تمہارے لئے زندگی میں بہت کچھ اُمیدیں ہیں۔ میں اپنی محبت کی دھن میں تمہیں اُن اُمیدوں سے کیوں دور رکھوں۔ اب تم سے بدا ہوتی ہوں۔ میری سدھ مت بھولنا۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ یہ آنند کے دن کبھی نہ بھولیں گے کیا تم مجھے بھول سکو گے؟"

تمہاری پیاری رمبھا

(۸)

مگن داس کو دہلی آئے تین مہینے گزر چلے ہیں۔ اس اثنا میں اُسے سب سے بڑا جو ذاتی تجربہ ہوا وہ یہ تھا، کہ فکر روزگار اور کثرتِ مشاغل سے جذباتِ کشش کا زور کم

کیا جا سکتا ہے۔ ڈیڑھ سال قبل کا بے فکر نوجوان اب ایک معاملہ فہم اور مال اندیش انسان بن گیا تھا۔ سہاگرگھاٹ کے چند روز قیام سے اُسے رعایا کی اُن تکالیف کا ذاتی علم ہو گیا تھا جو کارندوں اور مختاروں کی سخت گیریوں کی بدولت اُنہیں اُٹھانا پڑتی ہیں۔ اُس نے اُسے ریاست کے انصرام میں بہت مدد دی اور گو ملازمین دبی زبان سے اس کی شکایت کرتے تھے اور اپنی قسمتوں اور زمانے کی نیرنگیوں کو کوستے تھے۔ مگر رعایا آسودہ حال تھی۔ ہاں جب وہ سب دھندوں سے فرصت پاتا تو ایک بھولی بھالی صورت والی نازنین اُس کے پہلوئے خیال میں آ بیٹھتی اور تھوڑی دیر کے لئے سہاگرگھاٹ کا وہ ہرابھرا جھونپڑا اور اُس کی دلفریبیاں آنکھوں کے سامنے آ جاتیں۔ ساری باتیں ایک دلکش خواب کی طرح یاد آ آکر اس کے دل کو مسوسنے لگتیں لیکن کبھی کبھی خود بخود اس کا خیال اندرا کی طرف بھی جا پہنچتا۔ گو اُس کے دل میں رمبھا کی وہی جگہ تھی۔ مگر کسی طرح اسمیں اندرا کیلئے بھی ایک گوشہ نکل آیا تھا۔ جن خیالوں اور آفتوں نے اُسے اندرا سے بیزار کر دیا تھا وہ اب رخصت ہو گئی تھیں اب اُسے اندرا سے کچھ ہمدردی ہو گئی تھی۔ اگر اُس کے مزاج میں غرور ہے۔ حکومت ہے۔ تکلّف ہے۔ شان ہے تو یہ اُس کا قصور نہیں۔ یہ رئیس زادوں کی عام کمزوریاں ہیں۔ یہی اُن کی تعلیم ہے وہ بالکل معذور و مجبور ہیں۔ ان متغیر اور معتدل جذبات کے ساتھ جہاں وہ بے چینی کے ساتھ رمبھا کی یاد کو تازہ کیا کرتا تھا۔ وہاں اندرا کا خیر مقدم کرنے اور اُسے اپنے دل میں جگہ دینے کیلئے تیار تھا۔ وہ دن بھی دور نہیں تھا جب اسے اس آزمائش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے کئی عزیز امیرانہ شان و شکوہ کے ساتھ اندرا کو رخصت کرانے کیلئے ناگپور گئے ہوئے تھے۔ مگن داس کی طبیعت آج گونا گوں جذبات کے باعث جن میں انتظار اور اشتیاق کی حیثیت نمایاں تھی اُچاٹ سی ہو رہی تھی۔ جب کوئی ملازم آتا تو وہ سنبھل بیٹھتا کہ شاید اندرا آ پہنچی۔ آخر شام کے وقت جب دن رات گلے مل رہے تھے زنانخانہ میں نغمۂ پرشور کی صداؤں نے بہو کے پہنچنے کی اطلاع دی۔ سہاگ کی سہانی رات تھی۔ دس بج گئے تھے۔ پرُ فضا

صحن میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ وہ چاندنی جس میں نشہ ہے، آرزو ہے اور کشش ہے۔ گملوں میں کھلے ہوئے گلاب اور چمپے کے پھول، چاند کی سنہری روشنی میں زیادہ میٹھے اور خاموش نظر آتے تھے۔ مگن داس اندرا سے ملنے کیلئے چلا۔ اُسکے دل میں آرزوئیں ضرور تھیں۔ مگر حسرتناک شوقِ دیدار تھا۔ مگر تشنگی سے خالی محبت نہیں نفس کی کشش تھی مگر حسرتناک شوقِ دیدار تھا۔ مگر تشنگی سے خالی محبت نہیں اُسکے دل میں بیٹھی ہوئی رمبھا شاید بار بار باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی اسی لئے دل میں دھڑکن ہو رہی تھی۔ خوابگاہ کے دروازہ پر پہنچا۔ ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔ اُس نے پردہ اُٹھایا۔ اندر ایک عورت سفید ساڑی پہنے کھڑی تھی۔ ہاتھ میں چند خوشنما چوڑیوں کے سوا اس کے بدن پر ایک زیور بھی نہ تھا۔ جوں ہی پردہ اُٹھا، اور مگن داس نے اندر قدم رکھا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی، مگن داس نے اُسے دیکھا اور متحیر ہو کر بولا۔ "رمبھا" اور دونوں بیتابانہ جوش سے باہم لپٹ گئے۔ دل میں بیٹھی ہوئی رمبھا باہر نکل آئی تھی۔

سال بھر گزرنے کے بعد ایکدن اندرا نے اپنے شوہر سے کہا کیا رمبھا کو بالکل بھول گئے۔ کیسے بے وفا ہو۔ کچھ یاد ہے اُس نے چلتے وقت تم سے کیا التجا کی تھی۔ مگن داس نے کہا "خوب یاد ہے۔ وہ آواز بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں رمبھا کو بھولی بھالی لڑکی سمجھتا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا۔ کہ یہ تریا چرتر کا طلسم ہے۔ میں اپنی رمبھا کو اب بھی اندرا سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ تمہیں رشک تو نہیں ہوتا؟ اندرا نے ہنس کر جواب دیا۔ رشک کیوں ہو۔ تمہیں رمبھا ہے تو کیا میرا مگن سنگھ نہیں ہے۔ میں اب بھی اس پر مرتی ہوں۔ دوسرے دن دونوں دہلی سے ایک قومی جلسے میں شریک ہونے کا بہانہ کرکے روانہ ہو گئے اور ساگر گھاٹ جا پہنچے۔ وہ جھونپڑا، وہ محبت کا مندر، وہ پریم بھون پھول اور سبزہ سے لہرا رہا تھا۔ چمپا مالن انہیں وہاں ملی۔ گاؤں کے زمیندار اُن کے ملنے کیلئے آئے کئی دن تک پھر مگن سنگھ کو گھوڑے لگانا پڑے۔ رمبھا کنوئیں سے پانی لاتی۔ کھانا پکاتی پھر چکی پیستی اور گاتی۔ گاؤں کی عورتیں پھر اُس سے اپنے کُرتے اور بچوں کی بنڈیاں سلواتیں۔ ہاں اتنا ضرور کہتیں کہ اس کا رنگ کیسا نکھر آیا ہے، ہاتھ پاؤں کیسے

ملائم پڑ گئے ہیں۔ کسی بڑے گھر کی رانی معلوم ہوتی ہے۔ مگر مزاج وہی ہے۔ وہی میٹھی بولی ہے۔ وہی مروت۔ وہی ہنس مکھ چہرہ۔ اسطرح ایک ہفتہ تک اس سادہ اور پاکیزہ زندگی کا لطف اُٹھانے کے بعد دونوں دہلی واپس آئے اور اب دس سال گزرنے پر بھی سال میں ایک بار اس جھونپڑے کے نصیب جاگتے ہیں۔ وہ محبت کی دیوار ابھی تک ان دونوں پریمیوں کو اپنے سایہ میں آرام دینے کیلئے کھڑی ہے۔

امرت

(۱)

میرا عنفوانِ شباب تھا۔ جب میرا دل لذتِ درد سے مانوس ہوا۔ کچھ دنوں تک مشقِ سخن کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس شوق نے محویت کی صورت اختیار کر لی۔ سارے دنیاوی تعلقات سے منہ موڑ کر اپنے حسنِ فکر کی پناہ میں آ بیٹھا۔ تین ہی سال کی مشق نے میری فکر کے جوہر کھول دیے۔ کبھی کبھی میرا کلام اساتذہ کے مشہور کلام سے ٹکر کھا جاتا تھا۔ میرے قلم نے کسی اُستاد کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ میرا خیال ایک خودرو پودے کی طرح قطع و برید کی قیدوں سے آزاد نشو و نما پاتا رہا۔ میرے کلام کا انداز بالکل نرالا تھا۔ میں نے اپنی شاعری کو فارسی سے باہر نکال کر یورپ تک پہنچا دیا۔ یہ میرا اپنا رنگ تھا۔ اس میدان میں میرا کوئی رقیب تھا نہ ہمسر باوجود اس شاعرانہ محویت کے مجھے مشاعروں کی واہ واہ اور سبحان اللہ سے نفرت تھی ہاں اہلِ ذوق سے بلا اپنا نام بتائے ہوئے اکثر اپنے کلام کے حسن و قبح پر بحث کیا کرتا گو مجھے دعویٰ شاعرانہ نہ تھا مگر رفتہ رفتہ مجھے شہرت سے نیاز ہونے لگا۔ جب میری مثنوی دنیا حسن شائع ہوئی۔ تو دنیائے ادب میں ہلچل سی مچ گئی۔ شعر السلف نے سخن فہموں کی بخل داد میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیے ہیں۔ مگر میرا تجربہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ مجھے کبھی کبھی یہ خیال ستایا کرتا کہ میرے قدردانوں کی یہ فیاضی دیگر شعرا کے پستی فکر کی دلیل ہے۔ یہ خیال حوصلہ شکن تھا۔ بہرحال جو کچھ ہوا۔ دنیائے حسن نے مجھے قلمرو سخن کا بادشاہ بنا دیا۔ میرا نام ہر ایک زبان پر تھا۔ میرا چرچا ہر ایک اخبار میں تھا۔ شہرت اپنے ساتھ دولت بھی لائی۔ مجھے شب و روز بجز فکرِ سخن کے اور کوئی شغل نہ تھا۔ لہٰذا اوقات بیٹھے بیٹھے راتیں گزر جاتیں اور جب کوئی پھبتا ہوا شعر قلم سے نکل جاتا تو میں فرطِ مسرت سے اچھل پڑتا۔ میں اب تک تاہل

قیود سے آزاد تھا یا یوں کہئے کہ میں اس کے اُن مزوں سے غیر مانوس تھا جن میں رنج کی تلخی بھی ہے۔ اور نشاط کی نمکینی بھی۔ اکثر مغربی ادیبوں کی طرح میرا خیال تھا کہ سودائے سخن اور سودائے عشق میں بیر ہے۔ مجھے اپنی زبان سے کہتے ہوئے نادم ہونا پڑتا ہے، مجھے اپنی طبیعت پر بھروسہ نہ تھا۔ جب کبھی میری آنکھوں میں کوئی دلفریب صورت میرے دل و دماغ پر ایک جنون سا طاری ہو جاتا۔ ہفتوں تک ایک خود فراموشی کا سا عالم رہتا فکر سخن کی طرف طبیعت کسی طرح مائل نہ ہوتی ایسے کمزور دل میں صرف ایک عشق کی جگہ تھی۔ اسی خوف سے میں اپنی رنگین طبیعت کے خلاف تقوے پر مجبور تھا۔ کنول کی ایک پنکھڑی، پپیہا کا ایک نغمہ لہلہاتے ہوئے ایک مرغزار میں میرے لئے عبادت کی سی کشش تھی۔ مگر کسی نازنین کے دلفریب حسن کو میں مصور یا پیکر تراش کی بے لوث نگاہوں سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ حسین عورت میرے لئے ایک خوش رنگ قاتل ناگن تھی جسے دیکھ کر آنکھیں خوش ہوتی ہیں مگر دل خوف سے سمٹ جاتا ہے۔

خیر دنیائے حسن کو تیاگے ہوئے دو سال گزر چکے تھے۔ میری شہرت برسات کی امڈی ہوئی ندی کی طرح بڑھتی چلی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میں نے دنیائے ادب پر کوئی عمل تسخیر کر دیا ہے۔ اس دوران میں میں نے متفرق اشعار تو بہت کہے مگر دعوتوں اور ایڈیٹروں کے ہجوم نے جذبات لطیف کو ابھرنے نہ دیا۔ نمود اور شہرت ایک مدبر کے سمند ناز کیلئے تازیانہ کا کام دے سکتے ہیں، مگر شاعر کی طبیعت کنج گوشۂ عافیت ہی میں جولان پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ میں ان روز افزوں مکروہات سے گلا چھڑا کر بھاگا اور کوہستان کے ایک گوشہ میں جا چھپا، نیرنگ نے وہیں جنم لیا۔

(۲)

نیرنگ کے شروع کرتے ہی مجھے ایک حیرت انگیز اور خاطر شکن تجربہ ہوا۔ خدا معلوم کیوں میرے ذہن اور فکر پر ایک پردہ پڑ گیا۔ گھنٹوں طبیعت پر زور ڈالتا مگر ایک شعر بھی ایسا نہ نکلتا کہ دل پھڑک اٹھے سوجھتے بھی تو پامال، یا دور افتادہ مضمون

جن سے میری روح بھاگتی تھی۔ میں اکثر جھنجھلا کر اٹھ بیٹھتا، کاغذ پھاڑ ڈالتا اور نہایت بددلی کے عالم میں سوچنے لگتا کہ کیا میری شاعرانہ قوتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ کیا میں نے وہ خزانہ جو قدرت نے مجھے مدت العمر کیلئے عطا کیا تھا، اتنا جلد لٹا دیا۔ کجا وہ عالم تھا کہ مضامین کی بہتات اور نازک خیالات کی فراوانی قلم کو دم نہیں لینے دیتی تھی۔ طائر فکر اڑتا تو آسمان میں تارا بن جاتا تھا، اور کہاں اب یہ پستی یہ افسوسناک بے مائیگی۔ مگر اس کا سبب کیا ہے؟ یہ کس قصور کی سزا ہے؟ اسباب اور نتائج کا دوسرا نام دنیا ہے جب تک ہم کو کیوں کا جواب نہ ملے دل کو کسی طرح صبر نہیں ہوتا۔ حتے کہ موت کو بھی کیوں کا جواب دینا پڑتا ہے آخر میں نے ایک ڈاکٹر سے مشورہ لیا۔ اس نے عام ڈاکٹروں کی طرح تبدیل آب و ہوا کی صلاح دی۔ میرے ذہن میں بھی یہ بات آئی۔ ممکن ہے نینی تال کی مرطوب آب و ہوا سے شعلۂ فکر ٹھنڈا پڑ گیا ہو۔ چھ مہینے تک مسلسل سیر و سیاحت کرتا رہا، دلکش مناظر بہت دیکھے مگر روح پر وہ شاعرانہ انبساط طاری نہ ہوئی، کہ پیمانہ چھلک پڑے اور فکر خلوت میں خود بخود چہکنے لگے۔

مجھے اپنا کھویا ہوا لال نہ ملا۔ اب میں زندگی سے بیزار تھا۔ زندگی خشک ریگستان سی معلوم ہوتی تھی۔ جہاں کوئی جان نہیں، تازگی نہیں، ہر دم دل پر ایک یاس سا دل گرفتگی مسلط رہتی۔ دل میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ کیا وہ چار دن کی چاندنی ختم ہو گئی اور اندھیرا پاکھ آ گیا۔ انسان کی صحبت سے بیزار ہم جنس کی صورت سے نفور کہیں ایک گوشۂ گمنام میں پڑا ہوا حیات کے دن پورے کر رہا تھا۔ درختوں کی بلندیوں پر چہکنے والی۔ میٹھے راگ گانے والی چڑیا کیا قفس میں زندہ رہ سکتی ہے، ممکن ہے کہ وہ دانہ کھائے پانی پئے، مگر اس کی اس زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

آخر جب مجھے اپنے بازیافت کی کوئی امید نہ رہی تو میرے دل میں یہ ارادہ مصمم ہو گیا کہ اب میرے لئے دنیائے سخن سے مر جانا ہی بہتر ہوگا۔ زندہ تو ہوں ہی۔ اس حالت میں اپنے تئیں زندہ سمجھنا حماقت ہے۔ آخر میں نے ایک روز چند روزانہ اخبارات کو اپنے مرنے کی خبر دیدی۔ اسکے شائع ہوتے ہی ملک میں کہرام مچ گیا۔ ایک تہلکہ پڑ گیا۔

شور و تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اس وقت مجھے اپنی عام حسن قبول کا کچھ اندازہ ہوا یہ عام صدا تھی، کہ دنیائے سخن کی کشتی منجدھار میں ڈوب گئی، بزم سخن درہم برہم ہو گئی۔ اخبارات میں میرے سوانحیات شائع ہوئے۔ جنکو پڑھ کر مجھے ان ایڈیٹروں کے مادۂ ایجاد کا قائل ہونا پڑا۔ نہ تو میں کسی رئیس کا فرزند اکبر تھا اور نہ میں نے مسند ریاست چھوڑ کر فقیری اختیار کی تھی اُنکا حسن ظن حقیقت حال پر غالب آگیا تھا۔ میرے احباب میں ایک بنئے سے مراسم یگانگت کا دعوےٰ تھا۔ مجھے شیشہ و ساغر کا شیدائی بنا دیا تھا۔ وہ جب کبھی مجھ سے ملتے انہیں میری آنکھیں نشہ سے سرخ نظر آتیں اگرچہ اسی مضمون میں آگے چل کر انہوں نے میری اس مکروہ عادت کی بہت کشادہ دلی سے توجیہ کی تھی، کیونکہ زاہد خشک ایسے رندانہ اور ممتاز اشعار نہیں کہہ سکتا تھا۔ تاہم یہ حیرت ہے کہ انہیں صریح غلط بیانی کی کیونکر جرأت ہوئی۔

میری ان غلط بیانیوں کی تو مجھے پرواہ نہ تھی، البتہ یہ بڑی فکر تھی، مگر نہیں ایک پُرزور تمنا کہ میرے کلام پر زبان خلق سے کیا فتویٰ صادر ہوتا ہے، ہمارے کارنامہ زندگی کی صحیح داد مرنے کے بعد ہی ملتی ہے، کیونکہ اس وقت وہ خوشامد اور غیبت کی آلودگیوں سے پاک ہوتی ہے، مرنے والے کی خوشی یا رنج کی کون پرواہ کرتا ہے اس لئے میرے کلام پر جتنی تنقیدیں نکلیں، میں نے اُن کا بہت ہی ٹھنڈے دل سے مطالعہ شروع کیا۔ مگر شاعرانہ نگاہ کی وسعت اور مذاق کی لطافت کا ہر چہار طرف قحط سا معلوم ہوتا تھا۔ زیادہ تر جوہریوں نے اشعار سے فرداً فرداً بحث کی تھی شک نہیں کہ وہ قاری کی حیثیت سے اس شعر کے پہلوؤں کو خوب سمجھتے تھے مگر نقاد کا کہیں پتہ نہ تھا۔ نظر عمیق غائب تھی۔ کلام پر مجموعی حیثیت سے نگاہ کرنے والا۔ شاعر کے اندرونی جذبات تک پہنچنے والا کوئی مبصر نہ دکھائی دیا۔

(۳)

ایک روز میں عالم ارواح سے نکل کر گھومتا ہوا اجمیر کی پبلک لائبریری میں جا پہنچا دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے میز پر جھک کر دیکھا کہ کوئی تازہ تصنیف ہاتھ آجائے تو دل

بہلا دوں، دفعتاً میری نگاہ ایک دیدہ زیب رسالے کی طرف گئی جس کا عنوان تھا "کلامِ اختر" جیسے بھولا بچہ کھلونے کی طرف لپکتا ہے اسی طرح جھپٹ کر میں نے اس کتاب کو اُٹھا لیا، اس کی مصنفہ مس عائشہ عارف تھیں، دلچسپی اور بھی زیادہ ہوئی میں اطمینان سے بیٹھ کر اس کتاب کو پڑھنے لگا ایک ہی صفحہ پڑھنے کے بعد دلچسپی نے بیتابی کی صورت اختیار کی، پھر تو میں ایک عالمِ استغراق میں تھا، میرے سامنے گویا معنی اور نکات کا ایک دریا لہریں مار رہا تھا، خیالات کی نوعیت، مذاق کی پاکیزگی، زبان کی لطافت شاعرانہ نگاہ کی وسعت کس کی تعریف کروں، اس کا ایک ایک خیال آفرین تھا، میں ایک پیراگراف پڑھتا، پھر تازگیٔ خیال سے متاثر ہو کر ایک لمبی سانس لیتا تب سوچنے لگتا اس کتاب کو سرسری طور پر پڑھنا غیر ممکن تھا۔ یہ عورت تھی یا حسنِ مذاق کی دیوی اس کی تعریف سے میرا کلام بہت کم بچا تھا۔ مگر جہاں اس نے مجھے داد دی تھی وہاں رموز اور حقیقت کے موتی برسا دیئے تھے۔ اس کے اعتراضات میں ہمدردی اور داد میں عقیدت تھی شاعر کے کلام کو عیوب کے اعتبار سے نہیں خوبیوں کے اعتبار سے دیکھنا چاہیے اس نے کیا نہیں کیا، یہ صحیح معیار نہیں، اُس نے کیا کیا، یہ صحیح معیار ہے بس یہی جی چاہتا تھا کہ مصنفہ کے ہاتھ اور قلم کو چوم لے "سفیر" بھوپال کے دفتر سے یہ رسالہ شائع ہوا تھا، میرا ارادہ مصمم ہو گیا، تیسرے دن شام کے وقت میں مس عائشہ کے خوبصورت بنگلہ کے سامنے ہری ہری گھاس پر ٹہلتا تھا۔

میں خادمہ کے ساتھ ایک کمرہ میں داخل ہوا اُس کی سجاوٹ بہت سادہ تھی پہلی چیز جس پر میری نگاہ پڑی، وہ میری تصویر تھی، جو دیوار سے لٹک رہی تھی۔ سامنے ایک آئینہ رکھا ہوا تھا، میں نے خدا معلوم کیوں اس میں اپنی صورت دیکھی میرا چہرہ زرد اور افسردہ تھا، بال اُلجھے ہوئے، کپڑوں پر گرد کی ایک موٹی تہ جمی ہوئی، پریشانی کی زندہ تصویر کھڑی تھی۔ اسوقت مجھے اپنی ہیئت کذائی پر سخت ندامت ہوئی۔ میں وجیہہ نہ سہی، مگر اسوقت تو سچ مچ چہرہ پر پھٹکار برس رہی تھی۔ اپنے لباس کی موزونیت کا یقین ہمیں بشاش اور شگفتہ بنا دیتا ہے، اپنے پھوہڑپن کا جسم پر اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا دل

پر ہم بزدل اور بے حوصلہ ہو جاتے ہیں۔

مجھے مشکل سے پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ مس عائشہ تشریف لائیں سانولا رنگ تھا، چہرہ ایک متین ملاحت سے منور تھا۔ بڑی بڑی نرگسی آنکھوں سے اخلاقی تہذیب کی روشنی جھلکتی تھی۔ قد میانہ سے کچھ کم، اعضا سبک، ایسی ہلکی پھلکی گویا قدرت نے اس مادی دنیا کیلئے نہیں، کسی ہوائی کرہ کیلئے اُسے خلق کیا ہے۔ کوئی مصور فطانت کی اس سے بہتر تصویر نہیں کھینچ سکتا تھا۔

مس عائشہ نے میری طرف دبی نگاہوں سے دیکھا۔ مگر دیکھتے ہی اس کی گردن جھک گئی اس کے رخساروں پر شرم کی ایک ہلکی سی پرچھائیں ناچتی ہوئی معلوم ہوئی زمین سے اُٹھکر اُس کی آنکھیں میری تصویر کی طرف گئیں اور پھر سامنے پردہ کی طرف جا پہنچیں، شاید اس کی آڑ میں چھپنا چاہتی تھی۔

مس عائشہ نے میری طرف دبی نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا "آپ اختر مرحوم کے عزیزوں میں ہیں؟"

میں نے سر نیچا کئے ہوئے جواب دیا "میں ہی بدنصیب اختر ہوں۔"

عائشہ ایک بے خودی کے عالم میں کرسی پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور میری طرف انداز تحیر سے دیکھ کر بولی "دنیا حسن کے مصنف؟"

اعتقاد ضعیف کے سوا رفتگان عدم کو کس نے دیکھا ہے۔ عائشہ نے میری طرف کئی بار مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ ان میں اب شرم اور حیا کے بجائے حیرت سمائی ہوئی تھی۔ میرے قبر سے نکل کر بھاگنے کا تو اُسے یقین آ ہی نہیں سکتا تھا شاید وہ مجھے دیوانہ سمجھ رہی تھی۔ اُس نے دل میں فیصلہ کیا یہ شخص مرحوم شاعر کا کوئی قریبی عزیز ہے۔ خاندانی مشابہت اس کی شاہد بھی ممکن ہے کہ بھائی ہو۔ اس ناگہانی صدمہ سے از خود رفتہ ہو گیا ہے۔ شاید اس نے میری کتاب دیکھی ہو گی اور دریافت حال کیلئے چلا آیا ہے۔ دفعتاً اُسے خیال گزرا کہ کسی نے اخباروں کو میرے مرنے کی جھوٹی خبر دے دی ہو۔ اور مجھے اس کی تردید کا موقع نہ ملا ہو۔ اس خیال سے اس کی الجھن دور

ہوئی۔ بولی۔ "اخباروں میں آپ کے متعلق ایک نہایت منحوس خبر شائع ہوگئی تھی؟" میں نے جواب دیا۔ "وہ خبر صحیح تھی۔"

اگر پہلے عائشہ کو میرے دیوانہ پن میں کچھ شک تھا، تو وہ رفع ہوگیا۔ اس کے بعد تب اُن سے مجھے خط حاصل ہوتا تھا۔ آخر میں نے مختصر الفاظ میں اپنی داستان سنائی، اور جب اُسکو یقین ہوگیا کہ دنیاد حسن کا مصنف اختر اپنے انسانی قالب میں ہے تو اُس کے چہرہ پر مسرت اور انبساط قلب کی ایک ہلکی سُرخی دکھائی دی اور یہ ہلکا رنگ بہت جلد خودداری اور غرور حسن کے شوخ رنگ سے متغیر ہوگیا۔ غالباً وہ نادم تھی۔ کہ کیوں اُس نے اپنی قدردانی کو دائرہ اعتدال سے باہر جانے دیا۔ کچھ دیر کی شرمیلی خموشی کے بعد اُس نے کہا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ایسی نامبارک خبر شائع کرنے کی ضرورت ہوئی۔

میں نے پرجوش انداز سے جواب دیا۔ "آپ کے زبان قلم سے داد پانے کی دوسری صورت نہ تھی۔ اس تنقید کیلئے میں ایسی ایسی کئی موتیں مر سکتا تھا۔

میرے اس دلیرانہ انداز نے عائشہ کی زبان کو بھی تکلیف اور کھچاؤ کی قید سے آزاد کیا۔ مسکراکر بولی۔ مجھے تصنع مرغوب نہیں ہے ڈاکٹروں نے کچھ تشخیص بھی کی؟ اس کے اس تبسم نے مجھے بذلہ سنجی پر آمادہ کیا۔ بولا۔ اب مسیح کے سوا اس مرض کی شفا اور کسی کے ہاتھوں نہیں ہو سکتی۔"

عائشہ کنایہ سمجھ گئی۔ ہنس کر بولی۔ "مسیح تو چوتھے آسمان پر رہتے ہیں۔"

میری ہمت نے اب اور قدم بڑھائے۔ "عالم ارواح سے چوتھا آسمان بہت دور نہیں ہے۔

عائشہ کے شگفتہ چہرہ سے متانت اور اجنبیت کا ہلکا رنگ اُڑ گیا۔ تاہم بہر ان دلیرانہ کنایوں کو اخلاق کی حد سے بڑھتے دیکھ کر اُسے میری زبان کی محافظ بنانے کیلئے کسی قدر خودداری برتنا پڑی۔ جب میں کوئی گھنٹہ بھر کے بعد اس کمرہ سے نکلا

توبجائے اس کے کہ وہ میری طرف اپنی انگریزی تہذیب کے مطابق ہاتھ بڑھائے اس نے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ پھیلا ہوا پانی جب سمٹ کر کسی گذرگاہ سے نکلتا ہے تو اس کا بہاؤ بہت تیز اور طاقت اور بہا زیادہ ہوجاتی ہے۔ عائشہ کی اُن نگاہوں میں عصمت، کی تاثیر تھی۔ ان میں دل مسکراتا تھا۔ اور جذبہ ناچتا تھا۔ آہ! امین میرے لئے دعوت کا ایک پرجوش پیغام بھرا ہوا تھا۔ جب میں مسلم ہوٹل میں پہنچ کر ان واقعات پر غور کرنے لگا۔ تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ گو میں بصورت ظاہر یہاں اب تک غیر مانوس تھا۔ لیکن معنوی حیثیت سے شاید مجھے گوشۂ دل تک رسائی حاصل ہوچکی تھی۔

(۳)

جب میں کھانا کھا کر پلنگ پر لیٹا تو باوجود وہ دن کی شب بیداری کے نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جذبات کی کشمکش میں نیند کہاں! عائشہ کی صورت اُس کی خاطر داریاں اور اُس کی وہ دزدیدہ نگاہیں دل میں احساسات اور واردات کا طوفان حشر برپا کر رہی تھیں۔ اُس آخری نگاہ نے دل میں تمناؤں کی دوم دھوم مچادی وہ آرزوئیں جو بہت عرصہ ہوا مرمٹی تھیں۔ پھر بیدار ہوئیں اور آرزوؤں کیساتھ قدرت نے بھی مُندی ہوئی آنکھیں کھولدیں۔ دل میں جذبات اور کیفیت کا ایک بیتابی پیش کرنے والا جوش محسوس ہوا۔ یہی آرزوئیں یہی بے چینیاں اور یہی شعور شمع فکر کے لئے روغن ہیں۔ جذبات کی حرارت نے فکر کو گرمایا میں قلم لے کر بیٹھ گیا۔ اور ایک ایسی نظم لکھی۔ جسے میں اپنا سرمایہ ناز سمجھتا ہوں۔

میں ایک ہوٹل میں مقیم تھا مگر کسی نہ کسی حیلہ سے دن میں کم سے کم ایکبار ضرور لطف دیدار اُٹھاتا۔ گو عائشہ نے کبھی میرے قیام گاہ تک آنے کی تکلیف نہیں کی۔ تاہم مجھے یہ یقین کرنے کیلئے شہادتوں کی ضرورت نہ تھی۔ کہ وہاں کیسی طرح سرگرمی سے میرا انتظار کیا جاتا تھا۔ میرے قدموں کی مانوس آہٹ پاتے ہی اس کا چہرہ کنول کی طرح شگفتہ ہوجاتا تھا۔ اور آنکھوں سے تمنا خیز شعاعیں نکلنے لگتیں

تھیں۔ یہاں چھ مہینے گزر گئے۔ اس زمانہ کو میری زندگی کی بہار سمجھنی چاہیئے۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں۔ جب میں آرزوؤں اور حسرتوں کے غم سے آزاد تھا۔ مگر دریا کی یہ سکون روانی میں تھرکتی ہوئی لہروں کی بہار کہاں۔ اب اگر محبت کا درد تھا تو اس کا جان بخش مزہ بھی تھا۔ اگر آرزوؤں کی جانگداز یاں تھیں تو ان کے ولولے بھی تھے آہ! میری یہ پیاسی آنکھیں اس چشمۂ حسن سے کسی طرح سیر نہ ہوتیں۔ جب میں اپنی مجنونہ آنکھوں سے اُسے دیکھتا تو مجھے ایک جان نواز روحانی طراوت کا احساس ہوتا۔ میں سرور دیدار سے بے کیف و بیخود ہو جاتا۔ اور گرمئی فکر کا تو کچھ حد و حساب نہ تھا۔ گویا میں جذبات شیریں کا سوتا کھل گیا تھا۔ اپنی شاعرانہ قدرت اور مضمون آفرینی پر خود حیرت ہوتی تھی۔ قلم ہاتھ میں لی۔ اور مضامین کا چشمہ سا بہہ نکلا۔ "نیرنگ" میں بلند خیالیاں نہ ہوں۔ عمق نہ ہو۔ مگر اس کا ایک ایک شعر روانی اور لطافت۔ گرمی و گدازی کی داد دے رہا ہے۔ یہ اس شمع کی برکت تھی جو اب میرے دل میں روشن ہو گئی تھی۔

یہ اس پھول کی مہک تھی۔ جو میرے دل میں کھلا ہوا تھا۔ محبت روح کی غذا ہے۔ یہ وہ امرت کی بوند ہے۔ جو مرے ہوئے جذبات کو زندہ کر دیتی ہے۔ محبت روحانی نعمت ہے۔ یہ زندگی کی سب سے پاک۔ سب سے اعلیٰ۔ سب سے مبارک برکت ہے یہی اکسیر تھی جس کی مجھے نا دانستہ تلاش تھی۔ وہ رات کبھی نہ بھولے گی جب عائشہ دلہن بنی ہوئی میرے گھر میں آئی "نیرنگ" اسی مبارک زندگی کی یادگار ہے۔ دنیا حسن ایک غنچہ تھی "نیرنگ" شگفتہ و شاداب اب پھول ہے۔ اور اس غنچہ کو کھلانے والی کون سی چیز ہے؟ وہی جس کی مجھے نادانستہ تلاش تھی۔ اور جسے میں اب پا گیا تھا۔

شکاری راجکمار

(۱)

مئی کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا۔ آفتاب کی آنکھیں سامنے سے ہٹ کر سر پر جا پہنچی تھیں، اس لئے اُن میں مروت نہ تھی، معلوم ہوتا تھا کہ زمین اُس کے خوف سے کانپ رہی ہے اسی گرمی اور شعلہ کے بیچ میں ایک شکاری ایک ہرن کے پیچھے جنونانہ جوش کے ساتھ گھوڑا بڑھائے چلا آتا تھا، شکاری کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور گھوڑا پسینے میں شل، لیکن ہرن سایہ آرزو کی طرح چھلانگیں مارتا، نالیوں اور جھاڑیوں پر اُڑتا چلا جاتا تھا۔ اُس کے پیر زمین پر نہیں، ہوا پر اُٹھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے یہ زندگی اور موت کی دوڑ تھی۔

پچھوا ہوا رہ رہ کر ڈراؤنی آواز سے گرجتی، غبار کے بادل ساتھ لئے آگ کے شعلے برساتی تھی۔ گھوڑے کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور سوار کی رگوں میں خون کھول رہا تھا۔ لیکن ہرن کے کاوے اسے بندوق سنبھالنے تک کا موقع نہ دیتے تھے اوکھ کے لہراتے ہوئے کھیت آئے، اور چھوٹ گئے ڈھاک کا جنگل دکھائی دیا اور پیچھے رہ گیا پہاڑیاں نظر آئیں اور کچھ دور ساتھ چل کر غائب ہو گئیں، یہ سب نظارے نقش باد کی طرح مٹتے چلے جاتے تھے۔

لمحہ بہ لمحہ اور قدم بہ قدم ہرن اور سوار کے درمیان فاصلہ بڑھتا جاتا تھا۔ دفعتہً ہرن پیچھے کی طرف مڑا، سامنے دیوار کی طرح سیدھے کراروں نے آڑ میں ایک ندی لہریں لے رہی تھیں، راہ فرار بند تھی۔ کرار پر سے نیچے کودنا موت کے منہ میں کودنا تھا، ہرن کے اعضا سست پڑ گئے اُس نے تلملائی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر

دیکھا۔ موت کی ڈراؤنی صورت چاروں طرف منڈلاتی ہوئی نظر آئی۔ شکاری کیلئے اتنی مہلت کافی تھی۔ موت نے فتح کی خوشی میں ایک دل ہلانے والا نعرہ مارا۔ ایک شعلہ پیدا ہُوا۔ اور ہرن زمین پر لوٹ گیا۔

(۲)

ہرن زمین پر تڑپ رہا تھا۔ اور شکاری کی آنکھوں سے سفاکانہ مسرت کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ گویا اُس نے آج وہ کام کیاہے جس پر فرشتوں کو بھی ناز ہو سکتا ہے اُس نے ہرن کو بالشت سے ناپا اور تب اُس کے شاندار سینگوں کو اطمینان سے دیکھا اس قدوقامت کا ہرن شاید ہی کسی کے ہاتھ آیا ہو۔ اس کے سینگوں سے کمرہ کی زینت دوچند ہو جائے گی۔ اور اُس کی دل فریب کھال تو آنکھوں کیلئے واقعی ایک ضیافت ہوگی

اب اُسے دھوپ کی تیزی کا احساس ہُوا۔ بدن کے ایک مسام سے شرارے نکل رہے تھے اس نے یوں ناک نگاہوں سے ندی کی طرف دیکھا۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی ایسا درخت بھی نہیں تھا جس کے سایہ میں بیٹھ کر ذرا دم لیتا۔

دفعتہً کرارے کے نیچے سے ایک کشیدہ قامت آدمی جھپٹ مار کر اوپر آیا اور اُسکے روبرو کھڑا ہو گیا۔ شکاری نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ ایسا خوش قامت خوش رو انسان آج تک اُسکی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ اُس کے سڈول جسم اور مردانہ حسن پر جادو طراز مصوّر شاعر بن سکتا تھا۔ اور سحر بیان شاعر مصوّر۔ اُس کی صفائی باطن اُس کے چہرہ پر۔ اور اس کی آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ایک ہمت کا مضبوط۔ آہنی ارادہ اور استقلال کا آدمی ہے یاس اور ناکامی اور خوف سے بیگانہ۔ دامن کوہ کے اس تناور درخت کی طرح جو آندھی اور طوفان اور شورش میں جھومتا ہے۔ مگر گرتا نہیں۔

مگر سنیاسی نے ہرن کو دیکھ کر قناعت آمیز آزادی سے کہا "راجکمار! تمہیں آج بہت اچھا شکار ہاتھ لگا ایسے ڈیل ڈول کا ہرن اس جوار میں شاید ہی ہو۔

راجکمار کو تعجب ہُوا۔ کہ یہ فقیر مجھے کیونکر پہچان گیا۔ مَیں نے تو اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ اُس کی آزادی میں وہ فطری رنگ نمایاں تھا۔ جس پر نخوت یا سوء ادب کا گمان نہیں ہو سکتا۔ بولے، جی ہاں میرا بھی ایسا ہی خیال ہے۔ میں نے اپنی شکاری زندگی میں ایسا ہرن نہیں دیکھا۔ لیکن اس کی بدولت آج مجھے بڑی تکلیف ہوئی۔

سنیاسی نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ بے شک تمہیں تکلیف ہوئی۔ تمہارا چہرہ سُرخ ہو رہا ہے۔ اور گھوڑا بھی بے دم ہو گیا ہے۔ کیا تمہارے ساتھ کے لوگ بہت پیچھے رہ گئے ؟

راجکمار نے اس انداز بے پروائی سے کہا۔ گویا انہیں ان باتوں کا مطلق خیال نہیں ہے۔ ”ابھی تو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں اور اُنہیں کچھ میری خبر بھی ہے یا نہیں لیکن آتے ہی ہوں گے۔ مَیں ان کی راہ دیکھ رہا ہوں۔

سنیاسی نے جواب دیا۔ تو یہاں دھوپ اور طوفان میں کھڑے کھڑے تم کب تک ان کا انتظار کرو گے۔ ہم جیسے فقیروں کو راجکماروں کے مہمان نوازی کی عزت کہاں ملتی ہے۔ لیکن شاید میری خوش نصیبی تمہیں یہاں تک لائی ہے۔ امیر تو تمہیں پیدا تا نے بنایا ہے۔ مگر تھوڑی دیر تک فقیری کا مزہ لے لو۔ دیکھو کہ جنگلی پھلوں میں دریا کے ٹھنڈے پانی میں پیال کے نرم بچھونے میں کتنا سُکھ اور اطمینان ہے۔

یہ کہکر سنیاسی نے اُس خاک اور خون میں لپٹے ہوئے ہرن کو ایسی آسانی سے اُٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ گویا وہ گھاس کا تودہ ہے اور راجکمار سے بولا۔ یوں تو میں ایک کرار سے نیچے اُتر جایا کرتا ہوں۔ مگر تمہارا گھوڑا شاید اُتر نہ سکے۔ اسلئے ایک دن کی راہ چھوڑ کر چھ مہینہ والی راہ چلیں گے۔ گھاٹ یہاں سے قریب ہے وہیں میرا جھونپڑا ہے۔

راجکمار سنیاسی کے پیچھے پیچھے چلے انہیں اُس کی جسمانی قوت پر حیرت ہو رہی تھی۔ آدھ گھنٹہ تک دونوں خاموش چلتے رہے۔ آخر زمین نشیب کی طرف مائل ہونی شروع ہوئی اور تھوڑی دیر میں گھاٹ آ پہنچا۔ وہیں قدم کے گھنے کنجوں کی چھاؤں میں جہاں ہمیشہ مرالو

کی محفل آراستہ رہتی ہے اور لہروں کا نغمہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ جہاں سبزہ زار پر مور تھرکتا ہے اور فاختہ اور کبوتر مست ہو ہو کر جھومتے ہیں۔ سنیاسی کا مختصر سا جھونپڑا لتاؤں اور بیلوں سے ہرا تا ہوا دکھائی دیا۔

(۳)

سنیاسی کی کٹی ہرے ہرے درختوں کے آغوش میں سادگی اور قناعت کی تصویر معلوم ہوتی تھی۔ راجکمار پر وہاں کی تازگی نے وہ جان بخش اثر کیا، جو مرجھائے ہوئے پودے پر پانی کی دھار کرتی ہے۔ انہیں آج تجربہ ہوا کہ حلاوت اور میٹھی نواں لطیف کی پابند نہیں اور نہ میٹھی نیند زرکار گدّوں اور تکیے کی محتاج ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوائیں آ رہی تھیں۔ آفتاب اپنے آتشیں تخت پر بیٹھا ہوا شاید اس گوشۂ عافیت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اور سنیاسی دھوپ اور چھاؤں کے فرش رقصاں پر بیٹھا ہوا مستانہ انداز سے گا رہا تھا۔

اودھو کرمن کی گت نیاری

راجکمار کے کانوں میں نغمہ کی بھنک پڑی، اٹھ بیٹھے اور سننے لگے انہوں نے اچھے اچھے کلاونتوں کی نغمہ سنجیوں کا لطف اٹھایا تھا۔ انہیں خود اس فن میں لطف و ذوق تھا۔ اس نغمے نے ان پر خود فراموشی کا سرور پیدا کر دیا۔ آواز میں کوئل کی کوک کی سی نزاکت اور صفائی تھی۔ ایک ایک لفظ مضراب کی طرح جذبات کے جدا جدا تاروں پر پڑتا تھا۔ اور انمیں رعشہ پیدا کر دیتا تھا۔ ایک سماں چھایا ہوا تھا۔ دل آنند کے نشہ میں جھومتا تھا۔ اور خیال اڑتا ہوا اس دیس میں جا پہنچا تھا۔ جہاں پریم بستا ہے۔ آرزوئیں کھلتی ہیں اور بے خودی کی لہریں اٹھتی ہیں۔ جہاں کچھ ایسی چیزیں ہیں، جو یہاں نہیں ہیں۔ جو نظر آتی ہیں۔ مگر بیان نہیں کی جا سکتیں۔ رہ رہ کر لحن کا تغیر اور اس کی بے ساختگی انہیں تڑپا دیتی تھی۔

سامنے دریا نے اپنا گلابی فرش بچھا رکھا تھا۔ اس کے دونوں طرف بالوں کے صندلی تختے تھے عالم خیال میں راجکمار کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ

معرفت کا دریا ہے جس کی لہریں وجد میں آکر آہستہ آہستہ سر ہلا رہی تھیں۔ سطح آب پر تیرنے والی مرغابیاں اور بگلے اور پن ڈبیاں ایسی معلوم ہوتی تھیں، گویا وہ نورانی شبنمی روحیں ہیں، جو اس نغمہ کے نشہ میں سرشار ہیں۔

جب گانا بند ہوا، تو راجکمار آکر سنیاسی کے سامنے بیٹھ گئے۔ اور عقیدت مندانہ جوش سے بولے، مہاتما جی! آپ کے منہ پر آپ کی بڑائی کرنا کچھ موزوں نہیں معلوم ہوتا، لیکن آپکے ویراگ اور پریم کا میرے دل پر جو اثر ہوا ہے وہ بہت دنوں تک قائم رہیگا۔ اگر دنیا کی بیڑیاں پیروں میں نہ ہوتیں، تو آپ کے قدموں سے جدا ہونے کا نام نہ لیتا۔ مجھے آج معلوم ہو گیا کہ آنند کا سرچشمہ کہاں ہے۔

جوش روحانی میں راجکمار کی زبان سے عقیدت اور انوراگ کی کتنی ہی باتیں نکل آئیں جن سے ان کی تقریر میں تکلّف اور مبالغہ کا رنگ پیدا ہو گیا۔ سنیاسی مسکرایا۔ یہی پامال گفتگو ہے۔ جیسے مانوس الفاظ جن کی تہ میں ممکن ہے کوئی عارضی اثر ہو۔ لیکن کس قدر جلد مٹنے والا۔ بولے، تمہاری باتیں سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی جی نہیں چاہتا کہ تمہیں جانے دوں۔ لیکن (مسکراکر) اگر میں جانے دوں، تو بھی تم نہیں جاسکتے۔ سورج ڈوب رہا ہے، اب تم دیوان نہیں پہنچ سکتے۔ تمہیں شکار کا بہت شوق ہے، اور مجھے اسکی دھن ہے آج ہم دونوں اپنے اپنے کمال دکھائیں گے خطرہ کا اندیشہ شائد تمہیں نہ روک سکتا۔ لیکن شکار کی امید تو ضرور ہی کامیاب ہوگی۔

راجکمار کو بہت جلد معلوم ہو گیا۔ کہ ابھی ابھی ویراگ اور عقیدت کی جو باتیں انہوں نے کہیں تھیں وہ دل سے نہیں زبان سے نکلی تھیں۔ زندگی بھر سنیاسی کے قدموں سے لپٹے رہنے کی بجائے انہیں یہاں ایک رات بھر رہنا دشوار نظر آتا تھا۔ گھر پر لوگ گھبرائیں گے معلوم نہیں کیا کیا خیالات پیدا ہوں۔ ہمراہیوں کی جان عذاب میں ہوگی۔ چلو ایک رات یوں ہی سہی۔ گھوڑے میں دم نہیں رہا اس پر چالیس میل کی منزل طے کرنے کے لئے بڑے صبر کی ضرورت ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے، کہ یہ مہاتما بھی شکار کھیلتے ہیں کیسا اجتماع

متدین ہے۔ غالباً ویدانتی ہیں۔ جو انسان کے ہاتھوں زندگی اور موت کے قائل نہیں ہوتے، ان کے ساتھ شکار کھیلنے میں واقعی مزہ آئے گا۔

اس طرح سوچ بچار کر انہوں نے سنیاسی کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور اپنی خوش نصیبی کی تعریف کی جس نے انہیں کچھ دیر اور اُن کی صحبت سے فیض اٹھانے کا موقع دیا۔

(۴)

رات کے دس بجے خوب اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ سنیاسی نے کہا۔ اب ہمارے چلنے کا وقت آگیا ہے۔ تیار ہو جائیے۔ راج کمار پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے۔ بندوق کندھے پر رکھ کر بولے، اس اندھیرے میں تو جنگلی سور خوب ملیں گے۔ لیکن خوفناک جانور ہے۔

سنیاسی نے ایک موٹا سا سونٹا ہاتھ میں لیا۔ اور بولے شاید اس سے بھی اچھے شکار ہاتھ لگیں۔ میں اکیلے کبھی خالی نہیں لوٹتا۔ آج تو ہم دو ہیں۔

دونوں شکاری دریا کے کنارے نالوں اور ریت کے ٹیلوں کو پار کرتے جھاڑیوں سے اُلجھتے چپ چاپ چلے جاتے تھے۔ ایک طرف نیلگوں ندی تھی۔ جس میں تارے ناچتے تھے۔ اور لہریں گاتی تھیں۔ دوسری طرف منجمد تاریکی تھی۔ بے جس اور بے حیات صرف جگنو کبھی کبھی اپنی نورانی صورت دکھا کر غائب ہو جاتے تھے۔ گویا وہ بھی اندھیرے میں نکلتے ڈرتے تھے۔

اس طرح کوئی ایک گھنٹے کی رفتار تیز کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ایک ٹیکرے پر گھنے درختوں کے بیچ میں آگ جلتی ہوئی دکھائی دی۔ ثابت ہوا کہ دنیا میں تاریکی کے سوا اور بھی کچھ ہے۔

سنیاسی نے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور دونوں ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر غور سے دیکھنے لگے۔ راجکمار نے بندوق بھر لی۔ ٹیکرے کے اوپر برگد

گا ایک گھنا درخت تھا، تاریکی کو اپنے سایہ حمایت میں لئے ہوئے۔ اُسی درخت کے نیچے دس بارہ آدمی بیٹھے ہوئے چرس کے دم لگا رہے تھے۔ سب کے سب مسلح تھے، بندوق کندھوں پر رکھے، چست مرزائیاں پہنے، اونچے قد، چوڑے سینے، وجیہ اور مردانہ صورتیں، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ کسی فوجی دستہ کا پڑاؤ ہے۔

راجکمار نے پوچھا، کیا یہ لوگ بھی شکاری ہیں۔

سنیاسی نے آہستہ سے کہا، ہاں یہ بڑے مشتاق شکاری ہیں، یہ راہ چلتے مسافروں کا شکار کرتے ہیں، بڑے سرکش جابر، خونخوار درندے ہیں، جن کے ظلم سے گاؤں کے گاؤں مٹ گئے، انہوں نے جتنے گھر تباہ کئے ہیں اور جتنے خون بہائے ہیں، اُن کا حساب پرماتما ہی جانتا ہوگا۔ اگر آپ شکار کرنا چاہتے ہیں، تو ان کا شکار کیجئے۔ ایسے شکار آپ کو بہت تلاش سے بھی نہ مل سکیں گے، یہی درندے ہیں، جن پر آپ کے تیر و تبر کا نشانہ پڑنا چاہئے۔ یہی راجاؤں اور فرمانرواؤں کے شکار ہیں، اسمیں آپ کا نام اور جس ہے۔

(۵)

راجکمار کے جی میں آئی، کہ وہ ایک ڈاکوؤں کو نشانۂ مرگ بناؤں، مگر سنیاسی نے کہا انہیں چھیڑنا خطرے سے خالی نہیں اگر اور کچھ نہ ہو تو بھی شکار چونک کر نکل جائے گا، آگے چلیں، ممکن ہے، اس سے بھی اچھے شکار ملیں۔

اب سپتمی کا چاند نظر آیا، شکاریوں نے دریا کا کنارہ چھوڑ کر اور راہ لی، بیہڑ بھی پیچھے رہ گیا تھا، سامنے ایک کچی سڑک دکھائی دی، کچھ آبادی کے نشان نظر آئے سنیاسی ایک عالیشان محل کے قریب آکے رکے جس کے چاروں طرف پختہ چار دیواری تھی، اور راجکمار سے بولے، آؤ، اس مولسری کے پیڑ پر بیٹھیں مگر دیکھو خبردار منہ سے نہ بولنا ورنہ ہم دونوں کی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ یہاں ایک خوفناک درندہ آیا کرتا ہے، جس نے بے شمار جانداروں کا خون کیا ہے،

شاید آج آجائے، تو ہم دونوں اس کا کام تمام کر دینگے۔

راجکمار دل میں بہت خوش ہوئے کہ اب یہ رات بھر کی دوڑ ٹھکانے لگے گی دونو مولسری کے پیڑ پر جا بیٹھے، راجکمار بندوق ہاتھ میں لئے کر شکار کا انتظار کرنے لگے جسے وہ تیندوا سمجھتے تھے۔

آدھی رات گزر چکی تھی، دفعتہً محل کے پاس کچھ ہلچل معلوم ہوئی اور دیوان خانہ کا دروازہ کھل گیا، مومی شمعوں کی روشنی احاطہ میں چاروں طرف پھیل گئی کمرہ کے ہر ایک گوشہ میں تکلف اور نفاست اور عیش پرستی کے جلوے نظر آتے تھے عین وسط میں ایک قوی ہیکل اور ذی رعب آدمی گلے میں ریشمی چادر ڈالے پیشانی پر زعفران کا ہلالی ٹیکہ لگائے مسند پر بیٹھا ہوا، زرکار حقہ نال سے دھواں نکال رہا تھا، تھوڑی دیر میں عناصر نشاط جمع ہونے لگے۔ ماہرویوں کے دل کے دل ہنستے چہکتے آکر بیٹھ گئے۔ انکی نازک ادائیوں اور اُن کی نشہ خیز بیباکیوں کا ایک طوفان برپا ہو گیا، جو کسی تناور درخت کو بھی جڑ سے اکھاڑ سکتا تھا۔ اندر کا اکھاڑہ سج گیا، ترانہ دلفریب کی آوازیں بلند ہوئیں، شیشہ و ساغر کے دور چلنے لگے۔

راجکمار نے حیرت سے پوچھا، یہ تو کوئی بڑا رئیس معلوم ہوتا ہے۔

سنیاسی نے جواب دیا، یہ رئیس نہیں ہیں، یہ ایک بڑے مندر کے مہنت ہیں۔ دنیا کو تیاگ چکے ہیں، دنیا کی نعمتوں کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھاتے پورے برہم چاری ہیں، ان کی باتوں میں معرفت کا دریا بہتا ہے، یہ سب اُن کی روحانی معرفت کے سامان ہیں، نفس کو مدت ہوئی قابو میں کر چکے ہیں۔ ہزاروں سیدھے سادے آدمی اُن پر اعتقاد رکھتے ہیں انکو اپنا دیوتا سمجھتے ہیں، اگر آپ شکار کرنا چاہتے ہیں تو ان کا شکار کیجئے، یہی راجاؤں اور فرمانرواؤں کے شکار ہیں ایسے ہی رنگے ہوئے سیاروں کا تعاقب آپ کے لئے مناسب ہے یہی دیا کار ہیں جن پر آپ کے تیر و تبر کا نشانہ پڑنا چاہئے۔ اسمیں آپکی رعیت کی بھلائی اور آپ کا جس ہے۔

(۶)

دونوں شکاری نیچے اُترے۔ سنیاسی جی نے کہا۔ اب رات زیادہ آگئی ہے، تم بہت تھک گئے ہو گے لیکن مجھے راجکماروں کے ساتھ شکار کھیلنے کے موقع کہاں ملتے ہیں میں ابھی ایک اور شکار کا پتہ لگاؤں گا۔ اور تب یہاں سے لوٹیں گے۔

راجکمار کو ان شکاروں میں سچے اپدیش کا لطف آرہا تھا۔ بولے۔ سوامی جی اُس بھگتی کا نام نہ لیجئے کاش میں برسوں آپکی خدمت میں رہتا۔ ایسے شکار کھیلنا سیکھتا۔

دونوں پھر آگے بڑھے اب کے راستہ بہت صاف اور کشادہ تھا۔ شاید کچی سڑک تھی۔ دورویہ درختوں کی قطار تھی اور بعض بعض آم کے درخت کے نیچے رکھوالے لیٹے ہوئے تھے گھنٹہ بھر کے بعد دونوں شکاری ایک بستی میں داخل ہوئے۔ جہاں کی سڑکیں لالٹین کی روشنی اور بڑی بڑی عمارتیں بتاتی تھیں کہ یہ کوئی بڑا قصبہ ہے۔ سنیاسی جی ایک عالیشان محل کے سامنے ایک درخت کے نیچے ٹھہر گئے۔ اور راجکمار سے بولے۔ یہ سرکاری عدالت ہے یہاں ریاست کا ایک بڑا عہدیدار رہتا ہے اسے صوبہ دار کہتے ہیں۔ صوبہ دار کی کچہری دن کو بھی لگتی ہے اور رات کو بھی۔

یہاں انصاف زر وجواہر کی تول بکتا ہے اُسکی قیمت حق نہیں ہے۔ بلکہ روپیہ اہل ثروت غریبوں کو پاؤں تلے کچلتے ہیں۔ اور کوئی اُنکی فریاد نہیں سنتا۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ یکایک بالاخانہ پر دو آدمی دکھائی دیئے دونوں شکاری درخت کی آڑ میں چھپ گئے۔ سنیاسی نے کہا۔ صوبیدار کوئی معاملہ طے کر رہے ہیں۔

اُوپر سے آواز آئی۔ تم نے ایک بیوہ عورت کی جائیداد ہضم کر لی ہے میں اسے خوب جانتا ہوں۔ یہ کوئی چھوٹا معاملہ نہیں ہے۔ اس معاملہ میں ایک ہزار سے نیچے بات نہیں کرنا چاہتا۔

راجکمار کو اور زیادہ سننے کی تاب نہ رہی۔ مارے غصہ کے لال ہو گئے۔ یہی جی چاہتا تھا۔ اس موذی کو واصلِ جہنم کر دوں۔ لیکن سنیاسی جی نے روکا۔ اور بولے نہ آج اس شکار کا موقع نہیں ہے۔ اگر آپ ڈھونڈیئے تو ایسے شکار آپ کو زندگی

یہاں بہت ملیں گے۔ میں نے ان کے کچھ ٹھکانے بتا دیئے ہیں۔ اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ کٹی ابھی یہاں سے دس میل ہو گی۔ آیئے قدم بڑھاتے ہوئے۔

(۷)

دونوں شکاری تین بجتے بجتے پھر کٹی میں آ پہنچے۔ اس وقت بڑی سہانی رات تھی۔ نسیم سحر نے پیڑوں اور پتوں کو ہلا ہلا کر نیند سے جگانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن شب ماہتاب کی پُر فریب روشنی تنویر صبح کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے تھی۔ راجکمار کو اُس وقت ہری ہری دوب میں ماں کی گود کا آرام ملا۔ سو کر اُٹھے تو دن خوب نکل آیا تھا۔ گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ سنیاسی جی نے کہا۔ ہاتھ منہ دھو لو۔ دھوپ ہو رہی ہے تمہیں سخت تکلیف ہو گی۔ دیوان یہاں سے بیس کوس سے کم نہیں ہے۔

آدھ گھنٹہ میں راجکمار تیار ہو گئے اور سنیاسی سے اپنی عقیدت اور احسان مندی کا اظہار کرنے کے بعد اُن کے قدموں پر سر جھکا کر گھوڑے پر سوار ہو گئے۔

سنیاسی جی نے اُن کی پیٹھ پر شفقت کا ہاتھ پھیرا اور دعائیں دے کر بولے۔ راجکمار تم سے ملاقات کر کے میری طبیعت بہت خوش ہوئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ تمہارے مزاج میں ابھی تک امیری درد اور دیا کو دبانے نہیں پائی۔ تمہیں پرماتما نے اپنی خلقت پر راج کرنے کے لئے پیدا کیا ہے تمہارا دھرم ہے کہ عدل اور رحم سے اپنی پرجا کی پرورش کرو۔ تمہارے لئے بیکس بے زبان جانوروں کا شکار کرنا موزوں نہیں۔ یہ تمہاری شان کے خلاف ہے ان غریب جانوروں کو مارنے میں کوئی دلیری، کوئی ساہس کوئی مردانگی نہیں ہے وہ انسان جو مٹھی بھر پر رکھنے والی چڑیا کو نشانہ بندوق بنا کر جامہ میں پھولا نہیں سماتا اُس کے جسم میں گدھ یا گیدڑ کی روح ہے اس بھول میں ہرگز نہ پڑو کہ شکار کا میدان جانبازی اور دلاوری اور ہمت کی درس گاہ ہے۔ جانبازی اور مردانگی کا سب سے بڑا مدرسہ بیکسوں کی دستگیری اور مظلوموں کی حمایت ہے۔ یقین مانو کہ

جو شخص محض تفریح طبع کے لئے جیوؤں کی ہتیا کرتا ہے، جیسے دوسروں کو ہلاک کرنے میں مزہ آتا ہے، وہ بے رحم جلاد سے بھی زیادہ بے رحم اور سنگدل ہے۔ جلاد کیلئے یہ ذریعہ معاش ہے۔ شکاری کیلئے ذریعہ تفریح۔ تمہارے لئے ایسے شکاروں کی ضرورت ہے۔ جن سے تمہاری رعیت کو آرام پہنچے۔ بیکس اور بےزبان جانوروں کے بجائے تمہیں اُن درندوں کے تعاقب میں دوڑنا چاہئے۔ جو لسانی دغا اور ابلہ فریبی کی آڑ میں دوسروں کو ہلاک کرتے ہیں۔ تمہارا نشانہ ہرن اور گیدڑ پر کیوں پڑے؟ اُسے اُس ریاکاری اور غارت گری اور ظلم پر پڑنا چاہئے۔ جو نہایت بیدردی سے تمہاری پرجا کا خون چوس رہی ہے۔ تمہاری نگاہ تیز فاختہ اور موروں پر کیوں پڑے؟ اُس کے لئے ایمان فروشی، خیانت اور بے ایمانی کے گھونسلے کیا نہیں ہیں؟ ایسے شکار کھیلو جن سے تمہیں روحانی اطمینان حاصل ہو۔ اور تمہاری نیک نامی اور جس پھیلے۔ تمہارا کام ہلاک کرنا نہیں ہے بلکہ زندہ رکھنا ہے۔ اگر ہلاک کرو، تو صرف زندہ رکھنے کے لئے۔ یہی تمہارا فرض ہے۔ جاؤ پرماتما کلیان کرے۔

کرموں کا پھل

(۱)

مجھے ہمیشہ آدمیوں کے پرکھنے کا ضبط رہا ہے اور تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ مطالعہ جیسی پُر دلچسپ، عبرت خیز اور انکشافات سے لبریز ہے اتنا شاید اور کوئی مطالعہ نہ ہوگا۔ لیکن اپنے دوست لالہ سائیں دیال سے بہت عرصہ تک دوستانہ اور بے تکلفانہ تعلقات رہنے پر بھی مجھے اُن کی تھاہ نہ ملی۔ مجھے ایسے لاغر جسم میں عارفانہ صبر اور سکون دیکھ کر حیرت ہوتی تھی، جو ایک نازک پودے کی طرح حوادث اور مصیبتوں کے جھونکے میں بھی اچل اور اٹل رہتا تھا۔ یوں وہ بہت ہی معمولی درجہ کا آدمی تھا، جس میں انسانی کمزوریوں کی کمی نہ تھی۔ وہ دعوے بہت کرتا تھا لیکن اُنہیں پورا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔ وہ دروغ گو نہ ہو، لیکن راستباز بھی نہ تھا۔ بے مروت نہ ہو، لیکن اس کی مروت چھپی رہتی تھی، اُسے اپنے فرض پر پابند رکھنے کے لئے دباؤ اور نگرانی کی ضرورت تھی، کفائت شعاری کے اصولوں سے بے خبر، محنت سے جی چرانے والا، اصولوں کا کمزور، ایک ڈھیلا ڈھالا معمولی آدمی تھا۔ لیکن جب کوئی مصیبت سر پر آپڑتی تو اس کے دل میں استقلال اور ہمت کی وہ زبردست طاقت پیدا ہو جاتی تھی، جسے شہادت کہہ سکتے ہیں۔ اُس کے پاس نہ دولت تھی، نہ مذہبی ارادت جو توکل اور تسلیم کا مخزن ہے ایک مختصر سے کپڑے کی دکان کے سوا کوئی معاش نہ تھی۔ ایسی حالتوں میں اس کی ہمت اور استحکام کا سوتا کہاں چھپا ہوا تھا، یہاں تک میری نگاہ تحقیق نہیں

پہنچی تھی۔

۲

باپ کے مرتے ہی مصیبتوں نے اس پر یورش شروع کی۔ کچھ تھوڑا سا قرض ترکہ میں ملا جسمیں حیرت انگیز ارتقائی طاقت پوشیدہ تھی۔ غریب نے ابھی ماتمی سے نجات نہیں پائی تھی کہ مہاجن نے نالش کی۔ عدالت کے طلسمی احاطہ میں پہنچتے ہی یہ مختصر رقم اُسی طرح پھولی جس طرح مشک پھولتی ہے ڈگری ہوئی۔ جو کچھ جمع تھا۔ برتن بھانڈے ہانڈی تو اس کے گہرے پیٹ میں سما گئے۔ مکان بھی نہ بچا۔ بے چارے مصیبتوں کے مارے سائیں دیال کا اب کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ بالکل آوارہ وطن کوڑی کوڑی کو محتاج۔ کئی کئی دن فاقہ سے گزر جاتے اپنی تو خیر چنداں فکر نہ تھی۔ لیکن بیوی تھی۔ دو تین بچے تھے۔ اُن کیلئے تو کوئی نہ کوئی فکر کرنی ہی پڑتی تھی۔ کنبہ کا ساتھ اور یہ بے سروسامانی بڑا دردناک نظارہ تھا شہر سے باہر ایک درخت کی چھاؤں میں یہ شخص اپنے مصیبت کے دن کاٹ رہا تھا سارے دن بازاروں کی خاک چھانتا۔ آہ! میں نے ایک بار اُسے ریلوے اسٹیشن پر دیکھا اُس کے سر پر ایک بھاری بوجھ تھا۔ اُس کا نازک نازپروردہ جسم پسینہ میں تر تھا۔ پیر مشکل سے اُٹھتے تھے دم پھول رہا تھا۔ لیکن چہرے پر مردانہ استقلال اور مضبوط ارادے کا نور تھا۔ بشرہ سے کامل صبر جھلک رہا تھا۔ ایسا مطمئن تھا۔ گویا اُس کا آبائی پیشہ ہے۔ میں حیرت سے اُس کا منہ تکتا رہ گیا۔ ہمدردانہ رنج و ملال کے اظہار کی جرأت نہ ہوئی۔ کئی مہینے تک یہی کیفیت رہی۔ بالآخر اس کی ہمت اور قوت برداشت اُسے اس دشوار گزار وادی سے باہر نکال لائی۔

(۳)

تھوڑے ہی دنوں کے بعد مصیبتوں نے اُس پر حملہ کیا۔ ایشور ایسا دن دشمن کو بھی نہ دکھلائے۔ میں ایک مہینہ کیلئے بمبئی چلا گیا تھا۔ وہاں سے لوٹ کر اسکی ملاقات کو گیا۔ آہ! وہ نظارہ یاد کرکے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل خوف و استکراہ سے کانپ اُٹھتا ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ میں نے دروازہ پر آواز دی اور اپنے معمول کے

مطابق بے تکلف اندر چلا گیا۔ مگر وہاں سائیں دیال کو وہ ہنس مکھ چہرہ جس پر مردانہ ہمت کی فرحت بخش تازگی جھلکتی تھی۔ نظر نہ آیا۔ میں ایک ماہ بعد اُس کے گھر جاؤں اور وہ آنکھوں سے روتے، لیکن ہونٹوں سے ہنستے، دوڑ کر میرے گلے سے لپٹ نہ جائے ضرور کوئی آفت ہے۔ اُس کی بیوی سر چھپائے آئی اور مجھے اُس کے کمرہ میں لے گئی۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ سائیں دیال ایک چارپائی پر میلے کچیلے کپڑے لپیٹے آنکھیں بند کئے پڑا درد سے کراہ رہا تھا۔ جسم اور بچھونے پر مکھیوں کے گچھے کے گچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آہٹ پاتے ہی اُس نے میری طرف دیکھا۔ میرے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ نقاہت کی اِس سے زیادہ سچی اور پُر درد تصویر نہیں ہو سکتی اس کی بیوی نے میری طرف مایوسانہ نگاہوں سے دیکھا۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ اس سمٹے ہوئے ڈھانچے میں بیماری کو بھی مشکل سے جگہ ملتی ہو گی زندگی کا کیا ذکر! آخر میں نے آہستہ سے پکارا۔ آواز سنتے ہی وہ بڑی بڑی آنکھیں کھل گئیں۔ لیکن اُن میں یاس اور غم کے آنسو نہ تھے۔ توکل اور رضا کی روشنی تھی اور وہ زرد چہرہ! آہ۔ وہ صبر متین کی خاموش تصویر، وہ صابرانہ عزم کی زندہ یادگار۔ اس کی زردی میں مردانہ ہمت کی سُرخی جھلکتی تھی۔ میں اُس کی صورت دیکھ کر گھبرا گیا۔ کیا یہ بجھتے ہوئے چراغ کی آخری جھلک تو نہیں ہے۔

میری سہمی ہوئی صورت دیکھ کر وہ مسکرایا۔ اور بہت ہی دھیمی آواز میں بولا
تُم ایسے اُداس کیوں ہو۔ یہ سب میرے کرموں کا پھل ہے۔

مگر کچھ عجیب بد قسمت آدمی تھا۔ مصیبتوں کو اُس سے کوئی خاص اُنس تھا۔ کسے اُمید تھی۔ کہ وہ اس جاں سوز مرض سے شفا پائے گا۔ ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا تھا موت کے منہ سے نکل آیا۔ اگر مستقبل کا ذرا بھی علم ہوتا۔ تو سب سے پہلے میں اُسے زہر دے دیتا۔ آہ! اس غمناک حادثہ کو یاد کر کے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ حیف ہے۔ اس زندگی پر کہ باپ اپنی آنکھوں سے اپنے اکلوتے بیٹے کا سوگ دیکھے۔

کیا منسور نگھو، کیسا خوبصورت ہونہار لڑکا تھا۔ کیسا خلیق کیسا شیریں زبان حیا شعار۔ موت نے اسے چھانٹ لیا۔ پلیگ کی دُہائی مچی ہوئی تھی۔ شام کو گلٹی نکلی اور صبح کو! کیسی منحوس نامبارک صبح تھی۔ وہ زندگی چراغ سحری کی طرح بجھ گئی۔ میں اُس وقت اُس بچے کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور سائیں دیال دیوار کا سہارا لئے ہوئے خاموش آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ میری اور اُس کی آنکھوں کے سامنے ظالم اور بے رحم موت نے اس بچے کو ہماری گود سے چھین لیا۔ میں روتے ہوئے سائیں دیال کے گلے سے لپٹ گیا۔ سارے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ غریب ماں پچھاڑیں کھا رہی تھیں بہنیں دوڑ دوڑ کر بھائی کی لاش سے لپٹتی تھیں۔ ذرا دیر کے لئے حسد نے بھی ہمدردی کے آگے سر جھکا دیا تھا۔ محلہ کی عورتوں کو آنسو بہانے کے لئے دل پر زور ڈالنے کی ضرورت نہ تھی۔

جب میرے آنسو تھمے تو میں نے سائیں دیال کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں تو آنسو بھرے ہوئے تھے۔ آہ! صبر کا آنکھوں پر کوئی بس نہیں۔ لیکن چہرہ پر مردانہ تسلیم اور استقلال کا رنگ نمایاں تھا۔ اس غم و الم کے سیلاب اور طوفان میں بھی سکون کی کشتی اس کے دل کو ڈوبنے سے بچائے ہوئے تھی۔

اس نظارہ نے مجھے متحیر نہیں مبہوت کر دیا۔ ممکنات کی حدیں کتنی ہی وسیع ہوں، ایسی جانکاہی کے عالم میں حواس اور اطمینان کو قائم رکھنا اُن حدود سے پرے ہے۔ لیکن اس لحاظ سے سائیں دیال انسان نہیں، فوق الانسان تھا۔ میں نے روتے ہوئے کہا۔ بھائی صاحب اب صبر کی آزمائش کا موقعہ ہے۔

اُس نے مستقل انداز سے جواب دیا۔ ہاں یہ کرموں کا پھل ہے۔

میں ایک بار پھر بھونچک ہو کر اُس کا منہ تکنے لگا۔

بنسا بنسا بنس بنیت

لیکن سائیداس کا یہ زاہدانہ توکل اور تحمل اپنی آنکھوں سے دیکھنے پر بھی میرے دل میں شکوک باقی تھے۔ ممکن ہے جب تک صدمہ تازہ ہے۔ صبر کی باندھ قائم رہے لیکن اس کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ اس میں شگاف ہو گئے ہیں وہ اب زیادہ عرصہ تک غم والم کی لہروں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

کیا کوئی دنیاوی حادثہ اتنا عبرتناک، اتنا دلخراش، اتنا جگر سوز ہو سکتا ہے صبر اور استقلال اور رضا و تحمل یہ سب اس آندھی کے سامنے خاشاک سے زیادہ نہیں۔ مذہبی عقائد حتّےٰ کہ معرفت بھی اس کے سامنے سر جھکا دیتی ہے اس کے جھونکے یقین اور ایمان اور عقائد کی جڑیں ہلا دیتے ہیں۔

لیکن میرا گمان غلط نکلا سائیں دیال نے صبر کو ہاتھ سے نہ دیا وہ حسبِ دستور زندگی کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ دوستوں کی ملاقاتیں اور کنارِ دریا کی سیر اور تفریح اور میلوں کی چہل پہل، ان دلچسپیوں میں اس کے دل کو کھینچنے کی طاقت اب بھی باقی تھی۔ میں اس کی ایک ایک حرکت کو ایک ایک بات کو غور سے مطالعہ کرتا۔ میں نے دوستی کے آداب و آئین کو فراموش کر کے اسے اس عالم میں دیکھا۔ جہاں اس کے خیالات کے سوا اور کوئی غیر نہ تھا۔ لیکن اس عالم میں بھی اس کے چہرہ پر اسی مردانہ تحمل کا جلوہ تھا۔ اور شکوہ شکایت کا ایک لفظ بھی اس کی زبان پر نہیں آیا۔

(۶)

اسی اثناء میں میری چھوٹی لڑکی حیدر ملکھی نمونیا کی نذر ہو گئی۔ جن کے دھندے سے فرصت پا کر جب میں گھر پر آتا اور اسے پیار سے گود میں اٹھا لیتا تو میرے دل کو جو تفریح اور روحانی تقویت ہوتی تھی۔ اسے لفظوں میں ادا نہیں کر سکتا اس کی ادائیں حرف دلربا نہیں، غم ربا تھیں۔ جس وقت وہ ہمک کر میری گود میں آتی تو مجھے کونین کی دولت مل جاتی تھی۔ اس کی شرارتیں کتنی دلآویز تھیں اب حقّہ میں

لطف نہیں رہا۔ کوئی چلم کو گرانے والا نہیں۔ کھانے میں مزہ نہیں آتا۔ کوئی تھالی کے پاس بیٹھا ہوا اس پر تصرف بیجا نہیں کرتا۔ میں اُس کی لاش کو گود میں لئے بلک بلک کر رو رہا تھا۔ جی چاہتا تھی۔ کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ یکایک میں نے سائیں دیال کو آتے دیکھا۔ میں نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے اور اس ننھی سی جان کو زمین پر لٹا کر باہر نکل آیا۔ اس صبر و تحمل کے دیوتا نے میری طرف ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا۔ اور میرے گلے سے لپٹ کر رونے لگا۔ میں نے کبھی اُسے اس طرح چیخیں مار کر روتے نہیں دیکھا تھا۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اضطراب سے بے سدھ اور بے حال ہو گیا۔ یہ وہی شخص ہے جس کا اکلوتا بیٹا مرا اور پیشانی پر بل نہیں آیا۔ یہ کایا پلٹ کیوں۔

(۷)

اس سانحہ کے کئی دن بعد جبکہ غم رسیدہ دل سنبھلنے لگا تھا۔ ایک روز ہم دونوں دریا کی سیر کو گئے۔ شام کا وقت تھا۔ دریا کہیں سنہرا کہیں نیلگوں کہیں سیاہ۔ کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح آہستہ آہستہ بہ رہا تھا۔ ہم دور جا کر ایک ٹیلہ پر بیٹھ گئے۔ لیکن طبیعت گفتگو کی طرف مائل نہ تھی۔ دریا کی خاموش روانی نے ہمکو بھی محوِ خیال کر دیا۔ دریا کی موجیں خیال کی لہروں کو پیدا کر دیتی ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ کہ پیاری چندر مکھی لہروں کی گود میں بیٹھی مسکرا رہی ہے۔ میں چونک پڑا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے دریا میں منہ دھونے لگا۔ سائیں دیال نے کہا بھائی صاحب! دل کو مضبوط کرو اس طرح کڑھو گے۔ تو ضرور بیمار ہو جاؤ گے۔ میں نے جواب دیا۔ ایشور نے جتنا ضبط تمہیں دیا ہے۔ اسمیں سے تھوڑا سا مجھے بھی دے دو۔ میرے دل میں اتنی طاقت کہاں! سائیں دیال مسکرا کر میری طرف تاکنے لگا۔

میں نے اسی سلسلہ میں کہا۔ کتابوں میں تو استقلال اور صبر کی بہت سی روائتیں پڑھی ہیں۔ مگر یقین مانو۔ کہ تم جیسا مستقل مزاج، خندہ طلعت

میں سیدھا کھرا رہنے والا انسان آج تک میری نظر سے نہیں گذرا۔ تم جانتے ہو، کہ مجھے انسانی خاصیات کے مطالعہ کا ہمیشہ سے شوق ہے لیکن میرے تجربہ میں تم اپنی قسم کے اکیلے آدمی ہو۔ میں یہ نہ مانوں گا۔ کہ تمہارے دل میں دردو گداز نہیں ہے۔ اسے میں اپنی آنکھوں دیکھ چکا ہوں۔ پھر اس عارفانہ صبر و اطمینان کا راز تم نے کہاں چھپا رکھا ہے۔ تمہیں اس وقت یہ راز مجھ سے کہنا پڑے گا۔

سائیں دیال کچھ شش و پنج میں پڑ گیا اور زمین کی طرف تاکتے ہوئے بولا، یہ کوئی راز نہیں، میرے کرموں کا پھل ہے۔

یہ جملہ میں نے چوتھی بار اس کی زبان سے سُنا اور بولا۔ جن کرموں کا پھل ایسا تقویت بخش ہے اُن کرموں کی کچھ مجھے بھی تلقین کر دیں۔ میں ایسے پھلوں سے کیوں محروم رہوں۔

سائیں دیال نے پُر حسرت لہجہ میں کہا، ایشور نہ کرے کہ تم سے ایسے کرم سرزد ہوں، اور تمہاری زندگی پر اُن کا سیاہ داغ لگے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ مجھے اپنی نگاہ میں ایسا شرمناک اور ایسا قبیح معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی مجھے جو کچھ سزا ملے میں اُسے خوشی کے ساتھ جھیلنے کو تیار ہوں آہ! میں نے ایک ایسے پاکیزہ خاندان کو جہاں میرا اعتبار اور وقار تھا، اپنی نفس کی غلاظت سے ملوث کیا۔ ایک ایسے پاک دل کو جس میں محبت کا درد تھا، جو باغ حسن کی ایک نوشگفتہ کلی تھی، جس میں سادگی اور وفا تھی۔ اُس پاک دل میں میں نے گناہ اور دغا کا بیج ہمیشہ کیلئے بو دیا۔ یہ گناہ ہے جو مجھ سے سرزد ہوا ہے۔ اور اس کا پلّہ اُن مصیبتوں سے بہت بھاری ہے جو میرے اوپر اب تک پڑی ہے یا آئندہ پڑیں گی۔ کوئی سزا کوئی صدمہ، کوئی نقصان اُس کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔

مجھے خواب میں بھی یہ گمان نہیں تھا کہ سائیں دیال اپنے عقائد کا اتنا مضبوط

ہے۔ گناہ ہر شخص سے ہوتے ہیں۔ ہماری انسانی ہستیاں گناہوں کی طولانی فہرستیں ہیں۔ وہ کون سا دامن ہے جس پر سیاہ داغ نہ ہوں۔ لیکن کتنے ایسے آدمی ہیں جو اپنے اعمال کی سزاؤں کو ایسی خندہ پیشانی سے جھیلنے کیلئے تیار ہوں۔ ہم آگ میں کودتے ہیں۔ لیکن جلنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

میں سائیں دیال کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ ان باتوں کو سن کر میری نظروں میں اس کی عزت سہ چند ہو گئی۔ ایک معمولی دنیادار انسان کے سینہ میں ایک فقیر کا دل چھپا ہوا تھا۔ جس میں معرفت کا نور چمکتا تھا۔ میں نے اس کی طرف ارادتمند آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے گلے سے لپٹ کر بولا۔

سائیں دیال، اب تک میں تمہیں ایک مستقل مزاج آدمی سمجھتا تھا لیکن آج معلوم ہوا کہ تم اُن پاک نفسوں میں ہو جن کا وجود دنیا کے لئے برکت ہے۔ تم ایشور کے سچے بھگت ہو۔ اور میں تمہارے قدموں پر سر جھکاتا ہوں۔

تمت بالخیر

مناوَن

(۱)

بابو دیال شنکر ان لوگوں میں تھے جنہیں اُس وقت تک لُطف صحبت نہیں حاصل ہوتا جب تک کہ وہ معشوق کی تیزیِ زبان کا مزہ نہ اُٹھائیں روٹھے ہوئے کو منانے میں اُنہیں بڑا حظ ہوتا۔ پھری نگاہیں کبھی کبھی نشۂ محبت کی متوالی آنکھوں سے بھی زیادہ دلرُبا معلوم ہوتیں۔ کبھی کبھی معشوقانہ بے اعتنائیاں اور ترشیاں گرمجوشی سے بھی زیادہ دلفریب محسوس ہوتیں شکر رنجیوں میں شکر ریزیوں سے زیادہ سرور حاصل ہوتا۔ پانی میں ہلکے ہلکے جھکورے کیسا سماں دکھا جاتے ہیں۔ جب تک دریا میں دھیرا دھیرا تلاطم نہ ہو۔ لطف سیر نہیں۔

اگر بابو دیا شنکر کو ان دلچسپیوں کے کم موقعے ملتے تھے تو یہ اُن کا قصور نہ تھا۔ گرجا طبعاً بہت نیک اور متین واقع ہوئی تھی۔ تاہم چونکہ اپنے شوہر کے رنگ مزاق کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ کبھی کبھی اپنی طبیعت کے خلاف محض اُن کی خاطر سے اُن سے روٹھ جاتی تھی۔ مگر یہ بے نیو کی دیوار ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ سنبھال سکتی۔ اُس کی آنکھیں اس کے ہونٹ اور اُس کا دل یہ بہروپ زیادہ دیر تک نہ رکھ سکتے۔ آسمان پر گھٹائیں آتیں۔ مگر ساون کی نہیں۔ کنوار کی۔ وہ ڈرتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہنسی میں رونا آجائے۔ آپس کی بدمزگی کے خیال سے اس کی روح فنا ہو جاتی تھی۔ مگر ان موقعوں پر بابو صاحب کو جیسی جیسی رجھانے والی گھاتیں سوجھتیں وہ کاش طالب علمی کے زمانہ میں سوجھی ہوتیں تو وہ

کئی سال تک قانون سے سر مارنے کے بعد بھی معمولی کلرک نہ رہتے۔

(۲)

دیاشنکر کو قومی کانفرنسوں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کی بنیاد اسی زمانہ میں پڑی، جب وہ درگاہ قانون کے مجاور تھے۔ اور وہ اب تک قائم تھی۔ روپیوں کی تھیلی غائب ہو گئی تھی۔ مگر کندھوں میں درد موجود تھا۔ اس سال کانفرنس کا جلسہ ستارہ میں ہونے والا تھا۔ مقررہ تاریخ سے ایک روز قبل بابو صاحب ستارہ کو روانہ ہوئے۔ سفر کی تیاریوں میں اسقدر منہمک تھے کہ گرجا سے بات چیت کرنے کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔ آنے والی خوشیوں کی امید اس چند روزہ جدائی کے خیال پر غالب تھی۔

کیسا شہر ہو گا۔ بڑی تعریف سنتے ہیں۔ دکن حسن اور دولت کی کان ہے خوب سیر رہے گی۔ حضرت تو ان دلخوش کن خیالوں میں سرمست تھے اور گرجا آنکھوں میں آنسو بھرے اپنے دروازہ پر کھڑی یہ کیفیت دیکھ رہی تھی۔ اور ایشور سے منتیں کر رہی تھی۔ کہ انہیں خیریت سے لانا۔ وہ خود ایک ہفتہ کیونکر کاٹے گی یہ خیال بہت جگر دوز تھا۔

گرجا ان خیالات میں محو تھی۔ اور دیاشنکر سامان سفر میں یہاں تک کہ سب تیاریاں پوری ہو گئیں۔ یکہ دروازہ پر آ گیا۔ بستر اور ٹرنک اس پر رکھ دیئے گئے۔ اور تب الوداعی ملاقات کی باتیں ہونے لگیں۔ دیاشنکر گرجا کے سامنے آئے اور مسکرا کر بولے۔ "اب جاتا ہوں۔"

گرجا کے کلیجے میں ایک برچھی سی لگی۔ بے اختیار جی چاہا۔ کہ ان کے سینہ سے لپٹ کر روؤں۔ آنسوؤں کا ایک سیلاب سا آنکھوں میں آتا ہوا معلوم ہوا۔ مگر ضبط کر کے بولی۔ جانے کو کیسے کہوں، کیا وقت آ گیا؟

دیاشنکر۔ ہاں بلکہ دیر ہو رہی ہے۔

گرجا۔ منگل کو شام کی گاڑی سے آؤ گے نا؟

دیاشنکر۔ ضرور کسی طرح نہیں رُک سکتا۔ تم صرف اُسی دِن میرا انتظار کرنا۔
گرجا۔ ایسا نہ ہو بھول جاؤ۔ ستارہ بہت اچھا شہر ہے۔
دیاشنکر (ہنس کر) وہ بہشت ہی کیوں نہ ہو۔ منگل کو یہاں ضرور آجاؤں گا
دِل برابر یہیں رہے گا۔ تم ذرا نہ گھبرانا۔

یہ کہہ کر گرجا کو گلے سے لگا لیا۔ اور مسکراتے ہوئے باہر نکل آئے۔ یکہ روانہ ہوگیا۔
گرجا پلنگ پر بیٹھ گئی۔ خوب روئی۔ مگر اس غم فرقت، سیلاب اشک، دردِ تنہائی اور
ہجوم جذبات کے ساتھ ایک اور خیال دِل میں جاگزیں تھا۔ جسے وہ بار بار ہٹانے
کی کوشش کرتی تھی۔ کیا ان کے پہلو میں دِل نہیں ہے۔ یا ہے تو اُس پر اُنہیں پوری
قدرت حاصل ہے؟ وہ مسکراہٹ جو رخصت ہوتے وقت دیاشنکر کے چہرہ پر جھلک
رہی تھی۔ گرجا کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

(۳)

ستارہ میں بڑی دھوم دھام تھی، دیاشنکر گاڑی سے اُترے تو نندی پوش
والنٹیروں نے اُن کا استقبال کیا۔ ایک فٹن اُن کے لئے تیار کھڑی تھی، اُس پر
بیٹھ کر وہ کانفرنس پنڈال کی طرف چلے، دو رویہ برقیں لہرا رہی تھیں دروازہ
پر بندھن واریں لٹک رہی تھیں، عورتیں اپنے جھروکوں سے اور مرد برآمدوں میں
کھڑے ہو ہو کر مسرت کی تالیاں بجاتے تھے، اس شان و شکوہ کے ساتھ وہ پنڈال
میں پہنچے اور ایک خوبصورت خیمہ میں فروکش ہوئے، یہاں آسائش کے سب سامان
مہیا تھے، دس بجے کانفرنس شروع ہوئی، مقررین اپنی اپنی زبانی لطافت کے
جوہر دِکھانے لگے، کسی کے ظرافت آمیز چٹکلوں پر واہ واہ کی دھوم مچ گئی کسی
کی شعلہ بار فصاحت نے دِلوں میں جوش کی ایک لہر سی پیدا کر دی، عالمانہ رنگ
کی تقریروں کے مقابلہ میں ظرافت اور تمسخر اور حسن بیان کی زیادہ داد ملی، حاظرین
کو اُن تقریروں میں تھیٹر کے نغموں کا سا لُطف آتا تھا۔

کئی دِن تک یہی کیفیت رہی۔ اور تقریروں کے اعتبار سے کانفرنس شاندار

کامیابی حاصل ہوئی۔ منگل کا دن آیا۔ بابو صاحب واپسی کی تیاریاں کرنے لگے۔ آج انہیں مجبوراً ٹھہرنا پڑا۔ صوبہ بمبئی اور صوبہ متحدہ کے ڈیلیگیٹوں میں ایک ہاکی میچ کی ٹھہر گئی۔ بابو دیاشنکر ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ وہ بھی ٹیم میں داخل کر لیے گئے۔ انہوں نے کوشش کی اپنا گلا چھڑاؤں، مگر ان کی عذر معذرت پر بالکل توجہ نہ کی۔ ایک صاحب جو زیادہ بے تکلف تھے۔ بولے تمہیں اسقدر عجلت کیوں ہے؟ تمہارا دفتر ابھی ہفتہ بھر بند ہے۔ بیوی صاحبہ کی خفگی کے سوا مجھے اس عجلت کا کوئی سبب نظر نہیں آتا۔ دیاشنکر نے جب دیکھا کہ عنقریب مجھ پر زن مرید کی پھبتیاں چُست کی جانیوالی ہیں جن سے زیادہ ہتک آمیز مرد کی شان میں کوئی دوسرا کلمہ نہیں کہا جاسکتا تو انہوں نے مفر کی کوئی صورت نہ دیکھ کر واپسی ملتوی کر دی۔ اور ہاکی میں شریک ہو گئے۔ مگر دل میں یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ شام کی گاڑی سے ضرور چلے جائیں گے۔ پھر چاہے کوئی زن مرید نہیں زن مرید کا باپ کہے، ایک نہ مانیں گے۔

خیر پانچ بجے کھیل شروع ہوا۔ دونوں طرف کے کھلاڑی مشاق اور چابکدست تھے، جنہوں نے ہاکی کھیلنے کے سوا زندگی میں اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔ کھیل بڑے جوش اور سرگرمی سے ہونے لگا۔ کئی ہزار تماشائی جمع تھے۔ ان کی تالیاں اور بڑھاوے کھلاڑیوں پر مہمیز کا کام کر رہے تھے اور گیند کسی نامراد کی قسمت کی طرح ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ دیاشنکر کے ہاتھوں کی تیزی اور صفائی، ان کی گرفت اور بے عیب نشانہ بازی پر لوگ عش عش کرتے تھے، یہاں تک کہ جب وقت ختم ہونے میں صرف ایک منٹ باقی رہ گیا تھا۔ اور طرفین کے لوگ ہمتیں ہار چکے تھے تو دیاشنکر نے گیند لیا اور بجلی کی طرح فریق مخالف کے گول پر پہنچ گئے۔ ایک پٹاخے کی آواز ہوئی، چاروں طرف سے "گول" کا نعرہ بلند ہوا۔ الہ آباد کی جیت ہوئی۔ اس فتح کا سہرا دیاشنکر کے سر تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غریب دیاشنکر کو اس وقت بھی رکنا پڑا اور محض اتنا ہی نہیں، ستارہ اسیٹر کلب کی طرف سے اس فتح کی مبارکباد میں ایک ناٹک کھیلنے کی تجویز ہوئی، جس سے بدھ کے روز بھی روانہ ہونے کی امید باقی نہ رہی۔

دیا شنکر نے دل میں بہت پیچ و تاب کھایا۔ مگر زبان سے کیا کہتے۔ زن مرید کہلانے کا خوف زبان بند کئے ہوئے تھا۔ حالانکہ اُن کا دل کہہ رہا تھا کہ اب کی دیوی رُوٹھیں گی تو بغیر خوشامدوں سے نہ مانیں گی ؛

(۴)

بابو دیا شنکر روز وعدہ کے تین دن بعد مکان پر پہنچے ستارہ سے گرجا کیلئے کئی نادر تحفے لائے تھے۔ ان چیزوں کو کچھ اسطرح دیکھا گیا گویا ان سے اُس کا جی سیر ہو گیا ہے اُس کا چہرہ اُتر گیا اور ہونٹ خشک تھے۔ دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا چلتے وقت دیا شنکر کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے ہوتے۔ کم از کم چہرہ کچھ اُداس اور آواز کچھ بھاری ہو گئی ہوتی تو غالباً گرجا اُن سے نہ روٹھتی۔ آنسوؤں کی چند بوندیں اُس کے دل میں اس خیال کو تر و تازہ رکھتیں۔ اُنکے نہ آنے کا سبب چاہے اور کچھ ہو۔ بے اعتنائی ہرگز نہیں ہے۔ غالباً دریافت حال کیلئے اُنہوں نے تار دیا ہوتا اور اپنے شوہر کو اپنے سامنے بخیریت دیکھ کر وہ بے اختیار اُنکے سینہ سے جا چمٹتی اور دیوتاؤں کی ممنون ہوتی مگر آنکھوں اور چہرہ کی وہ ظالمانہ شگفتگی اسوقت اس کے گوشہ جگر میں کھٹک رہی تھی۔ دلمیں خیال جم گیا تھا چاہے اُنکے لئے مر بھی مٹوں مگر انہیں میری پرواہ نہیں ہے۔ دوستوں کا اصرار اور ضد محض حیلہ ہے۔ کوئی زبردستی کسی کو روک نہیں سکتا۔ خوب! میں تو رات کی رات بیٹھ کر کاٹوں اور وہاں مزے اُڑائے جائیں۔

بابو دیا شنکر کو روٹھوں کے منانے کا خاص ملکہ تھا۔ اس موقع پر انہوں نے کوئی فکر کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ تحفے تو لائے تھے۔ مگر ان کا جادو نہ چلا تب ہاتھ جوڑ کر ایک پیر سے کھڑے ہوئے۔ گدگدایا۔ تلوے سہلائے کچھ شوخی اور شرارت کی۔ دس بجے تک انہیں مساعی جمیلہ میں مصروف رہے اس کے بعد کھانے کا وقت آیا۔ آج انہوں نے روکھی روٹیاں بڑے شوق سے اور معمولی مقدار سے دو چند کھائیں گرجا! آج ہفتہ بھر کے بعد روٹیاں نصیب ہوئی ہیں۔ ستارہ میں روٹیوں کو ترس گئے پوریاں کھاتے کھاتے آنتوں میں باؤ گولے پڑ گئے۔ یقین مانو گرجا! وہاں کوئی

آرام نہ تھا، نہ کوئی سیر نہ لطف سیر تو شخص اپنے دل کی کیفیت پر منحصر ہے جب طبیعت کو کوئی فکر ہو تو باغ ویرانے سے بھی زیادہ اُجاڑ معلوم ہوتا ہے کمبخت دل تو ہر دم یہیں دھرا رہتا تھا۔ وہاں لطف کیا خاک آتا تم چاہے ان باتوں کو محض بناوٹ سمجھ لو۔ کیونکہ میں تمہارے سامنے خطاوار ہوں۔ تمہیں اختیار ہے مجھے جھوٹا، مکار، دغاباز، زمانہ ساز جو سمجھو خیال کرو۔ مگر حقیقت یہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں، میری وعدہ فراموشی کا سبب دوستوں کی ضد تھی۔

دیا شنکر نے رو ٹھیوں کی خوب داد دی۔ کیونکہ پہلے کئی بار یہ ترکیب مفید ثابت ہوئی تھی مگر آج یہ منتر بھی بیکار گیا۔ ہوا اور گرجا کے تیور بدلے ہی رہے۔

سہ پہر کے وقت دیا شنکر گرجا کے کمرہ میں گئے۔ اور پنکھا جھلنے لگے یہاں تک کہ گرجا جھنجھلا کر بول اُٹھی۔ اپنی ناز برداریاں اپنے ہی پاس رکھئے۔ میں نے حضور سے بھر پایا۔ میں تمہیں پہچان گئی۔ اب دھوکہ نہیں کھانے کی۔ مجھے نہ معلوم تھا۔ آپ یوں دغا کریں گے۔ غرض جن الفاظ میں بے وفائیوں اور بے نیازیوں کی شکائتیں ہوا کرتی ہیں۔ وہ سب اس وقت گرجا نے صرف کر ڈالے

(۵)

شام ہوئی، شہر کی گلیوں میں موتیے اور بیلے کی لپٹیں آنے لگیں۔ سڑکوں پر چھڑکاؤ ہونے لگا۔ اور مٹی کی سوندھی خوشبو اڑنے لگی۔ گرجا کھانا پکانے جا رہی تھی، کہ اتنے میں اس کے دروازہ پر ایک یکہ آکر رُکا۔ اور اس میں سے ایک نازنین اُتر پڑی۔ اُس کے ساتھ ایک مہری تھی، اس نے اوپر آکر گرجا سے کہا "بہو جی۔ آپ کی سکھی آرہی ہیں۔"

یہ سکھی پڑوس میں رہنے والی اہلمد صاحب کی بیوی تھیں۔ اہلمد صاحب بوڑھے آدمی تھے اُن کی پہلی شادی اس وقت ہوئی تھی۔ جب دودھ کے دانت نہ ٹوٹے تھے۔ دوسری شادی حسن اتفاق سے اُس زمانہ میں ہوئی، جب منہ میں ایک دانت بھی باقی نہ تھا۔ لوگوں نے بہت سمجھایا کہ اب آپ بوڑھے ہوئے شادی نہ کیجئے۔

ایشور نے لڑکے دیئے ہیں، بہوئیں ہیں۔ آپ کو کسی بات کی تکلیف نہیں ہو سکتی، مگر اہلمد صاحب خود بزرگ اور جہاں دیدہ آدمی تھے۔ ان بہی خواہانہ مشوروں کا جواب عملی مثالوں سے دیا کرتے تھے۔ کیوں کیا موت کو بوڑھوں سے کوئی دشمنی ہے۔ بوڑھے غریب اس کا کیا بگاڑتے ہیں۔ ہم باغ میں جاتے ہیں تو مرجھائے ہوئے پھول نہیں توڑتے۔ ہماری نگاہیں تر و تازہ، شاداب، خوب صورت پھولوں پر پڑتی ہیں۔ کبھی کبھی گجرے وغیرہ بنانے کیلئے کلیاں بھی توڑ لی جاتی ہیں۔ یہی کیفیت موت کی ہے۔ کیا جمراج کو اتنی سمجھ بھی نہیں ہے، میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، کہ جوان اور بچے بوڑھوں سے زیادہ مرتے ہیں۔ میں ابھی جوں کا توں ہوں، میرے تین جوان بھائی، پانچ بہنیں، بہنوں کے شوہر، تینوں بھاوجیں، چار بیٹے، پانچ بیٹیاں، کئی بھتیجے، سب میری آنکھوں کے سامنے اس دنیا سے چل بسے، موت سب کو نگل گئی، مگر میرا بال بیکا نہ کر سکی۔ یہ غلط بالکل غلط ہے، کہ بوڑھے آدمی جلد مر جاتے ہیں اور اصل بات تو یہ ہے کہ جوان بیوی کی ضرورت بڑھاپے ہی میں ہوتی ہے۔ بہوئیں میرے سامنے نکلا نہ چاہیں اور نہ نکل سکتی ہیں۔ بھاوجیں خود بوڑھی ہو گئیں چھوٹے بھائی کی بیوی میرا پرچھائیں بھی نہیں دیکھ سکتی ہیں۔ بہنیں اپنے اپنے گھر ہیں، لڑکے سیدھے منہ سے بات نہیں کرتے۔ میں ٹھہرا بوڑھا بیمار پڑوں تو پاس کون ٹھہرے؟ ایک لوٹا پانی کون دے؟ دیکھوں کس کی آنکھ سے؟ جی کیسے بہلاؤں، کیا خودکشی کر لوں، یا کہیں ڈوب مروں؟ ان دلیلوں کے مقابلہ میں کسی کی زبان نہ کھلتی تھی۔

غرض اس نئی اہلمدن اور گرجا میں کچھ بہناپا سا ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی اس سے ملنے آجایا کرتی تھی۔ اپنی قسمت پر شاکر عورت تھی۔ کبھی شکایت یا رنج کا ایک کلمہ زبان سے نہ نکالتی۔ ایک بار گرجا نے مذاقاً کہا تھا کہ بوڑھے اور جوان کا میل اچھا نہیں ہوتا۔ اس پر وہ ناراض ہو گئی، اور کئی دن تک نہ

آئی، گرجا مہری کو دیکھتے ہی فوراً آنگن میں نکل آئی۔ اور گو اس وقت مہمان کا آنا ناگوار گذرا۔ مگر مہری سے بولی۔ بہن اچھی آئیں۔ دو گھڑی دل بہلے گا۔

ذرا دیر میں الہمدن صاحب گہنے سے لدی ہوئی گھونگھٹ نکالے چھم چھم کرتے ہوئی آنگن میں آکر کھڑی ہوگئیں۔ گرجا نے قریب آکر کہا۔ واہ سکھی آج تو تم دلہن بنی ہوئی ہو۔ مجھ سے پردہ کرنے لگیں کیا۔" یہ کہکر اس نے گھونگھٹ ہٹا دیا۔ اور سکھی کا منہ دیکھتے ہی چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ دیا شنکر نے زور سے قہقہہ لگایا۔ گرجا کو سینے سے لپٹا لیا۔ اور منت آمیز لہجہ میں بولے۔ گرجی! اب مان جاؤ۔ ایسی خطا پھر کبھی نہ ہوگی۔ مگر گرجی الگ ہٹ گئی اور رکھائی سے بولی "تمہارا بہروپ بہت دیکھ چکی اب تمہارا اصلی روپ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

(۶)

دیا شنکر دریائے الفت کے ہلکے ہلکے تلاطم کا لطف تو ضرور اٹھانا چاہتے تھے مگر طوفان سے ان کی طبیعت بھی اسی قدر گھبراتی تھی جسقدر گرجا کی بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔ تالیف قلب کے جتنے منتر انہیں یاد تھے وہ سب انہوں نے پڑھے اور انہیں کارگر نہ ہوتے دیکھکر آخر ان کی طبیعت کو بھی الجھن ہونے لگی۔ یہ وہ مانتے تھے کہ بیشک مجھ سے خطا ہوئی ہے۔ مگر خطا ان کے خیال میں ایسی جانسوز سزاؤں کی مستحق نہ تھی۔ فن رضا جوئی میں وہ ضرور مشاق تھے مگر اس موقع پر ان کی عقل نے کچھ کام نہ دیا۔ انہیں ایسا کوئی جادو نظر نہیں آتا تھا جو اٹھتی ہوئی کالی گھٹاؤں اور زور پکڑتے ہوئے جھونکوں کو روکے۔ کچھ دیر تک وہ انہیں خیالوں میں خاموش کھڑے رہے۔ بعد ازاں بولے۔ "آخر گرجی! اب تم کیا چاہتی ہو۔"

گرجا نے نہایت ناہمدردانہ بے پروائی سے منہ پھیر کر کہا۔ "کچھ نہیں۔"

دیا شنکر جیسی تمہیں تو ضرور جاننی ہو، ورنہ چار دن تک بے آب و دانہ رہنا کیا معنی، کیا تجھ پر جان دینے کی کٹھائی ہے؟ آخر یہی فیصلہ ہے تو بہتر ہے۔ تم یوں جان دو، اور میں قتل کے جرم میں پھانسی پاؤں، قصہ تمام ہوئے ہو جائے۔ اچھا ہوگا، بہت اچھا ہوگا، دنیا کی پریشانیوں سے نجات ہو جائے گی۔

یہ منتر بالکل بے اثر رہا۔ گرجا آبدیدہ ہو کر بولی، "تم خواہ مخواہ مجھ سے جھگڑنا چاہتے ہو، اور مجھے جھگڑے سے نفرت ہے۔ میں نہ تم سے بولتی ہوں اور نہ چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے بولنے کی تکلیف گوارا کرو۔ کیا آج شہر میں کہیں ناچ نہیں ہوتا، کہیں ہاکی میچ نہیں ہے، کہیں شطرنج نہیں بچھی ہوئی ہے۔ وہیں تمہاری طبیعت جمتی ہے۔ آپ وہیں جائیے مجھے اپنے حال پر رہنے دیجئے۔ میں بہت اچھی طرح ہوں۔

دیا شنکر، رقت آمیز لہجہ میں بولے "کیا تم نے مجھے ایسا بے وفا سمجھ لیا ہے؟

گرجا۔ جی ہاں، میرا تو یہی تجربہ ہے۔

دیا شنکر، تو تم سخت غلطی پر ہو۔ اگر تمہارا یہی خیال ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ عورتوں کے ضمیر شناسی کے متعلق میں نے جتنی روایتیں سنی ہیں وہ سب غلط ہیں۔ گرجا، میرا بھی دل ہے......" گرجا نے بات کاٹ کر کہا، "واقعی آپ کے بھی دل ہے، یہ آج نئی بات معلوم ہوئی۔

دیا شنکر کچھ جھینپ کر بولے "خیر جیسا تم سمجھو۔ میرے دل نہ سہی، میرے جگر نہ سہی، اور دماغ تو صاف ظاہر ہے، کہ ایشور نے مجھے نہیں دیا، ورنہ وکالت میں فیل کیوں ہوتا، تو گویا بالکل اعضاء رئیسہ میں میرے صرف پیٹ ہے میں صرف کھانا جانتا ہوں۔ اور سچ یہ ہے بھی ایسا ہی۔ تم نے مجھے کبھی فاقہ کرتے نہیں دیکھا۔ تم نے کئی بار دن دن بھر کچھ نہیں کھایا ہے۔ میں شکم سیری سے کبھی باز نہیں آیا۔ لیکن کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ دل اور جگر جس کوشش میں ناکامیاب رہتے، وہ اسی پیٹ نے پوری کر دکھائی۔ یا یوں کہو کہ بارہا اسی پیٹ نے دل

اور جگر اور دماغ کا کام کر دکھایا ہے۔ مجھے اپنے اس عجیب و غریب شکم پر کچھ ہونے لگا تھا۔ مگر اب معلوم ہوا، کہ میرے پیٹ کی ہچکیاں لوگوں کو بُری معلوم ہوتی ہیں ...... اس وقت میرا کھانا نہ بنے، میں کچھ نہ کھاؤں گا۔"

گرجا نے شوہر کی طرف دیکھا، چہرہ پر خفیف سی مسکراہٹ تھی جو یہ کہہ رہی تھی، کہ یہ آخری بات تمہیں زیادہ احتیاط سے کہنی چاہیئے تھی۔ گرجا اور عورتوں کی طرح یہ بھول جاتی تھی، کہ مردوں کی رُوح کو بھی تکلیف ہو سکتی ہے اس کے خیال میں تکلیف کے معنی جسمانی تکلیف تھے اُس نے دیا شنکر کے ساتھ اور کیا ہے جو رعایت کی ہو، کھلاتے پلاتے ہیں اس لئے کبھی رعایت نہیں کی اور جب تک غذا کی روزانہ مقدار اُن کے شکم میں پہنچتی جائے اُسے اُن کی طرف سے کوئی زیادہ اندیشہ نہیں ہوتا تھا، ہضم کرنا دیا شنکر کا کام تھا، سچ پوچھیے تو گرجا ہی کی سخت گیریوں نے اُنہیں ہاکی کا شوق دِلایا، ورنہ اپنے اور ہمسایوں کی طرح انہیں دفتر سے آکر حقّہ اور شطرنج سے زیادہ دِل بستگی ہوتی تھی، گرجا نے یہ دھمکی سنی تو چیں بجبیں ہو کر بولی، "اچھی بات ہے۔ نہ بنے گا۔"

دیا شنکر دل میں کچھ خفیف سے ہو گئے، انہیں اس بر جستہ جواب کی اُمید نہ تھی، اپنے کمرہ میں جا کر اخبار پڑھنے لگے ادھر گرجا حسبِ معمول کھانا پکانے میں مصروف ہوئی، دیا شنکر ایسے دل شکستہ ہو گئے تھے، کہ انہیں خیال بھی نہ تھا کہ گرجا کھانا پکا رہی ہوگی۔ اس لئے جب نو بجے کے قریب اُس نے آکر کہا، کہ چلو کھانا کھالو، تو وہ گو تعجب سے چونک تو پڑے، مگر یہ یقین آگیا، کہ میں نے بازی ماری۔ جی ہرا ہوا، تاہم بظاہر ترش رو ہو کر بولے "میں نے تو تم سے کہہ دیا تھا کہ آج کچھ نہ کھاؤں گا۔"

گرجا:۔ چلو تھوڑا سا کھالو۔

دیا شنکر:۔ مجھے مطلق بھوک نہیں ہے۔

گرجا:۔ کیوں؟ آج بھوک کیوں نہیں لگی؟

دیاشنکر۔ تمہیں تین دن کیوں بھوک نہیں لگی۔

گرجا۔ مجھے تو اس وجہ سے نہیں لگی کہ تم نے میرے دل کو صدمہ پہنچایا تھا۔

دیاشنکر۔ مجھے بھی اس وجہ سے نہیں لگی، کہ تم نے مجھے تکلیف دی ہے۔

دیاشنکر نے رکھائی کے ساتھ یہ باتیں کیں۔ اور اب گرجا انہیں منانے لگی ذرا سا پانسہ پلٹ گیا۔ ابھی ایک ہی لمحہ قبل وہ اس کی خوشامدیں کر رہے تھے۔ مجرم کی طرح اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ گڑگڑا رہے تھے۔ منتیں کرتے تھے۔ اور اب بازی پلٹی ہوئی تھی۔ مجرم انصاف کی مسند پر بیٹھا ہوا تھا۔ محبت کی راہیں مکڑی کے جالوں سے بھی پیچیدہ ہیں۔

دیاشنکر نے دل میں عہد کیا تھا۔ کہ میں بھی اسے اتنا ہی زچ کروں گا۔ جتنا اس نے مجھے کیا ہے۔ اور تھوڑی دیر تک وہ زاہدانہ ثابت قدمی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ گرجا نے انہیں گدگدایا۔ تلوے کھجلائے۔ ان کے بالوں میں کنگھی کی۔ کتنی ہی لبھانے والی ادائیں صرف کیں۔ مگر اثر نہ ہوا۔ تب اس نے اپنی دونوں باہیں ان کی گردن میں ڈال دیں۔ التجا اور محبت سے لبریز آنکھیں اٹھا کر بولی۔ "چلو میری قسم کھالو۔"

بھوس کی باندھ بہ گئی۔ دیاشنکر نے گرجا کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے بھولے پن اور جذبات کی سادگی نے ان کے دل پر ایک عجیب دردناک اثر پیدا کیا ان کی آنکھیں بھی آبگوں ہو گئیں۔ آہ! میں کیسا ظالم ہوں۔ میری بے وفائیوں نے اسے کتنا رلایا ہے۔ تین دن تک اس کے آنسو نہیں تھمے۔ آنکھیں نہیں جھپکیں۔ تین دن تک اس نے دانہ کی صورت نہیں دیکھی مگر میرے ایک ذرا سے انکار نے۔ جھوٹے۔ نقلی انکار نے معجزہ کر دکھایا۔ کیسا نازک دل ہے۔ گلاب کی پنکھڑی کی طرح مرجھا جاتی ہے۔ مگر میلی نہیں ہوتی۔ کہاں میرا اوچھا پن! خود غرضی، نفس پسندی اور کہاں یہ بے خودی، یہ بے نفسی، یہ ہمت [illegible]

دیاشنکر کے سینہ سے لپٹی ہوئی گرجا اس وقت اپنی پُر زور کشش سے ان

کے دل کو کھینچے لیتی تھی، اس نے جیتی ہوئی بازی ہار کر آج اپنے شوہر کے دل پر قبضہ پالیا، اتنی زبردست فتح اسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ آج دیاشنکر کو محبت اور بھولے پن کی اس مورت پر جتنا ناز تھا، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے ذرا دیر میں وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے، ایک شرط پر چلوں گا۔

گرجا۔ کیا۔

دیاشنکر۔ اب کبھی مت روٹھنا۔

گرجا۔ یہ تو بڑی کڑی شرط ہے مگر...... منظور ہے۔

دو تین قدم چلنے کے بعد گرجا نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولی، تمہیں بھی میری ایک شرط ماننی پڑے گی۔

دیاشنکر۔ میں سمجھ گیا۔ تم سے سچ کہتا ہوں۔ اب ایسا نہ ہوگا۔

دیاشنکر نے آج گرجا کو اپنے ساتھ کھلایا۔ وہ بہت لجائی، بہت حیلے کیے، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا، یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ مگر دیاشنکر نے ایک نہ مانی اور کئی لقمے گرجا کو اپنے ہاتھ سے کھلائے اور ہر بار اپنی محبت کا بیدردی کے ساتھ معاوضہ لیا۔

کھاتے کھاتے انہوں نے ہنس کر گرجا سے کہا "مجھے نہ معلوم تھا کہ تمہیں منانا اتنا آسان ہے۔"

گرجا نے نیچی نگاہوں سے دیکھا اور مسکرائی، مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔

مرہم

(۱)

چترکوٹ کے پاس دھن گڑھ نام کا ایک گاؤں ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، وہاں شان سنگھ اور گمان سنگھ دو بھائی رہتے تھے۔ ذات کے ٹھاکر، بزرگوں کی سرفروشی کی بدولت اُنہیں ایک قطعہ زمین معافی ملی ہوئی تھی۔ کھیتی کرتے تھے، بھینس پال رکھی تھی، گھی بیچتے تھے، مٹھا کھاتے تھے۔ بفراغت گزران ہوتی تھی۔ اُن کی ایک بہن تھی، دوجی نام تھا، بالکل اسم بامسمیٰ۔ دونوں بھائی قوی ہیکل، غضب کے جفا کش تھے۔ بہن نہایت نازک اندام، سر پر گھڑا رکھ کر چلتی تو کمر بل کھاتی تھی۔ مگر تینوں ابھی تک کنوارے تھے۔ بظاہر اُنہیں شادی کی کوئی فکر نہ تھی۔ بڑے بھائی شان سنگھ کا خیال تھا کہ چھوٹے بھائی کے ہوتے ہوئے اب میں کیا شادی کروں اور چھوٹے بھائی گمان سنگھ کی غیرت گوارا نہ کرتی تھی کہ بڑے بھائی سے سبقت لے جائے وہ کہتے تھے اجی بڑے مزے میں ہیں، میٹھی نیند سوتے ہیں، کون یہ جھنجھٹ مول لے۔ لیکن جب گاؤں میں کوئی نائی یا برہمن لڑکے کی تلاش میں آ نکلتا، تو اُس کی خاطر داری اور مہمان نوازی میں دودھ اور مٹھے کی کوئی تمیز نہ رہتی تھی، پرانے چاول نکالے جاتے، پلے ہوئے بکرے دیوی کو چڑھائے جاتے اور شیر و شکر کی ندیاں بہنے لگتی تھیں حتّٰے کہ اس وقت یہ برادرانہ پاس و لحاظ، رقیبانہ سرگرمی اور حاسدانہ انہماک کی صورت میں ظاہر ہونے لگتا تھا۔ لگن کے دنوں میں ان کی مہمان نوازی اُمنگ پر ہوتی تھی۔ اُن کی مہمان نوازی سے فیض اُٹھانے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ کتنے ہی نائی اور برہمن جو اُن کی گرد و

کی

سے واقف ہو چکے تھے۔ شادی کے معنوی پیغام لے کر آتے اور دو چار دن چائے اور پوریاں کھا کر اور کچھ نذرانہ لے کر بہت جلد بر رکشا بھیجنے کا وعدہ کر کے اپنی راہ لیتے، مگر دوسرے لگن کے موقع تک اُنکی صورت نہ نظر آتی گاؤں کے منچلے لوگ یہ تماشا دیکھنے کیلئے آئے دن ایک نہ ایک سوانگ رچا کرتے تھے۔ مگر کسی نہ کسی سبب سے یہ تمام سرگرمیاں اکارت اور بے اثر ثابت ہوتیں۔ ہاں اگر رشتہ اُمید قائم تھا۔ تو دوجی کی ذات سے۔ بھائیوں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ اُس کی شادی اُسی جگہ کی جائے جہاں سے ایک بہو مل سکے۔

(۲)

اسی اثنا میں گاؤں کا ایک بوڑھا کارندہ پرلوک کو سدھارا۔ اس کی جگہ پر ایک نوجوان صاحب تشریف لائے۔ انگریزی کی تعلیم پائے ہوئے۔ شوقین رنگین طبع، رسیلے، دیدہ باز، دو ہی چار دنوں میں اُنہوں نے گاؤں کے سارے پنگھٹوں اور تالابوں اور جھروکوں کا جائزہ لے لیا۔ بالآخر اُن کی نظرِ انتخاب دوجی پر آ کر پڑی۔ اس کی نزاکت اور تمانت اور شرمیلے پن پر فدا ہو گئے بھائیوں سے راہ و رسم پیدا کی کچھ شادی بیاہ کا چرچا چھیڑ دیا۔ حقہ تمباکو تک نوبت پہنچی شام سویرے دروازے پر آنے لگے۔ بھائیوں نے بھی ان کی خاطر تواضع شروع کی۔ پاندان مول لائے، قالین خریدی۔ وہ دروازے پر آتے تو دوجی فوراً پان کے بیڑے بنا کر بھیجتی، بڑے بھائی قالین بچھا دیتے، چھوٹے بھائی طشتری میں پان اور الائچی رکھ کر لاتے۔ ایک روز آپ نے فرمایا۔ بھیّا! شان سنگھ! ایشور نے چاہا تو اب کی لگن میں بھاوج گھر میں آ جائیگی۔ میں نے سب معاملہ پکا پختہ کر لیا ہے۔

شان سنگھ کی باچھیں کھل گئیں، نہایت احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا میں اس عمر میں اب کیا شادی کروں گا، ہاں .... کی بات چیت کہیں طے ہو جاتی، تو پاٹ کٹ جاتا۔

گمان سنگھ نے تاڑ کا پنکھا اُٹھا لیا اور جھلتے ہوئے بولے۔ واہ بھیّا!

کیسی بات کہتے ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ للن سنگھ نے اکڑ کر شان سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بھائی صاحب کیا کہتے ہو، اب کی لگن میں دونوں ہی بھاوجیں چھما چھم کرتی ہوئی گھر میں آئیں تب تو بات، میں ایسا کچا معاملہ نہیں رکھتا۔ تم تو ابھی سے بڑھوں کی سی باتیں کرنے لگے، تمہاری عمر چاہے پچاس سے آگے ہو، مگر دیکھنے میں تم چالیس سے بھی کم معلوم ہوتے ہو، اب دونوں کی شادیاں ہوں گی، اور بیچ کھیت ہوں گی۔ یہ بتاؤ کپڑے گہنے زیور کا انتظام ہے نہ؟

شان سنگھ نے اپنے مربی کے جوتوں کو سیدھا کر کے کہا بھائی صاحب تمہاری ایسی نگاہ ہے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ آخر اتنے دن کما کما کر کیا کیا ہے۔

گمان سنگھ دوڑے ہوئے گھر میں گئے۔ حقہ تازہ کیا۔ تمباکو میں دو تین بوندیں عطر کی ٹپکائیں۔ چلم بھری۔ دوبی سے کہا، شربت گھول دے اور حقہ لا کر للن سنگھ کے سامنے رکھ دیا۔

للن سنگھ نے مربیانہ انداز سے دو تین کش لگائے اور بولے نائی دو چار دن میں آیا چاہتا ہے ایسا گھر چھانٹا ہے، کہ طبیعت خوش ہو جائے ایک بیوہ، دو لڑکیاں، ایک سے ایک حسین، بیوہ برس دو برس میں مر جائے گی۔ اور ایک مسلم موضع میں دو آنے کے حصہ دار ہو جاؤ گے۔ گاؤں والے جو ابھی سنتے ہیں، جل مرینگے۔ خوف یہی ہے کہ کہیں کوئی اس بڑھیا کے کان نہ بھر دے، ورنہ سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

شان کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ گمان سنگھ کا رنگ فق ہو گیا بولے اب تو آپ ہی کا بھروسہ ہے۔ آپ جیسی صلاح دیں کیا جائے۔

(۳)

جب کوئی شخص ہمارے ساتھ خواہ مخواہ خلوص دلیگانگی کے رشتے قائم

کرنے لگے ۔ تو ہمیں سوچنا چاہئے ۔ کہ آیا اسمیں اُس کی کوئی غرض تو مخفی نہیں ہے ۔ ممکن ہے وہ شخص بذاتہ نیک اور ہمدرد واقعہ ہُوا ہو ۔ تو دُور بینی کا تقاضا یہ ہونا چاہئے ۔ کہ دیکھیں اُس کا دوسروں کے ساتھ کیا سلوک ہے ۔ اگر ہم اپنی سادگی سے اس وہم میں پڑ جائیں ۔ کہ کوئی شخص محض ہم کو زیر بار احسان کرنے کے لئے ہماری حمایت اور غمگساری پر آمادہ ہے تو یقینی امر ہے ۔ کہ ہم کو دغا کا شکار بننا پڑے گا ۔ کیونکہ خالص احسان پر بھی زیادہ اعتماد کرنا اندیشہ سے خالی نہیں ۔ مگر اپنی غرض کی دھن میں یہ موٹی موٹی باتیں بھی نگاہوں سے چھپ جاتی ہیں اور دغا اپنے رنگے ہوئے لباس میں آ کر ہم کو ہمیشہ کے لئے معاملہ دانی کا سبق دے دیتی ہے ۔ شان اور گمان نے غور اور فراست سے مطلق کام نہ لیا ۔ اور للن سنگھ کے پھندے روز بروز زیادہ گاڑھے ہوتے گئے ۔ بے تکلفی نے یہاں تک پاؤں پھیلائے کہ بھائیوں کی عدم موجودگی میں بھی وہ بے دھڑک مکان کے اندر گھس جاتے اور آنگن میں کھڑے ہو کر چھوٹی بہن سے پان اور حقہ کی فرمائش کرتے ۔ دوجی اُنہیں دیکھتے ہی بڑے شوق سے پان بناتی ۔ پھر نگاہیں ملتیں ایک شوق سے بیتاب ، دوسری حیا سے سمٹی ہوئی ۔ پھر ہونٹوں پر تبسّم کی جھلک نظر آتی نگاہوں کی طراوت غنچوں کو شگفتہ کر دیتی ۔ دل آنکھوں سے باتیں کر لیتے جن میں جتنا اختصار ہے ۔ اُتنی ہی بلاغت ہے اور جسے دیوار کا بھی خوف نہیں ۔

اسی طرح بے تکلفیاں بڑھتی گئیں ۔ وہ شوخ نگاہیں جو پہلے باعث نفرت تھیں ۔ اُن میں اضطراب اور انتظار کی کیفیت پیدا ہوئی ۔ داستان فراق کو زبان گویا کی مدد کی ضرورت آئی ۔ وہ دوجی جسے کبھی ستار اور لبساطی کی شوق انگیز صدائیں گھر سے باہر نہ نکال سکتیں ، اب ایک وارفتگی کے عالم میں گھنٹوں دروازہ پر صورت انتظار بنی کھڑی رہتی ۔ وہ دوسرے اور گیت جنہیں وہ کبھی دل بہلانے کے لئے گایا کرتی تھی ۔ ان میں اب اُسے درد اور

گداز کا مزہ محسوس ہوتا۔ قصہ مختصر یہ کہ محبت کا رنگ گاڑھا ہو گیا۔

(۳)

رفتہ رفتہ گاؤں میں چرچا ہونے لگا۔ گھانس اور کالنس خود بخود پیدا ہوتی ہیں، اُکھاڑنے سے بھی نہیں جاتیں، اچھے پودے بڑی احتیاط سے نشوونما پاتے ہیں۔ اسی طرح بُری خبریں خود بخود پھیلتی ہیں، روکنے سے بھی نہیں رُکتیں،

پن گھٹوں اور تالابوں کے کنارے اس موضوع پر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ گاؤں کی بنیائن جو اپنے ترازو پر دلوں کو تولتی تھی، اور گوالن جو پانی میں الفت کا رنگ دے کر دودھ کا دام وصول کرتی تھی، اور تنبولن جو پان کے بیڑوں سے دلوں پر اپنا رنگ جماتی تھی، یہ سب یکجا بیٹھ کر دوجی کی بے باکی اور بے شرمی کا راگ الاپتیں، غریب دوجی کو گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا، ہمجولیاں اور بڑی بوڑھی عورتیں بھی اس پر آوازے کستیں، ہمجولیاں چہل اور چھیڑ کرتیں، بوڑھی عورتیں دلخراش طعنے مارتیں،

مردوں تک بات پہنچی، ٹھاکروں کا گاؤں تھا، ٹھاکر لوگ بپھرے صلاح ہوئی کہ للن سنگھ کو اس شرارت کی سزا دینی چاہیئے، دونوں بھائیوں کو بلایا اور بولے، یارو! کیا اپنی آبرو بیچ کر بیاہ کرو گے؟

دونوں بھائی چونکے، انہیں اپنی شادی کی دھن میں خبر ہی نہ تھی کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے، شان سنگھ نے کہا، تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی صاف صاف کہو۔ ایک ٹھاکر نے جواب دیا، صاف صاف کیا کہلاتے ہو، اس شہدے للن سنگھ کا اپنے یہاں آنا جانا بند کر دو۔ ورنہ تم تو آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے ہو۔ اس کی جان کی خیریت نہیں ہے۔ ہم نے ابھی تک اسلئے طرح دی ہے کہ شاید تمہاری آنکھیں کھلیں، مگر معلوم ہوتا ہے، تمہارے اوپر اس نے مردے کی راکھ ڈال دی ہے۔ شادی کیا اپنی عزت بیچکر کرو گے؟ تم لوگ کھیت میں رہتے ہو،

اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، کہ شہدا اپنا بناؤ سنوار کئے آتا ہے۔ اور تمہارے گھر میں گھنٹوں گھسا رہتا ہے، تم اُسے اپنا بھائی سمجھتے ہو۔ تو سمجھا کرو۔ ہم تو ایسے بھائی کا گلا کاٹ لیں، جو دشواتش گھات کرے۔

بھائیوں کی آنکھیں کھلیں، دُوجی کی نسبت بخار کا جو گمان تھا، محبت کا مرض نکلا، خون میں اُبال آیا، آنکھوں سے چنگاریاں اُڑیں، تیور بدلے دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف غضبناک نگاہیں ڈالیں جذبات اتنے گہرے تھے کہ زبان تک نہ آسکے اور وہاں سے اپنے گھر چلے آئے۔

مگر دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ للن سنگھ سے مٹ بھیڑ ہو گئی۔

للن سنگھ نے ہنس کر بے تکلفانہ انداز سے کہا، واہ بھائی صاحب واہ! ہم تمہاری تلاش میں بار بار آتے ہیں، اور تم سے ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ تم نے سمجھا آخر رات کو تو کوئی کام نہ ہو گا، مگر دیکھتا ہوں، کہ آپ کو اسوقت بھی فرصت نہیں ہے۔

شان سنگھ نے دل کے اندر اُبلتے ہوئے شعلۂ آتش کو دبا کر کہا، ہاں اسوقت مجھے فرصت نہیں۔

للن سنگھ، آخر کیا کام ہے، میں بھی سنوں۔

شان سنگھ: بہت بڑا کام ہے، تم سے چھپا نہ رہے گا۔

للن سنگھ: کچھ گہنے پاتے کا بھی انتظام کر رہے ہو، اب لگن سر پر آپہنچی

شان سنگھ، اب بڑی لگن سر پر آپہنچی ہے، پہلے اس کا انتظام کرنا ہے۔

للن سنگھ: کیا کسی سے ٹھن گئی ہے۔

شان سنگھ: خوب اچھی طرح۔

للن سنگھ: کس سے۔

شان سنگھ، اسوقت جاؤ، صبح بتائیں گے۔

(۵)

دوجی بھی لال سنگھ کے ساتھ دہلیز تک آئی تھی۔ بھائیوں کی آہٹ پاتے ہی ٹھٹک گئی۔ اور اُن سے جو باتیں ہوئیں وہ سب سنیں۔ اُس کا ماتھا ٹھنکا کہ آج یہ کیا معاملہ ہے۔ لال سنگھ کی کچھ خاطر ہوئی نہ تواضع۔ نہ حقہ نہ پان۔ کیا بھائیوں کے کان میں کچھ بھنک تو نہیں پڑی۔ کسی نے کچھ لگا تو نہیں دیا۔ اگر ایسا ہوا تو خیریت نہیں اسی اُدھیڑبن میں بیٹھی تھی کہ بھائیوں نے کھانا پرسنے کی فرمائش کی۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھے تو دوجی نے اپنی بے گناہی اور صفائی جتلانے کے لئے نہیں اپنے بھائیوں کے دل کا بھید لینے کے لئے کہا تریا چتر میں ابھی بالکل نوآموز تھی۔ بھیا! لال سنگھ سے کہہ دو۔ گھر میں نہ آیا کریں۔ تم گھر میں رہو تو کوئی بات نہیں لیکن کبھی کبھی تم نہیں رہتے تو مجھے بہت شرم معلوم ہوتی ہے آج ہی وہ تمہیں پوچھتے ہوئے چلے آئے۔ اب میں اُن سے کیا کہوں۔ جب یہاں تم کو نہیں دیکھا تو لوٹ گئے۔

شان سنگھ نے بہن کی طرف طعنہ آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ اب وہ گھر میں نہ آئیں گے۔

گمان سنگھ بولے۔ ہم اسی وقت جاکر اُنہیں سمجھا دیں گے۔

بھائیوں نے کھانا کھایا۔ دوجی کو پھر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اُسے اُن کے تیور آج کچھ بدلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ کھانے کے بعد دونوں بھائی چراغ لے کر کھنڈرے کی کوٹھڑی میں گئے۔ گھر کے فاضل برتن۔ پرانے سامان بزرگوں کے وقت کے ہتھیار وغیرہ اسی کوٹھڑی میں رکھے تھے۔ گاؤں میں جب کوئی بکرا دیوی کے بھینٹ کیا جاتا تو یہ کوٹھڑی کھلتی تھی۔ دوجی کو کسی آنے والے سانحہ کا اندیشہ ہوا۔ دروازے پر گئی دیکھا کہ گمان سنگھ بھجالی لئے پتھر پر رگڑ رہا ہے۔ کلیجہ دھک دھک اور پیر تھرتھرانے لگے۔ اُلٹے پاؤں لوٹنا چاہتی تھی کہ شان سنگھ کی آواز سنائی دی۔ اسی گھڑی چلنا ٹھیک ہے۔ پہلی نیند گہری ہوتی ہے۔ بجھو غافل سوتا ہوگا۔ گمان سنگھ

بولے "اچھی بات ہے، دیکھو بھالی کی دھار، ایک ہاتھ بھرپور پڑ جائے گا تو کام تمام ہے"۔

دوجی کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا کسی نے پہاڑ سے دھکیل دیا۔ ساری باتیں اُس کی سمجھ میں آ گئیں۔ وہ ایک دہشت کے عالم میں گھر سے نکلی اور للن سنگھ کی چوپال کی طرف چلی، مگر آہ! اندھیری رات، وادیٔ عشق تھی، اور وہ راستہ محبت وہ اِسنان تاریکی میں چونکی ہوئی آنکھوں سے اِدھر اُدھر تاکتی عالمِ مدہوشی میں تیزی سے قدم بڑھائے چلی جاتی تھی، مگر وائے ناکامی ایک ایک قدم اُسے منزلِ یار سے دور لئے جاتا تھا۔ اُس اندھیرے سناٹے میں وہ گم گشتہ راہِ الفت نہ جانے کہاں چلی جاتی تھی، کس سے پوچھے، حیا زبان کو روکے ہوئے تھی کہیں چوڑیاں پردہ فاش نہ کر دیں، کہیے کم بخت کیا آج ہی کھنکیں گے۔ آخر وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئی، سب چوڑیاں توڑ ڈالیں، گہنے اُتار کر آنچل میں باندھ لئے مگر آہ! یہ چوڑیاں سہاگ کی چوڑیاں تھیں، اور گہنے سہاگ کے گہنے تھے جو ایک بار اُتر کر پھر پہننے نصیب نہ ہوئے۔

اُسی درخت کے نیچے لبونی ندی سنگریزوں سے ٹکراتی ہوئی بہتی تھی جہاں کشتیوں کا گزر نہیں ہو سکتا تھا۔ دوجی بیٹھی ہوئی سوچتی تھی کیا میری زندگی ہی میں محبت کی کشتی مصیبت کی چٹانوں سے ٹکرا کر ڈوب جائے گی۔

(۶)

صبح کو سارے گاؤں نے حیرت سے سنا کہ ٹھاکر للن سنگھ کو کسی نے قتل کر ڈالا۔ سارے گاؤں کے مرد، عورتیں، بوڑھے، جوان ہزاروں کی تعداد میں چوپال کے سامنے جمع ہو گئے، عورتیں پنگھٹ کو جاتے ہوئے رک گئیں، کسان ہل بیل لئے ٹھہر گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ستم کس نے ڈھایا۔ کیسا ملنسار، ہنس مکھ، نیک آدمی تھا۔ اس کا ایسا کون سالاگی تھا۔ بیچارے نے کبھی کسی پر اضافہ لگان یا بیدخلی کی نالش تک نہیں کی، کبھی کڑوی بات بھی نہیں کی، دونوں بھائی

کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی جاری تھی۔ اُن کا گھر اُجڑ گیا۔ ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ گمان سنگھ نے رو کر کہا۔ ہم تین بھائی تھے۔ اب دو ہی رہ گئے۔ تم سے تو دانت کاٹی روٹی تھی۔ ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہنسی دل لگی کھانا پینا۔ بالکل شیر و شکر ہو گئے تھے۔ مگر ظالم سے یہ بھی نہ دیکھا گیا۔ ہائے اب تم کو کون سہارا دے گا۔ شان سنگھ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں بھائی کے پاس تڑ والنے جا رہے تھے۔ للن سنگھ سے کئی دن سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ سوچے ادھر سے ہوتے چلیں مگر جیوں ہی اندر آئے ہی سفید نظر آئی ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے دروازہ پر جا کر دیکھا تو چوکیدار تختہ سپاہی سب نہ اُٹھے لئے ہوئے ہیں۔ انہیں جگا کر للن سنگھ کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ مگر بہت کوشش کرنے پر بھی جب دروازہ اندر سے نہ کھلا۔ تو سیندھ سے جھانکا۔ آہ کلیجہ میں ایک تیر لگ گیا۔ دُنیا آنکھوں میں تاریک ہو گئی۔ پیارے للن سنگھ کا سر دھڑ سے الگ تھا۔ خون کی ندی بہ رہی تھی۔ افسوس بھیا سدا کیلئے داغ دے گئے۔

دوپہر تک یوں ہی ماتم ہوتا رہا۔ دروازہ پر میلہ سا لگا ہوا تھا۔ دُور دُور سے لوگ اِس سانحہ کی خبر پا کر جمع ہوتے ہوتے حلقہ کے داروغہ صاحب بھی چوکیداروں اور سپاہیوں کی جمعیت لئے ہوئے آ پہنچے۔ کڑھاؤ چڑھ گیا۔ گوشت اور پوری کی تیاری ہونے لگی۔ داروغہ جی نے تحقیقات کرنی شروع کی۔ موقع دیکھا۔ چوکیداروں کے بیان لئے۔ دونوں بھائیوں کے اظہار لکھے قرب و جوار کے پاسی اور چمار پکڑے گئے۔ اور اُن پر مار پڑنا شروع ہوئی۔ صبح کو وہ ان غریبوں کو گرفتار کئے۔ للن سنگھ کی لاش لے کر تھانہ گئے۔ قاتل کا پتہ نہ چلا۔ چوروں اور شہدوں کی پوچھ پاچھ بھی کارگر نہ ہوئی۔ دوسرے دن انسپکٹر پولیس تشریف لائے اُنہوں نے بھی گاؤں کا چکر لگایا۔ چماروں اور پاسیوں کی پھر مرمت ہوئی۔ پھر حلوہ پوری اور گوشت کی ٹھہری شام کو وہ بھی واپس ہوئے۔ چند پاسیوں پر جو کئی بار ڈاکہ اور سرقہ کے جرم میں ماخوذ ہو چکے تھے۔ شبہ ہوا۔ اُن کا چالان کیا گیا۔ مجسٹریٹ نے شہادتیں

زوردار پائیں، ملزموں کو سیشن سپرد کیا۔ اور دعدہ معشوق کی طرح مقدمہ کی پیشیاں ہونے لگیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا۔ کچھ ترشح ہو رہا تھا۔ سیشن جج کنور جے کرشن نگھیلا کے اجلاس میں مقدمہ پیش تھا۔ کنور صاحب بڑے لیس و پیش میں تھے، کہ کیا کریں، ملزموں کے خلاف شہادت بہت کمزور تھی مگر وکیل سرکار جو ایک بڑے مشہور مقنن تھے۔ نظروں میں نظیریں پیش کرتے جاتے تھے، کہ دفعتہً دوجی ایک سفید ساڑھی پہنے گھونگھٹ نکالے ہوئے بے خوف عدالت کے کمرہ میں آئی۔ اور ہاتھ جوڑ کر بولی سرکار! میں شان سنگھ اور گمان سنگھ کی بہن ہوں، اِس معاملہ میں میں جو کچھ جانتی ہوں، وہ مجھ سے بھی سُن لیا جائے اس کے بعد سرکار جو فیصلہ چاہے کریں۔

کنور صاحب نے حیرت سے دوجی کی طرف دیکھا۔ شان سنگھ اور گمان سنگھ کے بدن میں کاٹو تو لہو نہیں، وکیلوں نے بھی اِستعجاب کی نگاہ سے اُس کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ دوجی کا چہرہ اس وقت متانت اور استقلال سے منور تھا۔ وحشت یا پراسیمگی کا مطلق پتہ نہ تھا۔ ندی طوفان کے بعد ساکت ہو چکی تھی، اُس کی دلفریب حُسن اور اُس کی سادگی نے مِل جُل کر اس کے چہرہ پر ایک روحانی جلال کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اُس نے اُسی روانی میں کہنا شروع کیا۔ ٹھاکر للن سنگھ کو قتل کرنے والے میرے دونو بھائی ہیں۔

کنور صاحب کی آنکھوں کے سامنے پردہ سا ہٹ گیا۔ ساری عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ اور سب نگاہیں دوجی کی طرف جم گئیں۔

دوجی بولی۔ یہ وہ تھیجالی ہے جو للن سنگھ کی گردن پر پھیری گئی ہے۔ ابھی اس کا خون تازہ ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بھائیوں کو اسے پتھر پر رگڑتے دیکھا۔ ان کی باتیں سُنیں، میں اُسی وقت گھر سے نکلی کہ للن سنگھ کو ہوشیار کر دوں مگر میرے نصیب کھوٹے تھے، چوپال کا ٹھکانہ نہ ملا۔ میرے دونوں بھائی

کھڑے ہیں، وہ مر دیں میرے سامنے جھوٹ کبھی نہ بولیں گے۔ ان سے پوچھ لیا جائے اور جو سچ پوچھئے تو یہ چھری میں نے چلائی ہے۔ میرے بھائیوں کا قصور نہیں۔ یہ سب میری تقدیر کا کھیل ہے۔ یہ سب کرتوت میں نے کی، یہ سب میرے پیچھے ہوا، اور انصاف کی تلوار میری ہی گردن پر پڑنی چاہیئے۔ میں ہی اپرادھنی ہوں۔ اور میں ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ اسی بھجالی سے میری گردن کاٹ دی جائے۔

(۷)

عدالت میں ایک عورت ہلال عید کی شان رکھتی ہے اب تک مقدمہ بالکل خشک اور بے مزہ تھا۔ دو جی کی آمد نے اس میں ندرت اور دلچسپی پیدا کر دی۔ عدالت کے کمرہ میں ایک بھیڑ لگ گئی۔ موکل اور وکیل، عملے اور دوکاندار سبھی ایک بے تابانہ جوش کے ساتھ ادھر ادھر سے دوڑے چلے آتے تھے۔ ہر شخص اسے ایک نظر دیکھنے کا مشتاق تھا، ہزاروں نگاہیں اس کے چہرے کی طرف جمی ہوئی تھیں اور وہ اس خلقت کے بیچ میں متانت کی ایک مورت بنی ہوئی بے حس و حرکت کھڑی تھی۔

اس واقعہ پر ہر کس و ناکس اپنی سمجھ کے مطابق رائے زنی کرتا تھا۔ بوڑھے کہتے تھے، غضب کی بیباک عورت ہے۔ ایسی لڑکی کا تو سر کاٹ لینا چاہیئے بھائیوں نے وہی کیا جو مردوں کا کام تھا۔ اس بے حیائی کو تو دیکھو کہ اپنا پردہ ڈھکا رکھنے کے بجائے اپنے آپ کو رسوا کرتی پھرتی ہے۔ اور بھائیوں کو بھی ڈبائے دیتی ہے۔ آنکھ کا پانی گر گیا ہے۔ ایسی نہ ہوتی تو یہ دن ہی کیوں آتا۔ مگر نوجوان آزادی پر جان دینے والے کیلوں اور عملوں میں اس کی جرأت اور بیباکی کی تعریفیں ہو رہی تھیں۔ ان کے خیال میں جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی، تو بھائیوں کا فرض تھا، کہ دونوں کی شادی کر دیتے۔ رنگین طبع حضرات کو عشق خانہ خراب کی یاد آئی۔ امیر اور داغ کے اشعار پڑھنے لگے۔

کمی ہوگئیں۔ چند من رسیدہ وکیلوں کی اپنے نوجوان دوستوں سے گرما گرم بحث ہوگئی۔ ایک فیشن ایبل بیرسٹر صاحب نے ہنس کر فرمایا۔

یار اور تو جو کچھ ہے، سو ہے۔ عورت ہزاروں میں انتخاب کئے رانی معلوم ہوتی ہے۔ عام رائے نے اس پر صاد کیا۔ کنور بے کرشن اسی وقت اجلاس سے اُٹھے تھے۔ بیرسٹر صاحب کا ریمارک سُنا۔ اور نفرت سے مُنہ پھیر لیا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ جس عورت کے انتقام میں اتنی جلن ہے کیا اس کی محبت میں بھی اتنی ہی گرمی ہوگی۔

(۸)

دوسرے دن پھر دس بجے مقدمہ پیش ہُوا۔ کمرہ میں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ دوجی کٹہرے کے پاس سر جھکائے کھڑی تھی۔ دونوں بھائی ریتی کانسٹیبلو کے حلقہ میں دم بخود ایستادہ تھے۔ کنور بے کرشن نے اُنکی طرف مخاطب ہو کر بلند آواز سے کہا۔ ٹھاکر شان سنگھ اور گمان سنگھ! تمہاری بہن نے تمہارے متعلق عدالت میں جو کچھ بیان کیا ہے اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟

شان سنگھ نے مردانہ انداز سے جواب دیا۔ اُس نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اسلئے چھپایا تھا۔ کہ ہم بدنامی اور بے عزتی سے ڈرتے تھے۔ لیکن اب کہ ہماری بدنامی جو کچھ ہونا تھی وہ ہو چکی تو ہم کو اپنی صفائی دینے کی ضرورت نہیں۔ ایسی زندگی سے اب مرجانا ہی بہتر ہے۔ للن سنگھ سے ہماری گہری دوستی تھی۔ آپس میں کوئی پردہ نہ تھا۔ ہم اُسے اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ لیکن اُس نے ہم سے دغا کی۔ اُس نے ہمارے خاندان میں کلنک لگایا۔ اور ہم نے اُس کا بدلہ لیا۔ اُس نے چکنی میٹھی باتوں کے بدلہ میں ہماری عزت لینی چاہی۔ لیکن ہم اپنی خاندانی عزت کو اتنی سستی نہیں بیچ سکتے تھے۔ عورت خاندان کی عزت کا سرمایہ ہوتی ہے۔ مرد اس کے رکھوالے ہوتے ہیں۔ جب اس سرمایہ پر دغا یا فریب کا ہاتھ

اُٹھے، تو مردوں کا دھرم ہے، کہ وہ اپنے سرمایہ کو اُس سے بچائیں۔ اس سرمایہ کو عدالت کا قانون، پرماتما کا خوف یا نیت کی صفائی نہیں بچا سکتی ہمکو اس کیلئے عدالت سے جو سزا ملے، اس کیلئے سر جھکائے ہوئے ہیں۔

جج نے شان سنگھ کی تقریر سُنی، عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ اور اس عالم محویت میں انہوں نے اپنا فیصلہ سنایا۔ دونوں بھائیوں کو قتل عمد کے جرم میں حبس دوام عبور دریائے شور کی سزا ملی۔

(۹)

شام ہوگئی تھی، دونوں بھائی کانسٹیبلوں کے حلقہ میں عدالت سے باہر نکلے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں، پیروں میں بیڑیاں آنکھوں میں غیرت پامال، دل اپنی ذلت و بدنامی سے بیٹھے اور سر شرم کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ جس طرح ندی کی لہر جوش سے متوالی، گرجتی ہوئی کراروں سے ٹکرا کر پھر پیچھے کی طرف گرتی ہے۔ اسی طرح دونوں بھائیوں کا جوش ایکبار زور سے بھبک کر اب بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا گویا ساری دُنیا ہمارے اُوپر ہنس رہی ہے۔ آفتاب کی زریں کرنیں سامنے کے درختوں سے گلے مل رہی تھیں، اُن پر چڑیاں بیٹھی ہوئی وہی کرتی تھیں جو آسودگی محلوں میں کیا کرتی ہے، کیا وہ بھی دیکھ کر ہنستی تھیں۔

دونوں بھائی اُسی طرح سر جھکائے اُس درخت کے نیچے گزرے۔ دیوی زمین پر بیٹھی تھی، اُس نے قیدیوں کے آنے کی آواز سُنی، اُٹھ کھڑی ہوئی بھائیوں نے بھی اُس کی طرف تاکا۔ مگر آہ! اُنہیں معلوم ہوا کہ یہ ہمارے اُوپر ہنس رہی ہے۔ نفرت سے آنکھیں پھیر لیں۔ دیوی نے بھی اُنہیں دیکھا مگر نفرت یا غصہ سے نہیں، صرف ایک بے تعلقانہ انداز سے جن بھائیوں پر وہ جان دیتی تھی، وہی دونوں بھائی آج اُس کالے پانی کو جا رہے ہیں۔ جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ اور اُس کے خون میں ذرا بھی حرکت ذرا

بھی جنبش نہیں ہوتی، خون بھی خارجی اثرات سے پانی کی طرح جم جاتا ہے۔

آفتاب کی کرنیں درختوں کی ڈالیوں سے ملیں، پھر جڑوں کے قدم چومتی ہوئی رخصت ہو گئیں مگر اُن کیلئے گوشۂ تاریک گود پھیلائے ہوئے تھا کیا اس بدنصیب عورت کیلئے بھی دُنیا میں کوئی ایسا گوشۂ تاریک تھا۔

آسمان پر سُرخ سے نیلگوں ہوا تاروں کے کنول کھلے، ہوا کیلئے پھولوں کے سیج بچھ گئے، شبنم کیلئے سبز مخمل کا فرش بچھ گیا۔ مگر کم نصیب دوجی اُسی درخت کے نیچے بےحس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے لئے دُنیا میں کوئی جگہ نہ تھی۔ جسے اب تک وہ اپنا گھر سمجھتی تھی۔ اُس کے دروازے اُس کے لئے بند تھے، وہاں وہ کون منہ لے کر جائے گی، ندی کا اپنے مخرج سے نکل کر اتھاہ سمندر کے سوا اور کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

دوجی اسی طرح بیٹھی ہوئی یاس کے بحر بےپایاں میں غوطے لگا رہی تھی۔ کہ ایک بوڑھی عورت اُس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ دوجی چونک کر اُٹھ بیٹھی، ضعیفہ نے اُس کی طرف حیرت سے دیکھ کر کہا، بیٹی! اتنی رات گئی، اور تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو؟

دوجی نے چمکتے ہوئے تاروں کی طرف دیکھ کر جواب دیا، کہاں جاؤں

اِن الفاظ میں بیکسی اور بےبسی کی کتنی داستان چھپی ہوئی تھی کہاں جائے، دُنیا میں اُس کے لئے بجز گوشۂ رسوائی کے اور کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

ضعیفہ نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا، بیٹی! نصیبوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ تو پورا ہو کر ہی رہے گا، مگر تم یہاں کب تک بیٹھی رہو گی، میں غریب برہمنی ہوں چل میرے گھر رہو، جو کچھ مانگے تانگے ملیگا، اُسی میں ہم دونوں نباہ کریں گے معلوم نہیں پچھلے جنم میں تم سے کیا ناتا تھا، جب سے تمہارا حال ہم نے سُنا ہے بےچین ہو رہی ہوں۔ آج سارے شہر میں گھر گھر تمہارا ہی چرچا ہے

کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی کچھ ۔ لے اُٹھو۔ یہاں اس سناٹے میں پڑے رہنا اچھا نہیں ۔ زمانہ خراب ہے ۔ میرا گھر یہاں سے تھوڑی ہی دور ہے ۔ نارائن کا دیا بہت کچھ ہے۔ میں بھی اکیلی سے دُکیلی ہو جاؤں گی۔ بھگوان کیسی نہ کیسی طرح دن کاٹ ہی دیں گے ۔

ایک گھنے بھیانک جنگل میں بھٹکا ہوا آدمی جدھر پگڈنڈیوں کے نشان دیکھتا ہے اسی طرف ہو لیتا ہے ۔ اور یہ نہیں سوچتا کہ یہ راستہ مجھے کہاں لے جائے گا۔ دوجی کی بھی یہی کیفیت تھی ذلت اور مایوسی لیست ہمتی کو بھی ساتھ لاتی ہے ۔ دوجی اس بوڑھی عورت کے ساتھ چلی آئی ہی خوشی سے وہ اسکے کہتے ہی کنوئیں میں کود پڑتی ۔ ہوا میں منڈلاتی ہوئی بیٹر یا دانہ پر گر پڑی کیا اس دانہ کے نیچے جال چھپا ہوا تھا۔

(۱۰)

دوجی کو بوڑھی کیلاشی کے ساتھ رہتے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا۔ کیلاشی دیکھنے میں غریب لیکن دل کی غنی تھی ۔ اُس کے پاس قناعت کی دولت تھی جو کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتی دیوان کی سرکار سے قلیل وظیفہ ملتا تھا یہی اُس کی زندگی کا سہارا تھا۔ وہ ہمیشہ دوجی کی تشفی کرتی تھی معلوم ہوتا تھا دونوں ماں بیٹیاں ہیں۔ ایکطرف سے کامل ہمدردی اور تشفی دوسری طرف سے سچی خدمت گزاری اور عقیدت کیلاشی جانتی تھی کہ غمناک خیالات تنہائی کے منتظر رہتے ہیں۔ اس لیے وہ دوجی کو کبھی سوچنے یا بسورنے کا کوئی موقع نہ دیتی وہ کچھ نہ کچھ بندی جاتی تھی۔ اور کبھی کبھی دوجی کو رامائن اور رستیا پرتھ پڑھ کر سناتی دُوجی ان کتھاؤں کو بڑے شوق سے سنتی ۔ سہارے کیلئے تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔

جس دن سیتا کے بن باس کی کتھا سُنی ۔ دُوجی سارے دن روتی رہی ۔ سیتا اُس کے سامنے کھڑی تھیں۔ اُن کے بدن پر سفید ساڑی تھی۔

آنکھوں میں آنسو اور آنسوؤں کے پردے میں پیار چھپا ہوا تھا۔ دوجی ہاتھ پھیلائے بچوں کی طرح اُن کی طرف دوڑی۔ ماتا۔ مجھے بھی ساتھ لیتی چلو۔ میں جنگل میں تمہاری سیوا کروں گی۔ تمہارے لئے پھولوں کی سیج بچھاؤں گی۔ تمہیں کمل کے تھالوں میں پھلوں کے جیونار کھلاؤں گی۔ وہاں اکیلے ایک بوڑھے سادھو کے ساتھ کیسے ہو گی۔ میں تمہارا دل بہلاؤں گی۔ جس وقت ہم اور تم کسی ساگر کے کنارے گھنے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھیں گے اُس وقت ہوا کی دھیمی دھیمی لہروں کے ساتھ میں گاؤں گی۔

سیتا نے اُس کی طرف پیار سے دیکھ کر کہا۔ نادان ساگر کا کنارہ اور گھنے درختوں کی چھاؤں، دھیمی ہوا کے جھونکے اور ساگر کی مدھم لہریں کیا تو ان کو خوشی کے سامان سمجھتی ہے۔ اُنہوں نے مجھے بہت رُلایا ہے تجھے بھی رُلائیں گے۔

دوجی نے مایوسانہ انداز سے پوچھا۔ تو میں کہاں جاؤں؟

سیتا بولیں۔ تو وہاں جا جہاں دُکھ ہے۔ جہاں تکلیف ہے سورج کی روشنی کنول کھلاتی ہے۔ جس کا کھلنا آنکھوں کو بھاتا ہے۔ تیرے لئے اندھیری ڈراؤنی رات ہے۔ تو وہاں جا۔ جہاں دھاروں کی آواز اور محبت کی خاطرداریاں اور خوشی کا خیال۔ اُن میں سے ایک بھی نہ ہو۔ ہوا سے پانی میں ترنگیں اُٹھنے لگتی ہیں۔ چنچل من کا یہی حال ہے۔

صبح اُٹھتے ہی دوجی نے کیلاشی سے کہا۔ اماں میں وہاں جاؤں گی جہاں دُکھ اور تکلیف ہے جہاں مجھے کسی آدمی کی آواز بھی سُنائی نہ دے جہاں جنگل کے ڈراؤنے جانور اور پہاڑوں کی اندھیری گپھائیں ہوں خوشی اور محبت میرے تقدیر میں نہیں ہے۔ مجھے اُن سے دور بھاگنا چاہئے۔

کیلاشی نے تعجب سے اُس کی طرف دیکھا اور بولی کیوں بیٹی تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟

دوجی کے آنکھوں میں آنسو بہ آئے۔ اس نے جواب دیا۔ رتیا مہارانی کا یہی حکم ہے۔ آن! مجھے اُن کے درشن ہوئے۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا۔ تو وہاں جا جہاں دُکھ اور تکلیف ہو۔ کیونکہ محبت کی خاطر داریاں من کو چنچل کر دیتی ہیں۔

کیلاشی سہم گئی۔ دوجی کو سمجھا کر بولی۔ بیٹی تو نے سپنا دیکھا ہے سپنے کی باتوں کا کون ٹھکانہ۔ مصیبت کا زمانہ۔ برسات کی رُت ہے۔ اُوپر کالی گھنگھور گھٹا نیچے اُمڈی ہوئی ندی دونوں کو دیکھو تو وار پار نہیں۔ گھٹا کو دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اندر نے سمندر کو اوپر لٹکا دیا ہے۔ مگر دو ہی چار دن میں پھر سورج کی چمک آتی ہے۔ اور سر پر چڑھنے والی ندی پیروں کو چومتی ہے۔ اس طرح دل مت چھوٹا کرو۔ یہ دن جلد کٹ جائیں گے میں ان ہاتھوں میں سہاتی چوڑیاں پہناؤں گی۔ میں اس مانگ کو موتیوں سے بھروں گی۔ میں تمہارا بیاہ رچاؤں گی۔ اور ایسا بر ڈھونڈھوں گی جس کی چیری بننے کے لئے بڑے بڑے رئیسوں کی بیٹیاں ترستی ہیں وہ تمہیں آنکھوں کی پتلی بنا کر رکھے گا۔ اور اپنے بھاگ کو سراہے گا۔

آسمان کے نیلگوں سمندر میں تارے حباب کی طرح ٹوٹتے جاتے تھے۔ دوجی نے اُن جھلملاتے ہوئے غم نصیب تاروں کی طرف دیکھا آسمان پر رہیں گے۔ مگر نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ میں بھی اُنہیں کی طرح سب کی آنکھوں سے چھپ جاؤں۔ اُنہیں بلبلوں کی طرح مٹ جاؤں۔

بادہ پرستوں کی رات شروع ہوئی۔ بلاکشان محبت جاگے۔ چکیوں نے اپنے سہانے راگ چھیڑے۔ کیلاشی اشنان کرنے چلی تب دوجی اُٹھی اور وہاں چلی جہاں ڈھاریں کی آواز اور محبت کی خاطر داریاں اور خوشی کا خیال اُن میں سے ایک بھی نہ ہو۔ چڑیا بے بال و پر ہے لے ہم بھی سنہرے پنجرے میں نہ رہ سکی۔

(۱۱)

روشنی کی ایک دھندلی سی جھلک میں کتنی اُمید کتنی قوت، کتنا استقلال ہے۔ یہ اُس آدمی سے پوچھو جسے تاریکی نے ایک گھنے جنگل میں گھیر لیا ہو۔ روشنی کی وہ جھلک اُس کے لڑکھڑاتے ہوئے پیروں کو سُبک اور تیز بنا دیتی ہے اُس کے تن خستہ میں ایک جان سی پڑ جاتی ہے۔ جہاں ایک ایک قدم رکھنا دشوار ہو جاتا تھا۔ وہاں اس شعلۂ حیات کو دیکھتے ہوئے وہ میلوں کو سول۔ ایک عاشقانہ جوش کے ساتھ بڑھتا ہُوا چلا جاتا ہے۔

مگر دوجی کے لئے اُمید کی یہ جھلک کہاں تھی۔ وہ بھوکی پیاسی ایک عالم وحشت میں چلی جاتی تھی۔ معلوم نہیں کہاں، شاید اس جگہ جہاں ہمدردی کی آواز اور خوشی کا خیال بھی نہ ہو۔

شہر پیچھے چھوٹا، باغ اور کھیت آئے۔ کھیتوں میں شگفتہ ہریالی، باغوں میں خزاں کا دور، میدان اور پہاڑ ملے۔ میدانوں سے بانسری کی مدھم اور سہانی آوازیں آتی تھیں۔ پہاڑوں کی بلندیاں موروں کی جھنکار سے گونج رہی تھیں۔ یہ آنے والے پھولوں کے خیر مقدم کے نغمے تھے۔

دن چڑھنے لگا۔ سورج اُس کی طرف آتا ہُوا دکھائی دیا۔ کچھ دیر تک اُس کے ساتھ رہا۔ شاید وہ بھٹکے کو مناتا تھا۔ پھر اپنی راہ چلا گیا۔ بسنت کی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ کھیتوں نے کہرے کی چادریں اوڑھ لیں۔ رات ہو گئی اور دوجی ایک اونچے پہاڑ کے دامن میں جھاڑیوں سے اُٹھتی چٹانوں سے ٹکراتی چلی جاتی تھی۔ گویا کسی جھیل کے ہلکے تلاطم میں کنارے پر اُگے ہوئے ننھے سے جھاؤ کے درخت کا سایہ تھرتھرا رہا ہو۔

اس طرح نامعلوم کی تلاش میں وہ بیکہ و تنہا بےخوف و خطر گرتی پڑتی چلی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ بھوک سردی اور تکان سے اُس کی طاقتوں نے جواب دے دیا۔ وہ بےدم ہو کر ایک چٹان پر بیٹھ گئی۔ اور سہمی ہوئی

نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا داہنے اور بائیں اُونچی منجمد تاریکیاں تھیں جنکی سر پر تارے جگمگا رہے تھے۔ سامنے ایک ٹیلہ راستہ روکے ہوئے کھڑا تھا اور قریب ہی سے کسی جوئے رواں کی ہلکی دبی ہوئی سائیں سائیں سُنائی دیتی تھی۔

(۱۲)

ودیجی کو تھکن کے باوجود نیند نہیں آئی۔ مارے سردی کے کلیجہ کانپ رہا تھا۔ ہوا کے بیرحم جھونکے ذرا بھی چین نہ لینے دیتے تھے۔ ذرا دیر کے لئے آنکھیں جھپک جاتیں اور پھر وہ چونک پڑتی۔ رات اسی طرح گزر گئی۔ صبح ہوئی چٹان سے ذرا دُور پر ایک گھنا پاکر کا درخت تھا۔ جس کی جڑیں خشک پتھروں سے چمٹکر اُن سے قوت نمو یوں حاصل کرتی تھیں جس طرح کوئی مہاجن مفلس آسامیوں کو جکڑ کر اُن سے سُود کے روپے وصول کرتا ہے۔ اس درخت کے مقابل پہاڑ کے دامن میں کئی چھوٹی چھوٹی چٹانوں نے مل کر ایک حجرہ کی صورت بنا رکھی تھی۔ داہنی طرف کوئی دو سو گز کے فاصلہ پر نشیب میں پہاڑی ندی چٹانوں اور سنگریزوں سے اُلجھتی پیچ و تاب کھاتی ہوئی بہہ رہی تھی جس طرح کوئی مضبوط ارادے کا انسان رکاوٹوں کی پرواہ نہ کر کے منزل مقصود کی طرف بڑھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اُس ندی کے کنارے صوفی مشرب بگلے چپ چاپ دھیان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ متین مرغابیاں قناعت آمیز انداز سے پانی میں تیرتی تھیں۔ حریص ٹٹیریاں ندی کے اوپر منڈلاتی تھیں۔ اور رہ رہ کر مچھلیوں کی تلاش میں لوٹتی تھیں۔ کھلاڑی مینے بے فکری سے پروں کو کبھی کبھی کھر کر ہلاتے تھے۔ اور مصلحت پسند کوّے غول کے غول کسب معاش کے مسئلہ کو حل کرنے کی فکر میں تھے۔ ایک درخت کے نیچے بٹیروں کی محفل آراستہ تھی اور درخت کی ڈالیوں پر فاختائیں سرگرم راز و نیاز تھیں۔ ایک دوسرے درخت پر حضرت زاغ اور پنڈت نیل کنٹھ زور شور کے ساتھ

نبرد آزمائی میں مصروف تھے۔ حضرت زاغ نے صرف چھیڑنے کے لئے پنڈت جی کے آشیانہ کی طرف جھانکا تھا۔ اس پر پنڈت جی اس قدر برہم ہوئے کہ حضرت کے پیچھے پڑ گئے۔ حضرت زاغ نے اپنی فطری دانشمندی سے کام فرما کر راہ فرار اختیار کی، اور پنڈت جی صلواتیں سناتے ہوئے سرگرم تعاقب ہوئے۔ بارے میاں زاغ کی تیز روی نے اُن کی جان بچالی۔

ذرا سی دیر میں وحشی تراخ نیل گائیوں کا ایک غول آیا۔ کسی نے پانی پیا، کسی نے صرف سونگھ کر چھوڑ دیا۔ اور دو چار عنفوان شباب کے متوالے باہم سینگیں ملانے لگے۔ پھر ایک کالا ہرن، پُرغرور نگاہوں سے تاکتا، شان سے قدم اُٹھاتا، اپنے متعدد غزال چشموں کو ساتھ لئے ندی کے کنارے آیا۔ پیچھے مؤدبانہ فاصلہ پر کلیلیں کرتے چلے آتے تھے۔ ذرا اور ہٹ کر ایک درخت کے نیچے بندروں نے اپنے ڈیرے جما رکھے تھے۔ بچے خوش فعلیاں کرتے تھے۔ مردوں میں چیخ دھپیٹ ہو رہی تھی، اور گھر والیاں اطمینان سے بیٹھی ہوئی ایک دوسرے کے سر سے بڑی سے جوئیں نکالتی تھیں اور اُنہیں غنچہ دہن میں رکھتی جاتی تھیں۔ وہ بھی ایک چٹان پر نیم خوابی کی حالت میں بیٹھی ہوئی یہ کیفیتیں دیکھ رہی تھی۔ دھوپ نے غنودگی پیدا کی، آنکھیں جھپک گئیں۔ اُس نے دیکھا کہ سیتا سامنے کھڑی اُس کی طرف مادرانہ شفقت سے تاک رہی ہیں۔ اُس نے اُن کے قدموں کو چوما اور بولی، ماتا میرے لئے کیا حکم ہے؟

سیتا نے تشفی آمیز لہجہ میں جواب دیا، بیٹی تم اسی ندی کے کنارے اُنہیں پہاڑوں کے بیچ میں اپنی مصیبت کے دن کما لو۔ بے شک یہاں دکھ اور تکلیف ہے۔ یہاں تمہیں کسی ہمدرد کی آواز نہ سنائی دے گی۔ یہاں تمہیں خوشی کے کوئی سامان نہ ملیں گے۔ مگر کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہمدردیاں غرض سے خالی نہیں ہوتیں۔ اور خوشی کے سامان دل کو ڈانوا ڈول کر دیتے

ہیں، آج سے تم اِس ندی اور اُنہیں پہاڑوں کو اپنا ہمدرد اور اُنہیں قدرت کے کرشموں کو اپنی خوشی کے سامان سمجھو۔

دُوجی کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے دیکھا کہ ندی کا پانی کیسا شفاف ہے۔ کیا ہمدردوں کے دِل بھی ایسے صاف ہوتے ہیں؟

(۱۳)

قدرت کے اسی کرشمہ زار میں دوجی نے چودہ سال بسر کئے۔ وہ روز صبح کو اسی ندی کے کنارے چٹان پر بیٹھی یہ تماشے دیکھتی اور لہروں کے دردناک نغمے سنتی۔ اُسی ندی کی طرح اُس کے دِل میں بھی لہریں اُٹھتیں جو کبھی کبھی ضبط اور ہمت کے کناروں پر چڑھ کر آنکھوں سے بہ نکلتیں۔ اُسے معلوم ہوتا کہ جنگل کے درخت اور جانور سب اُس کی طرف طعنہ آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ندی بھی اُسے دیکھ کر غصہ سے مُنہ میں پھین بھر لیتی۔ جب یہاں بیٹھے بیٹھے اُس کی طبیعت اُکتا جاتی تو وہ پہاڑ پر چڑھ جاتی اور دُور تک نظر دوڑاتی۔ پہاڑوں کے بیچ میں کہیں کہیں مٹی کے گھروندوں کی طرح چھوٹے چھوٹے مکان نظر آتے۔ کہیں لہلہاتے ہوئے سبزہ زار۔ سارا منظر ایک ترو تازہ باغ کی طرح دکھائی دیتا۔ اُس کے دِل میں ایک بے چین کرنے والی خواہش ہوتی کہ کاش میں اُڑ کر اُن چوٹیوں پر جا پہنچتی۔ پہاڑوں کی پُر فضا بلندیوں پر کتنی مسرتیں ہیں۔ سبزہ زار کی تازگی یادِ رفتہ کو کیوں تازہ کر دیتی ہے۔ ندی کے کنارے یا پاکر کے گھنے سایہ میں بیٹھی ہوئی گھنٹوں سوچا کرتی۔ بچپن کے دن یاد آتے۔ جب وہ سہیلیوں کے گلے میں باہیں ڈال کر کھوئے جایا کرتی تھی۔ پھر گڑیوں کے بیاہ یاد آتے۔ پھر اپنے پیارے گاؤں کی پنگھٹ نظروں میں پھر جاتی۔ آج بھی وہاں وہی جمگھٹ ہوگی وہی ہنسی اور چہل۔ پھر اپنا گھر یاد آتا۔ وہ گائے یاد آتی جو اُسے دیکھتے ہی تھنے فراخ کر کے اپنے شوق کا اظہار کیا کرتی تھی۔ منو یاد آتا جو اُس کے پیچھے پیچھے چھلانگیں مارتا کھیتوں

میں جایا کرتا تھا، جو برتن دھوتے وقت بار بار برتنوں میں منہ ڈالتا۔ جب للن سنگھ آنکھوں کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے لبوں پر وہی شوخ تبسم، آنکھوں میں وہی شرارت آمیز چمک، تب وہ اُٹھ کھڑی ہوتی اور خیالات کو دوسری طرف لے جانے کی کوشش کرتی۔

دن جاتے تھے، مگر بہت آہستہ آہستہ بسنت آیا، سیمل کا حُسن احمر اور کچنال کی اودی شوخیاں اپنی بہار دکھانے لگیں، مہوے کے پھول مہکے، گرمی شروع ہوئی۔ صبح کو صبا کے سہلانے جھونکے دوپہر کو لو کی جھلستی ہوئی لپیٹ بن جاتیں پھولوں سے لدیں پھر وہ دن آیا جب نہ دن کو چین تھا نہ رات کو نیند، دن تڑپتا تھا، رات جلتی تھی۔ ندیاں قصائیوں کے دلوں کی طرح سوکھ گئیں، جنگل کے جانور دوپہر کی دھوپ میں پیاس سے زبان نکالے اِدھر اُدھر پانی کی تلاش میں دوڑتے پھرتے تھے، جس طرح کینہ سے بھرے ہوئے دل ذرا سی باتوں پر جل اُٹھتے ہیں، شعلے بلند ہوتے گویا آگ نے تاروں پر حملہ کیا ہے، جنگل میں ایک بھگدڑ سی ہو جاتی پھر آندھی اور طوفان کے دن آئے زمین اور آسمان تھر تھرا اُٹھتے، سورج چھپ جاتا، پہاڑ بھی کانپ اُٹھتے تھے۔ پھر برسات کا شور ہوا، مینہ کی جھڑی لگی، جنگل لہرائے، ندیوں نے پھر اپنا راگ چھیڑا، پہاڑوں کے سینے ٹھنڈے ہوئے، سوکھے ہوئے میدانوں میں ہریالی چھائی، سارسوں کی صدائیں پہاڑوں میں گونجنے لگیں۔ اساڑھ میں بچپن کا الہڑپن تھا، ساون میں شباب کے نشے پینگ بڑھے، پھواریں پڑنے لگیں۔ بھادوں کمائی کے دن تھے جس نے تھیلیوں کے توڑے بھر دیے۔ پہاڑوں کو غنی بنا دیا، آخر بڑھاپا آیا، کانس کے سفید بال لہرانے لگے، جاڑا آپہنچا۔

(۱۴)

اسی طرح رُتیں بدلیں، دن اور مہینے گزرے، سال آئے اور گئے مگر دُوجی نے ودھوا کے اُس گوشہ دامن کو نہ چھوڑا۔ گرمیوں کے بھیانک دن

اور برسات کی ڈراؤنی راتیں، سب اُسی جگہ کاٹ دیں۔ کیا کھاتی تھی، کیا پہنتی تھی، اس کا ذکر فضول ہے۔ دل پہ چاہے جو گزرے، شکم کے تقاضے اور موسمی تکلیفیں نہیں مانتیں۔ قدرت کی تھال سجی ہوئی تھی۔ کبھی جنگلی بیروں کے پکوان تھے، کبھی شریفوں کے، کبھی تیندو، کبھی مکو اور کبھی رام کا نام۔ کپڑوں کیلئے وہ سال میں ایک بار چترکوٹ کے میلے میں جاتی، موروں کے پر اور ہرن کے سینگ اور جنگلی بوٹیاں مہنگے داموں بکتیں، کپڑا بھی آیا، ضروری برتن بھی ہو گئے، یہاں تک کہ چراغ بتی جیسے تکلفات کے سامان بھی ہو گئے، ایک چھوٹی سی گرہستی جم گئی۔

مگر دوجی نے وحشتناک مایوسی کے عالم میں دنیا سے منہ موڑ کر رہنا جتنا آسان سمجھا تھا، اُس سے بہت زیادہ مشکل نظر آیا۔ روحانیت کے سرور میں ڈوبا ہوا ویراگی تو جنگل میں رہ سکتا ہے، مگر ایک عورت جس کی زندگی ہنسنے کھیلنے میں گذری ہو، کسی ڈونگے کے سہارے کے بغیر ویراگ کا اتھاہ سمندر کیونکر پار کر سکتی ہے۔ دو سال کے بعد دوجی کو وہاں ایک ایک دن کاٹنا دو بھر ہو گیا۔ گھر کی سُدھ اُسے ایک دم کو نہ بھولتی، کبھی کبھی اس کا جی ایسا بے چین ہوتا کہ ذرا دیر کیلئے رسوائی کا خوف بھی دور ہو جاتا۔ وہ مستقل ارادہ کر کے اُن پہاڑیوں کے درمیان تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی گھر کی طرف چلتی، گویا کوئی قیدی جیلخانہ سے بھاگا جا رہا ہے۔ مگر پہاڑیوں کے حلقہ سے باہر آتے ہی آپ اُس کے قدم رک جاتے وہ آگے نہ بڑھ سکتی، تب وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ایک چٹان پہ بیٹھ جاتی اور خوب پھوٹ پھوٹ روتی۔ پھر وہی ڈراؤنی رات اور وہی کنج قفس وہی ندی کا نالۂ ماتم اور وہی گیدڑوں کی منحوس صدائیں۔

جوں جوں عمر بھیگتی ہے، زیادہ بھاری ہوتی ہے۔ قسمت کو کوستے کوستے اُس نے پیارے للن سنگھ کو کوسنا شروع کیا۔ قید تنہائی نے اُس میں توجہ اور

استدلال کی صلاحیت پیدا کی ہیں کیوں اس ویرانے میں مُنہ چھپائے مصیبت
کے دِن کاٹ رہی ہوں؟ یہ سب اسی ظالم لِلن سنگھ کی لگائی ہوئی آگ
ہے۔ کیسے آرام سے رہتی تھی۔ اسی نے آکر میرے جھونپڑے میں آگ لگادی۔ میں
نادان بے سمجھ تھی اُس نے جان بُوجھ کر میری مٹی خراب کی۔ مجھے صرف دل بہلاؤ
کا ایک کھلونا بنایا۔ اگر محبت ہوتی تو کیا وہ مجھ سے شادی نہ کر سکتا تھا۔
وہ بھی تو چنڈیل تھا۔ میں نے اپنے پیروں میں آپ کلہاڑی ماری۔

اس طرح دل سے باتیں کرتے کرتے جب لِلن سنگھ کی صورت اُس کے پردہ نگاہ
کے سامنے آکر کھڑی ہوتی، تو وہ نفرت سے مُنہ پھیر لیتی۔ وہ شوخ مسکراہٹ
جو اُس کا من ہر لیا کرتی تھی۔ محبت میں ڈوبی سرگوشیاں جو اُسکی رگوں میں
سنسناہٹ پیدا کر دیتی تھیں اُن میں اب خلوص یا محبت کی جھلک نہ تھی۔
وہ اب فریب اور نفس پرستی اور ہوس رانی کے گاڑھے رنگ میں رنگے ہوئے تھے
وہ پریم کا کچا گھروندہ جس میں وہ گڑیا بنی بیٹھی تھی، ہوا کے جھونکے میں سنبھلا
مگر پانی کی دیر اثر دھار میں نہ سنبھل سکا۔ اب وہ بدنصیب گڑیا بے رحم
چٹانوں پر ٹپک دی گئی ہے۔ کہ رہ رہ کر زندگی کے دِن کاٹے۔ اُن گڑیوں کی
طرح جو گُڈے بیٹھے اور گہنوں سے سجی ہوئی مخملی پٹارے میں ناز برداریوں
کا لطف اُٹھانے کے بعد تیر ندی اور تالاب میں بہادی جاتی ہیں ڈوبنے
کے لئے اور لہروں میں تھپیڑے کھانے کے لئے۔

لِلن سنگھ کی طرف سے پھرتے ہی دیوی کا دل ایک بیتابانہ جوش کے ساتھ
بھائیوں کی طرف مڑا۔ میں نے اپنے ساتھ اُن بے چاروں کو ناحق لے ڈوبی۔ میرے
سر پر اس گھڑی نہ جانے کون سا بھوت سوار تھا۔ اُن بے چاروں نے تو جو کچھ کیا
میری ہی آبرو رکھنے کے لئے کیا۔ میں تو اندھی ہو رہی تھی سمجھانے بجھانے سے
کیا کام چلتا اور سمجھانا بجھانا تو عورتوں کا کام ہے۔ مردوں کا سمجھانا تو اسی

ڈھونگ کا ہوتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ نہیں معلوم اُن بے چاروں پر کیا بیتی کیا میں پھر کبھی اُنہیں دیکھوں گی۔ یہ سوچتے سوچتے بھائیوں کی وہ صورت اُس کی آنکھوں میں پھر جاتی جو اُس نے آخری بار دیکھی تھی۔ جب وہ اُس دیس کو جا رہے تھے جہاں سے لوٹ کر آنا گویا موت کے مُنہ سے نکل آنا ہے۔ وہ سُرخ آنکھیں وہ غرور سے بھری ہوئی چال۔ بھائیوں کی وہ غلط انداز نگاہیں جو ایک بار اُس کی طرف اُٹھ گئی تھیں آہ! اُن میں اب عفو تقصیر کے معنی یاد آتے تھے اُن میں غصہ یا انتقام نہ تھا۔ صرف پچھتاوا تھی۔ وہ مجھ پر غصہ کیا کرتے پھر خدا کے اخلاص کا نقشہ نظروں کے سامنے آجاتا۔ بھائیوں کے وہ تیور، اُن کی وہ آنکھیں جو صرف ایک لمحہ کیلئے غصہ کی گرمی سے پھیل گئی تھیں۔ پھر اُن کی پیار کی باتیں۔ پھر وہ دن یاد آتے۔ جب وہ اُن کی گود میں کھیلتی تھی۔ جب وہ انگلی پکڑ کر کھیتوں میں جایا کرتی تھی۔ آہ! کیا وہ دن بھی آئیں گے۔ اُنہیں پھر دیکھوں گی۔

ایک دن وہ تھا۔ کہ وہ جی لئے بھائیوں کے خون کی پیاسی تھی آخر ایکدن آیا کہ وہ لیونی ندی کے کنارے سنگریزوں سے دنوں کا شمار کرتی تھی آخر ایکدن بخیل روپیوں کو گن گن کر جمع کرتا ہے۔ اسی احتیاط سے وہ بھی اِن سنگریزوں کو گن گن کر جمع کرتی تھی۔ ہر روز شام کے وقت وہ اس ڈھیر میں پتھر کا ایک ٹکڑا اور رکھ دیتی، تو ذرا دیر کیلئے اُسے روحانی مسرت حاصل ہوتی۔ یہ سنگریزوں کا ڈھیر اب اُس کا سرمایۂ زندگی تھا۔ دن میں کتنی بار وہ اِن ٹکڑوں کو دیکھتی اور گنتی۔ بے کس قیدی پتھر کے ڈھیلوں سے اُمید کے گھونسلے بناتی تھی۔

اگر کسی کو حسرت اور کاہش غم کی زندہ تصویر دیکھنا ہو تو وہ لیونی ندی کے کنارے ہر روز شام کے وقت دکھائی دیتی ہے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کی طرح اُس کا چہرہ زرد ہے وہ اپنے غمناک خیالات میں ڈوبی ہوئی محویت کے ساتھ لہروں کیطرف نظر جمائے بیٹھی رہتی ہے۔ ندی تیزی سے کہاں جا رہی ہو؟ مجھے بھی اپنے ساتھ کیوں نہیں لیجاتیں۔ کیا میرے لئے وہاں بھی جگہ نہیں ہے؟ شاید

نالۂ غم میں یہ بھی میری ہم نوا ہیں۔ لہروں کی طرف دیکھتے اسے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ وہ ٹھہر گئی ہیں اور میں تیزی سے بڑھی جا رہی ہوں تب وہ چونک پڑتی ہے۔ اور اندھیرے چٹانوں کے درمیان راستہ ٹٹولتی ہوئی پھر اپنے گزشتہ الم میں آ کر بیٹھ رہتی ہے۔

اسی طرح دوجی نے اپنے ایام مصیبت کاٹے۔ تیس تیس ڈھیلوں کے بارہ ڈھیر تیار ہوئے۔ تب اُس نے انہیں یکجا جمع کر دیا۔ جب غم کی پہلی گھڑی کا دن سال تک وہ سجدہ گاہ اُمید بنی رہی۔ اُس عاجزانہ ارادت کے ساتھ جو کسی بھگت کو اپنے معبود سے ہوتی ہے۔ رات کے دس گھنٹے بیت گئے مشرق کیطرف تنویر صبح نظر آنے لگی۔ وعدۂ وصل قریب آیا۔ آتش شوق تیز تر ہوئی مہینوں کے دن شمار کرتی شاید ایک دن بھی کم ہو جائے۔ آہ! آج کل اُس کے دل کی وہ کیفیت تھی جو صبح کے وقت سورج کی سنہری روشنی میں ہلکورے لینے والے ساگر کی ہوتی ہے۔ جس میں ہوا کی لہروں سے مسکراتا ہوا کنول جھومتا ہے۔

(۱۵)

آج دوجی ان پہاڑوں سے اور دشت سے جدا ہوتی ہے۔ وہ دن آپہنچا جس کی راہ دیکھتے ایک پورا جگ بیت گیا۔ آج چودہ سال کے بعد اس کی پیاسی زلفیں ندی میں نہا رہی ہیں۔ برگد کی جٹائیں ناگن بن گئی ہیں۔

اسی ویرانے سے اُس کی طبیعت کتنی بیزار تھی۔ لیکن آج اس سے جدا ہوتے ہوئے دوجی کی آنکھیں بھر بھر آتی ہیں۔ جس پاکر کے سایہ میں اُس نے مصیبت کے دن جھیلے، جس غار کی گود میں اُس نے رو رو کر راتیں کاٹیں اُنہیں چھوڑتے اُسے آج رنج ہوتا ہے۔ یہ مصیبت کے ساتھی ہیں۔

سورج کی کرنیں دوجی کی اُمیدوں کی طرح کہرے کی گھٹاؤں کو ہٹاتی چلی آتی تھیں اُس نے اپنی مصیبت کے رفیقوں کو پُر نم نگاہوں سے دیکھا پھر اُن تودوں کے پاس گئی جو اُس کی دوازدہ سالہ ریاضت کے یادگار تھے اُس نے

ایک ایک کرکے اُنہیں چھُوتا. گویا وہ دیوی کے چبوترے ہیں، اور تب روتی ہوئی چلی جیسے لڑکی سسرال کو چلتی ہے،

شام کو وہ شہر میں داخل ہوئی، اور پتہ لگاتے ہوئے کیلاشی کے مکان پر آئی مکان ویران پڑا ہوا تھا. کیلاشی کی یادگار باقی تھی تب وہ کرشن سنگھ بگھیلا کے مکان کا پتہ پوچھتی اُنکے بنگلہ پر آئی. کنور صاحب چہل قدمی کرکے آئے ہی تھے کہ اُسے کھڑے دیکھا. قریب آئے. چہرہ پر گھونگھٹ تھا. دوجی نے کہا مہاراج! میں آپ کے کس نوکر ہوں. کنور صاحب نے حیرت سے چونک کر پوچھا ارے تم ہو دوجی! تم اتنے برسوں کہاں رہیں؟

کنور صاحب کے ہمدردانہ لہجہ نے دوجی کے گھونگھٹ اور بھی بڑھا دیئے اُنہیں میرا نام یاد ہے یہ سوچکر اُس کا کلیجہ دھڑکنے لگا. حیا سے گردن جھک گئی لجاتی ہوئی بولی بات میں بے بسانہ التجا کے بجائے اعتماد تھا. جس کا کوئی نہ ہو اُسے جنگل کے سوا اور کہاں ٹھکانا ہے. میں بھی جنگلوں میں رہی. لیمو ندی کے کنارے ایک گپھا میں پڑی رہی.

کنور صاحب شکستہ سا ہو گیا. چودہ سال! اور ایک گپھا میں ندی کے کنارے کیا کوئی سنیاسی اس سے زیادہ تیاگ کر سکتا ہے. وہ حیرت سے کچھ نہ بول سکے.

دوجی انہیں خاموش دیکھکر پھر بولی. میں کیلاشی کے مکان سے سیدھی پہاڑوں میں چلی گئی. اور وہیں اتنے دن کاٹے چودہ سال پورے ہو گئے. جن بھائیوں کی گردن پر تم نے چھری چلائی اُن کے چھوٹنے کے دن اب آ گئے ہیں. نارائن انہیں کشل سے لائے. میں چاہتی ہوں کہ اُن کے درشن کروں. اور انکی طرف سے میرے دل میں جو ارمان ہے. وہ پورا ہو جائے. کنور سنگھ بولے تمہارا ارادہ بہت ٹھیک ہے. میرے پاس آج کلکتہ سے سرکاری خط آیا ہے کہ دونوں بھائی ۴ تاریخ کو کلکتہ پہنچیں گے. اُن کے وارثوں کو اطلاع دی جائے یہاں غالباً وہ لوگ دو تین دن میں آ جائینگے. میں سوچ ہی رہا تھا کہ اطلاع کس کو دوں

دوجی نے آرزومندانہ لہجہ میں کہا۔ میرا جی چاہتا ہے۔ کہ وہ جہاز پر سے اُتریں تو میں اُن کے پاؤں پر سر رکھوں۔ اُس کے بعد مجھے دُنیا میں اور کوئی ارمان باقی نہ رہے گا۔ اسی لالسا نے مجھے اتنے دنوں تک ٹھوکریں کھائی ہیں۔ ورنہ میں آپ کے سامنے کھڑی نہ ہوتی۔

کنور نے سنگھ نے فلسفیانہ مزاج پایا تھا۔ دوجی کے دل کی کیفیتیں اور نیرنگیاں اُن کے دل پر گہرا نقش کرتی جاتی تھیں۔ جب ساری عدالت دوجی پر ہنستی تھی، تب اُنہیں اُس کے ساتھ ہمدردی تھی۔ اور آج اُسکے عالی استقلال وہ اس دہقانی عورت کے معتقد ہو گئے۔ اتنے ہی جتنا وہ کسی زندہ انسان کے ہو سکتے تھے۔ ارادتمندانہ انداز سے بولے۔ اگر تمہاری یہ خواہش ہے تو میں خود تمہیں کلکتہ پہنچا دوں گا۔ تم نے اُن سے ملنے کی جو صورت سوچی ہے اُس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتی۔ مگر تم کھڑی ہو اور میں بیٹھا ہوا ہوں۔ یہ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ دوجی میں بناوٹ نہیں کرتا۔ جس میں اتنا تیاگ اور اتنا مضبوط ارادہ ہو وہ اگر مرد ہے تو دیوتا ہے۔ عورت ہے تو دیوی ہے۔ جب میں نے تمہیں پہلے دیکھا تھا اُسی وقت میں نے سمجھ لیا تھا کہ تم معمولی عورت نہیں ہو۔ جب تم کیلاشی کے مکان سے چلی گئیں۔ تو سب لوگ یہی کہتے تھے کہ تم جان پر کھیل گئیں مگر میرا دل کہتا تھا۔ کہ تم زندہ ہو۔ آنکھوں سے دور رہ کر بھی تم میرے خیال سے باہر نہ ہو سکیں۔ میں نے برسوں تمہاری تلاش کی۔ مگر تم ایسے کھڈ میں جا چھپی تھیں۔ تمہارا کچھ پتہ نہ چلا۔

ان باتوں میں کتنا خلوص، کتنی نقاہت آمیز محبت تھی۔ مگر دوجی کے بدن میں رعشہ سا آگیا۔ دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ اُسوقت اُس کا جی چاہتا تھا کہ میں ان کے پیروں پر سر رکھ دوں۔ کیلاشی نے ایکبار جو بات اُس سے کہی تھی اور جسے سُنکر اُس نے وہاں سے بھاگنے ہی میں اپنی خیریت سوچی تھی۔ وہ بات اُسی وقت اُسے یاد آئی۔ اُس نے بھولے پن سے پوچھا۔ کیا آپ ہی کے کہنے سے کیلاشی نے مجھے اپنے گھر رکھا تھا؟

کنور صاحب نادم ہو کر بولے۔ میں اُسکا کچھ جواب نہ دوں گا۔

رات کو جب کیلاشی ایک برہمنی کے گھر میں نرم بچھونے پر لیٹی ہوئی تھی۔ تو اُس کے دل کی وہ کیفیت ہو رہی تھی۔ جو کنوار کے مہینہ میں آسمان کی ہوتی ہے۔ ایک طرف روشن چاند۔ دوسری طرف گھنی گھٹا۔ اور تیسری طرف جھلملاتے ہوئے تارے۔

(۱۶)

صبح کا وقت تھا۔ گنگا نامی سٹیمر خلیج بنگال کے سطح زمین پر غرور سے گردن اُٹھائے سمندر کی لہروں کو پیروں سے روندتا ہوا ہگلی کے بندرگاہ کی طرف چلا آتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار سے زیادہ مسافر اُس کے آغوش عافیت میں تھے۔ بیشتر نفع تجارت کے خواہش مند۔ کچھ علمی تحقیق کے دلدادہ۔ کچھ سیر و تفریح کے متوالے اور کچھ ایسے ہندوستانی مزدور جنہیں اپنے وطن کا شوق دیدار کھینچے لئے آتا تھا۔ انہیں میں دونو بھائی شان سنگھ اور گمان سنگھ ایک گوشے میں بیٹھے حسرتناک نگاہوں سے ساحل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دونو ہڈیوں کے دو ڈھانچے خستہ حال انہیں پہچاننا مشکل تھا۔

جہاز گھاٹ پر پہنچا۔ مسافروں کے عزیز و اقارب اور احباب ساحل پر اُن کا خیر مقدم کرنے کے لئے شوق سے بیتاب ہو رہے تھے۔ جہاز پر سے اُترتے ہی رسم وفا اور آداب محبت کا سیلاب سا اُمڈا۔ دوست ہاتھ ملاتے تھے۔ عزیز سینوں سے چمٹتے تھے۔ اور آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے تر ہو رہی تھیں۔ یہ دونوں بھائی آہستہ آہستہ جہاز پر سے اُترے۔ گویا کسی نے دھکیل کر اُتار دیا۔ اُن کیلئے جہاز کے تختے اور وطن کی سرزمین میں کوئی فرق نہ تھا۔ آئے نہیں بلکہ لائے گئے۔ ایک مدت دراز کے جور و جبر اور ظلم و ستم نے ان میں زندگی کا احساس تک نہ باقی رکھا تھا۔ ہمتیں کبھی ہوئی آرزوئیں

کب کی مر چکی تھیں۔ وہ ساحل پر کھڑے نگاہِ وحشت سے سامنے تاکتے تھے کہاں جائیں، اُن کے لئے اس وسیع دُنیا میں کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔

تب دُوجی اُس بھیڑ میں سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس نے بھائیوں کو کھڑے دیکھا تب جس طرح پانی نشیب کی طرف گرتا ہے۔ اُسی طرح دُوجی بیتابانہ جوش کے ساتھ روتی ہوئی اُن کے پیروں سے لپٹ گئی۔ داہنے ہاتھ میں شام سنگھ کے پیر تھے۔ بائیں ہاتھ میں گمان سنگھ کے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ گویا دو سوکھے درختوں کی جڑ میں ایک مرجھائی ہوئی بیل چمٹی ہوئی ہے یا دو فقیر مایا اور موہ کی زنجیر میں بندھے کھڑے ہیں۔ بھائیوں کی آنکھیں بھی اُمڈ ہیں۔ اُن کے چہرے بادل میں سے نکلنے والے تاروں کی طرح روشن ہوگئے وہ دونوں زمین پر بیٹھ گئے، اور تینوں بھائی بہن ایک دوسرے سے گلے مل خوب بلک بلک کر روئے۔ وہ گہری کھاڑی جو بہن اور بھائیوں کے درمیان حائل تھی، آنسوؤں سے برتر ہو گئی۔ آج چودہ سال کے بعد بھائی اور بہن میں ملاپ ہوا۔ اور وہ زخم جس نے گوشت کو گوشت اور خون کو خون سے جُدا کر دیا تھا۔ بھر گیا تھا۔ اور یہ اس مرہم کا کام تھا جس سے زیادہ شفا بخش کوئی دوسرا مرہم نہیں ہے۔ جو دل کی کدورتوں کو صاف کرتا جسم کے بدنما داغ اور دھبوں کو مٹا دیتا ہے۔ جو دردِ غم کو بھلانے والا اور دل کی جلن کو ٹھنڈا کرنے والا ہے۔ جو طعنہ کے زہریلے زخموں کو بھی مندمل کر دیتا ہے۔ یہ مرہم ایثار ہے۔

(۷)

دونوں بھائی وطن کو لوٹے۔ پٹی داروں کے خواب پریشان ہو گئے عزیز و اقربا جمع ہوئے۔ پریم بھوج کی ٹھہری۔ کڑھاؤ چڑھ گئے۔ پوریاں پکنے لگیں گھی کی پوریاں معززین برہمنوں کیلئے۔ تیل کی غریب یاسی چماروں کیلئے نکالے

پاپی کا پاپ اُس گھی کے ساتھ بھسم ہو گیا۔

دوجی بھی کلکتہ سے بھائیوں کے ساتھ چلی، الہ آباد تک آئی، کنور نے سنگھ بھی اُن کے ساتھ تھے، بھائیوں سے کنور صاحب نے دوجی کے متعلق کچھ باتیں کیں۔ اُن کی بھنک دوجی کے کان میں پڑی۔ الہ آباد میں دونوں بھائی بھی ٹھہر گئے۔ کہ پریاگ راج میں اشنان کرتے چلیں۔ کنور نے کرشن اپنے خیال میں سب کچھ ٹھیک کر کے دل خوش کن اُمیدوں کا خواب دیکھتے ہوئے روانہ ہو گئے۔ مگر وہاں سے دوجی کا کچھ پتہ نہ چلا، معلوم نہیں کیا ہوئی کہاں چلی گئی۔ شاید گنگا نے اُسے اپنی گود میں لے کر ہمیشہ کی کوفت سے چھڑا دیا۔ بھائی روئے پیٹے، مگر کیا کرتے جس جگہ دوجی نے اپنے بنباس کے چودہ سال کاٹے تھے۔ وہاں دونوں بھائی ہر سال جاتے ہیں اور ان تیروں کے تودے سے چمٹ چمٹ کر روتے ہیں۔

کنور صاحب نے بھی پنشن لی۔ اب چترکوٹ میں رہتے ہیں فلسفیانہ مزاج کے آدمی تھے۔ جس محبت کی تلاش تھی۔ وہ نہ ملی۔ ایک بار کچھ اُمید نظر آئی تھی۔ چودہ سال تک ایک خیال کی صورت میں قائم رہی۔ دفعتاً اُمید کی دھندلی جھلک بھی ایک بار ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی طرح ہنس کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔ مگر اس سچے جذبات والی بھولی عورت کی تصویر کبھی آنکھوں سے نہیں اُتری۔

اماوس کی رات

(۱)

دیوالی کی شام تھی۔ سری نگر کے گھوروں اور کھنڈروں کے بھی نصیب جاگ گئے تھے۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں ہنستے کھیلتے چمکتی ہوئی تھالیوں میں چراغ لئے ہوئے مندروں کو جاتے تھے۔ چراغوں سے زیادہ اُن کے چہرے روشن تھے۔ ہر در و دیوار روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ صرف پنڈت دیودت کا ہفت منزلہ محل تاریکی میں کالی گھٹا کی طرح خاموش اور خوفناک کھڑا تھا۔ خاموش اس لئے کہ ایام رفتہ کی یاد سے دل بھرا ہوا تھا۔ اور خوفناک اس لئے کہ جگمگاہٹ گویا اُسے چڑھا رہی تھی۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ حسد بھی اُسے دیکھ کر ہاتھ ملتا تھا۔ دروازے پر وردی پوش دربانوں کے بجائے اب مدار اور ارنڈ کے درخت کھڑے تھے۔ دیوان خانہ میں اب ایک عاشق تن سانڈ اینڈا کرتا تھا۔ بالاخانو میں اب جنگلی کبوتروں کی مستانہ آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کسی انگریزی مدرسے کے طالب علم کے اخلاق کی طرح اس کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ اور اس کی دیواریں کسی بیوہ کے جگر کی طرح چاک تھیں۔ بیداد زمانہ کا شکوہ کرنا فضول ہے۔ یہ کج فہمی اور کم اندیشی کی عبرت ناک داستان تھی۔

اماوس کی رات تھی۔ روشنی سے مقابلے کی تاب نہ لا کر تاریکی نے اس عالیشان محل میں پناہ لی تھی۔ پنڈت دیودت اپنے نیم تاریک کمرے میں

خاموش اور متفکر بیٹھے ہوئے تھے۔ آج ایک مہینے سے اُن کی بیوی گرجا کی زندگی بے رحم موت کا کھلونا بنی ہوئی تھی۔ وہ غربت اور افلاس کی مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے تیار تھے۔ فلسفۂ تقدیر انہیں تشفی دیتا تھا۔ لیکن یہ نئی مصیبت قوت برداشت سے باہر تھی۔ بیچارے دن کے دن گرجا کے سرہانے بیٹھے اُس کے مرجھائے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر کڑھتے اور روتے تھے۔ گرجا جب اپنی زندگی سے مایوس ہو کر روتی، تو وہ اُسے سمجھاتے۔ گرجا نہ رو۔ تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔"

پنڈت دیودت کے بزرگوں کا کاروبار بہت فروغ پر تھا۔ وہ لین دین کیا کرتے تھے۔ اور زیادہ تر اُن کے بیوپار بڑے بڑے تعلقہ داروں اور راجاؤں کے ساتھ تھے۔ اس زمانہ میں ایمان اتنا ارزاں نہیں بکتا تھا۔ سادہ رقعوں اور پُرزوں پر لاکھوں کی باتیں ہو جاتیں مگر ۱۸۵۷ء کی شورش نے کتنے ہی علاقوں اور ریاستوں کو مٹا دیا۔ اور ان کے ساتھ تیواریوں کا یہ متمول گھرانا بھی خاک میں مل گیا۔ بہی کھاتے پنساریوں کے کام آئے۔ جب ذرا امن و امان ہوا۔ ریاستیں پھر سنبھلیں تو زمانہ پلٹ چکا تھا۔ قول تحریر کا محتاج ہو چکا تھا۔ اور تحریر میں سادہ اور رنگین کی تمیز پیدا ہو گئی تھی جب دیودت نے ہوش سنبھالا۔ تو ان کے پاس ایک کھنڈر کے سوا اور کوئی جائداد نہ تھی اب گزران کی صورت مفقود تھی۔ کاشتکاری میں محنت اور پریشانی تھی تجارت کیلئے نہ سرمایہ تھا۔ نہ دماغ۔ علمی استعداد اتنی نہ تھی۔ کہ کوئی ملازمت کرتے خاندانی وقار خیرات لینے میں مانع تھا۔ سال میں دو تین بار اپنے بیوپاریوں کے یہاں بن بلائے مہمان کی طرح جاتے اور جو کچھ رخصتانہ اور زاد راہ ملتا اُسی پر گزران کرتے۔ خاندانی حشمت کی یادگار کچھ باقی تھی۔ تو وہ اُن رقعوں اور ہنڈیوں کا ایک پلندہ تھا جن کی سیاہی بھی حرف باطل کی طرح مٹ چکی تھی۔ پنڈت دیودت انہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ دونوں کے دن

جب گھر گھر لکشمی کی پوجا ہوتی ہے۔ پنڈت جی اس پنڈے کی بہت اہتمام کے ساتھ پرستش کرتے۔ لکشمی نہ سہی لکشمی کی یادگار تو تھی، دوسرا دن اُن کی ثروت کے سرادھ کا دن تھا۔ اسے چاہے بوالہوسی کہو، چاہے کمزوری۔ مگر پنڈت دیودت کو اُن پرزوں پر بڑا ناز تھا۔ آئے دن کی مناقشات میں اس بوسیدہ کاغذی فوج کی حمایت بڑا کام کرتی، اور فریق مخالف کو اپنی ہار ماننی پڑتی۔ اگر ستر پشتوں سے ہتھیار کی صورت نہ دیکھنے پر لوگ چھتری ہونے کا فخر کرسکتے ہیں تو پنڈت دیودت کا اُن نوشتوں پر فخر کرنا زیادہ بے موقع نہیں معلوم ہوتا جن میں ۵ لاکھ کی رقم چھپی ہوئی تھی۔

(۲)

وہی اماوس کی رات تھی، مگر چراغ اپنی مختصر زندگیاں ختم کرچکے تھے۔ اور رات کی تاریکی سے زیادہ اخلاقی تاریکی کا غلبہ تھا۔ چوروں اور جواریوں کیلئے یہ شگون کی رات تھی کیونکہ آج کی ہار سال بھر کی ہار ہوتی ہے۔ لکشمی کی آمد آمد تھی اسلئے اُن کا پیش خیمہ آگیا تھا۔ جابجا کوڑیوں پر اشرفیاں لٹ رہی تھیں پیر مغاں بھی آج نخرے کر رہا تھا۔ میخانے میں شراب کے بدلے پانی بک رہا تھا۔ پنڈت دیودت کے سوا قصبہ میں کوئی ایسا شخص نہ تھا۔ جو دوسروں کی کمائی سمیٹنے کی فکر میں نہ ہو۔ آج صبح ہی سے گرجا کی حالت خراب تھی اور سرشام سے اُس پر غشی طاری تھی۔ یکایک اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور بہت دھیمی آواز سے بولی۔ "آج تو دیوالی ہے"

دیودت ایسا بیدل اور ہراساں ہو رہا تھا۔ کہ گرجا کو ہوش میں بھی دیکھ کر اُسے خوشی نہ ہوئی۔ "ہاں آج دیوالی ہے" گرجا نے آرزومند نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "ہمارے گھر میں کیا دیئے نہ جلیں گے؟"

دیودت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ گرجا نے پھر اُسی لہجہ میں کہا۔ "دیکھو آج برس برس کے دن گھر اندھیرا رہ گیا۔ مجھے اُٹھا دو، میں بھی اپنے گھر میں

دیئے جلادوں گی۔"

یہ باتیں دیودت کے دل میں چبھی جاتی تھیں۔ انسان کے آخری لمحے خوشیوں اور آرزوؤں کے خیال میں کٹتے ہیں۔ گرجا موت کے منہ میں تھی۔ مگر آرزومند دل کا خواب دیکھ رہی تھی۔

اس قصبہ میں لالہ شنکر داس مشہور وید تھے۔ ضلع کی آیورویدک سوسائٹی کی روح رواں اور شفا خانے میں ادویہ کے بجائے چھاپنے کے پریس رکھے ہوئے تھے۔ دوائیں کم بنتی تھیں، مگر اشتہار زیادہ چھپتے تھے۔ چونکہ اور شہرت پر قانع نہ ہو کر انہوں نے نئے علمی اصولوں کی تلقین شروع کی تھی۔ تندرستی انسان کا طبعی حق ہے۔ بیماری صرف ایک رئیسانہ تکلیف ہے۔ اور پولیٹیکل اکانومی کے مسئلہ کے مطابق تکلفات سے جس قدر زیادہ ممکن ہو ٹیکس لینا چاہیئے۔ اسی اصول پر وہ مریضوں کے ساتھ مطلق رعایت نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی غریب ہو، تو ہو۔ اگر کوئی مرتا ہے تو مرے۔ اسے کیا حق ہے، کہ وہ بیمار پڑے اور مفت میں علاج کرائے۔ ہندوستان کی یہ حالت بہت کچھ مفت علاج کے ہاتھوں ہوئی ہے اس نے آدمیوں کو بے احتیاط اور کمزور بنا دیا ہے۔ دیودت مہینہ بھر سے روز ان کے یہاں دوا لینے آیا کرتا تھا۔ لیکن وید جی کبھی ایسی ہمدردی سے مخاطب نہ ہوئے کہ اسے عرض حال کا حوصلہ ہوتا۔ اُن کے دل کے کمزور حصے تک پہنچنے کے لئے اس نے بہت ہاتھ پیر چلائے۔ آنکھوں میں آنسو بھرے آتا، مگر وید جی کا دل مضبوط تھا۔ اسمیں کمزور حصہ تھا ہی نہیں۔

وہی اماوس کی ڈراؤنی رات تھی۔ آسمانی شمعیں آدھی رات گزرنے پر اب اور بھی زیادہ روشن ہو گئی تھیں گویا وہ سری نگر کے بجھے ہوئے چراغوں پر فاتحانہ مسرت کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔ دیودت ایک عالم اضطراب میں گرجا کے سرہانے سے اٹھے۔ اور وید جی کے مکان کی طرف چلے۔ وہ جاتے

مجھے یقین ہے لالہ اتنی رات گئے۔ بلا اپنا حق خدمت لئے ہرگز نہ آئیں گے۔ لیکن مایوسی میں بھی امید پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دیودت قدم آگے بڑھاتا چلا جاتا تھا۔

(۳)

حکیم جی اسوقت اپنی مجرب بیر بہدف "امرت بندو" کا اشتہار لکھنے میں محو تھے، اور اس اشتہار کی پُر تاثیر عبارت، مصورانہ رنگینی اور پُر زور کشش کے اعتبار سے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا۔ کہ وہ حکیم حاذق تھے یا ناثر جادو طراز۔

ناظرین! آپ جانتے ہیں کہ میں کون ہوں؟ آپ کا زرد چہرہ، آپ کا تن لاغر، آپ کا ذرا سی محنت میں بیدم ہو جاتا۔ آپ کا لذات دنیا سے بے فیض رہنا، آپ کی خانہ تاریکی یہ سب اس سوال کا نفی میں جواب دیتے ہیں۔ سنیئے میں کون ہوں، میں وہ شخص ہوں، جس نے امراض انسانی کو پردۂ دنیا سے معدوم کر دینے کا بیڑا اٹھایا ہے جس نے اشتہار باز جو فروش گندم نما نام نہاد حکیموں کو بیخ و بن سے کھود کر دنیا کو پاک کر دینے کا عزم بالجزم کر لیا ہے۔ میں وہ حیرت انگیز انسان ضعیف البنیان ہوں، جو ناشاد کو دلشاد نامراد کو بامراد، بھگوڑے کو دلیر، گیدڑ کو شیر بناتا ہوں۔ اور یہ کسی جادو سے نہیں، منتر سے نہیں، یہ میری ایجاد کردہ "امرت بندو" کے ادنیٰ کرشمے ہیں۔ امرت بندو کیا ہے، اسے کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ مہرشی اگستت نے دھنونتری کے کان میں اس کا نسخہ بتلایا تھا۔ جس وقت آپ وی۔ پی پارسل کھولیں گے۔ آپ پر اس کی حقیقت روشن ہو جائے گی۔ وہ آب حیات ہے۔ وہ مردانگی کا جوہر، فرزانگی کی اکسیر، عقل کا منبع اور ذہن کا صیقل ہے۔ اگر برسوں کی مشق بازی نے بھی آپ کو شاعر نہیں بنایا۔ اگر شبانہ روز کی محنت پر بھی آپ امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکے اگر دلالوں کی خوشامد اور موکلوں کی ناز برداری کے باوجود آپ احاطہ عدالت میں بھوکے کتے کی طرح

چکر لگاتے پھرتے ہیں۔ اگر آپ گلا پھاڑ کر اور میز پر ہاتھ پیر پٹکنے پر بھی اپنی
تقریر میں کوئی اثر نہیں پیدا کر سکتے، تو آپ امرت بندو کا استعمال
کیجئے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ جو پہلے ہی دن معلوم ہو جائے گا،
یہ ہوگا کہ آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ اور آپ پھر کبھی اشتہار باز جعلیوں
کے دام فریب میں نہ پھنسیں گے۔

ویدجی اس اشتہار کو ختم کر کے اسے باآواز بلند پڑھ رہے تھے۔ ان
کی آنکھوں میں غرور جائز اور آنے والی کامیابی کی امید جھلک رہی تھی
کہ اتنے میں دیودت نے باہر سے آواز دی۔ ویدجی بہت خوش ہوئے۔ رات
کے وقت ان کی فیس دوگنی تھی۔ لالٹین لئے ہوئے باہر نکلے تو دیودت
روتا ہوا ان کے پیروں سے لپٹ گیا۔ اور بولا، ویدجی! اس وقت مجھ پر رحم
کیجئے۔ گرجا اب کوئی دم کی مہمان ہے۔ اب آپ ہی اسے بچا سکتے ہیں
یوں تو میرے نصیب میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا، مگر اس وقت آپ
چل کر ذرا اسے دیکھ لیں، تو میرے آنسو پنچھ جائیں گے مجھے تسکین ہو جائے
گی کہ اس کی خاطر مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ میں نے کیا۔ پرمیشور جانتا ہے
میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کی کچھ خدمت کر سکوں۔ لیکن جب تک جیوں
گا آپ کا جس گاؤں گا۔ اور آپ کے اشاروں کا غلام بنا رہوں گا۔

حکیم جی کو پہلے تو ترس آیا، مگر یہ جگنو کی چمک تھی جو بہت جلد خود غرضی
کی تاریک وسعت میں غائب ہو گئی۔

(۴)

وہی اماوس کی رات تھی۔ پیڑوں پر بھی سناٹا چھا گیا۔ جیتنے والے اپنے
بچوں کو نیند سے جگا جگا کر انعام دے رہے تھے۔ ہارنے والے اپنی نا ہمدرد
اور پر غضب بیویوں سے عذر گناہ کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں گھنٹوں کی
گونجتی ہوئی مبہم آوازیں، ہوا اور تاریکی کو چیرتی ہوئی کان میں آنے لگیں

ان کا مستانہ انداز اس عالم خموشی میں بہت ہی سہانا معلوم ہوتا تھا۔ یہ آوازیں قریب ہوتی گئیں اور بالآخر پنڈت دیودت کے مکان کے پاس آکر اُس کی وسعت پریشان میں غائب ہوگئیں۔ پنڈت جی اس وقت یاس کے بحر بے پایاں میں غوطے کھا رہے تھے۔ افسوس! میں اس قابل بھی نہیں کہ اپنی جان سے عزیز گرجا کی دوا درپن کر سکوں۔ کیا کروں! اس بید د حکیم کو یہاں کیسے لاؤں۔ ظالم میں ساری عمر تیری غلامی کرتا۔ تیرے اشتہار چھاپتا۔ تیری دوائیں کوٹتا۔ آج پنڈت جی کو یہ ناگوار اور ہمت شکن تجربہ ہوا کہ ستر لاکھ کے رقعے اور کاغذ اپنی کوڑیوں کے مول بھی نہیں۔ خاندانی وقار کا سراب آنکھوں کے سامنے سے دور ہوگیا۔ انہوں نے مخملی جزدان کو صندوق سے باہر نکالا اور ان رقعات کو جو خاندانی ثروت کے باقیات صالحہ تھے اور جن کی عزت کی طرح نگہداشت کی جاتی تھی۔ ایک ایک کر کے چراغ کی نذر کرنے لگے۔ جس طرح نازو نعمت میں پلا ہوا جسم چتا کی بھینٹ ہوجاتا ہے اسی طرح یہ کاغذی ہستیاں اس شمع کے دہن آتشیں کا لقمہ ہوتی جاتی تھیں۔ اتنے میں کسی نے باہر سے پنڈت جی کو پکارا۔ انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ خواب سے بیدار ہوئے اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے دروازہ پر آئے۔ تو دیکھا کہ کئی آدمی مشعلیں لئے ہوئے کھڑے ہیں اور ایک ہاتھی اپنی سونڈ سے اُن ارنڈ کے درختوں کو اکھاڑ رہا ہے جو دروازے پر دربانوں کی طرح کھڑے تھے۔ ہاتھی پر ایک شکیل نوجوان بیٹھا ہوا ہے جس کے سر پر زعفرانی رنگ کی ریشمی پاگ ہے۔ ماتھے پر چندن کا ہلالی ٹیکہ بھالے کی طرح تنی ہوئی نوکدار مونچھیں۔ چہرہ سے رعب اور جلال نمایاں۔ کوئی سردار معلوم ہوتا ہے۔ اس کا کلی دار انگرکھا اور چنا ہوا پاجامہ۔ کمر میں لٹکتی ہوئی تلوار اور گردن میں طلائی کنٹھے اور زنجیر اس کے مردانہ جسم پر بہت زیب دے رہے تھے۔ پنڈت جی کو دیکھتے ہی اُس نے رکاب پر پاؤں رکھا۔ اور نیچے اتر کر اُن کی تعظیم کی۔ اس کے اس مؤدبانہ اخلاق سے کچھ نادم ہو کر پنڈت جی بولے

آپ کا آنا کہاں سے ہُوا۔

نوجوان نے بہت منت آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ اُس کے بشرہ سے شرافت برستی تھی۔ مَیں آپ کا پُرانا خادم ہوں۔ غریب خانہ راج نگر میں ہے۔ وہاں کا جاگیر دار ہوں۔ میرے بزرگوں پر آپ کے خاندان نے بہت احسان کئے ہیں میری اسوقت جو کچھ عزت اور جاہ ہے۔ وہ سب آپ کے بزرگوں کی شفقت اور کرم کا طفیل ہے۔ مَیں نے اپنے چند رشتہ داروں سے آپ کا نام سُنا تھا اور مجھے عرصہ سے آپ کے درشنوں کی آرزو تھی۔ آج وہ مُبارک موقع مل گیا اور میرا جنم سپھل ہُوا۔

پنڈت دیودت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ خاندانی عشمت کا غرور اُن کے دل کا نازک ترین حصہ تھا۔ وہ بے لبی جو اُن کے چہرہ پر چھائی ہوئی تھی ذرا دیر کے لئے رُخصت ہو گئی۔ فاخرانہ انداز سے بولے "یہ آپ کی بندہ نوازی ہے، جو ایسا فرماتے ہیں۔ ورنہ مَیں تو ننگ خاندان ہُوں۔ اس قابل بھی نہیں کہ اپنے آپ کو اُن بزرگوں کی اولاد کہہ سکوں۔" اتنے میں خادموں نے صحن میں فرش بچھا دیا۔ دونوں آدمی اُس پہ بیٹھے۔ اور باتیں ہونے لگیں وہ باتیں جن کا ہر جملہ پنڈت دیودت کے چہرہ کو اس طرح شگفتہ کر رہا تھا جس طرح نسیم سحر پھولوں کو کھلا دیتی ہے۔ پنڈت جی کے جدِ بزرگوار نے نوجوان ٹھاکر کے دادا کو پچیس ہزار روپے قرض دیئے تھے۔ ٹھاکر اب گیا میں جا کر اپنے بزرگوں کا شرادھ کرنا چاہتا ہُوں۔ اس لئے ضروری تھا۔ کہ اُن کے ذمہ جو کچھ قرض ہو۔ اس کی ایک ایک کوڑی ادا کر دی جائے۔ ٹھاکر کو پُرانے کاغذات میں یہ واجب الادا رقم نظر آئی۔ پچیس کے اب پچھتر ہزار ہو چکے تھے۔ وہی قرض چکانے کے لئے ٹھاکر دو سو میل کی منزل طے کر کے آیا تھا۔ مذہب ہی وہ قوت ہے۔ جو دل میں ارادت کا جوش پیدا کر سکتی ہے۔ ہاں اسی جوش سے متاثر ہونے کیلئے ایک پاکیزہ بے لوث دل کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہی ارادت بیکاری

اور شقاوت پر اُتر آئی ہے۔ آخر ٹھاکر نے پوچھا "آپ کے یہاں تو وہ رقعہ ہوگا۔؟"

دیودت کا دل بیٹھ گیا۔ سنبھل کر بولے "غالباً ہوگا کچھ کہہ نہیں سکتا" ٹھاکر نے بے پروائی سے کہا "اُسے تلاش کیجئے۔ اگر مل جائے تو میں اُسے لیتا جاؤں گا۔"

پنڈت دیودت اُٹھے، مگر بادلِ سرد۔ کیا یہ تقدیر کی ستم ظریفیاں ہیں جو یوں سبز باغ دکھا رہی ہیں۔ کون جانے وہ پرزہ جل کر خاک ہوگیا ہے۔ یہ بھی تو نہیں معلوم کہ وہ پہلے بھی تھا یا نہیں۔ لیکن نہ ملا۔ تو روپے کون دیتا ہے افسوس! دودھ کا پیالہ سامنے آکر ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے اے ایشور! وہ پرزہ مل جائے۔ میں نے بہت دکھ اُٹھائے ہیں۔ اب مجھ پر دیا کرو۔ اس طرح اُمید و بیم کی حالت میں دیودت اندر گئے۔ اور چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں بچے ہوئے نوشتوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ دفعتاً وہ اُچھل پڑے اور ایک اضطراری جوش بلکہ دیوانگی مسرت کے عالم میں دو تین بار کودے تب دوڑ کر گرجا کو گلے سے لگایا۔ اور بولے پیاری ایشور نے چاہا۔ تو اب تم بچ جاؤ گی اس مدہوشی میں اُنہیں مطلق نہ معلوم ہوا۔ کہ گرجا اب وہاں نہیں ہے۔ صرف اُس کی لاش ہے اُس نے رقعے کو اُٹھا لیا۔ اور دہلیز تک ایسی تیزی سے آیا۔ گویا پاؤں میں پر لگ گئے ہیں۔ مگر یہاں اس نے اپنے آپ کو روکا۔ اور مسرت قلب کی اُمڈتی ہوئی لہریں کو روکتے ہوئے ٹھاکر سے بولا۔ یہ لیجئے وہ رقعہ مل گیا۔ اتفاق کی بات ہے ورنہ ستر لاکھ کے کاغذ دیمک کی خوراک بن گئے۔

غیر متوقع کامیابی اکثر بدگمانی کا باعث ہوتی ہے۔ جب ٹھاکر نے اس رقعے کے لینے کو ہاتھ بڑھایا تو دیودت کو اندیشہ ہوا۔ کہ کہیں وہ اُسے چاک نہ کر ڈالے حالانکہ یہ اندیشہ بالکل بے معنی تھا۔ مگر انسان کمزوریوں کا پتلا ہے۔ ٹھاکر نے اُس کے سوءِ ظن کو تاڑ لیا۔ ایک ترحم آمیز تبسم کے ساتھ اُس نے رقعہ کو لیا اور

مشعل کی روشنی میں دیکھ کر بولا۔ اب مجھے کامل اطمینان ہو گیا۔ یہ لیجئے آپ کی امانت آپکی نذر ہے۔ دعا کیجئے کہ میرے بزرگوں کی مکت ہو جائے۔"

یہ کہکر اس نے اپنی کمر سے ایک خریطہ نکالا۔ اور اس میں سے ایک ایک ہزار کے پچیس نوٹ نکال کر دیودت کو دے دیئے۔ پنڈت جی کا دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور نبض اچھلی پڑتی تھی۔ انہوں نے ادھر چوکنی نگاہوں سے دیکھا کہ کہیں کوئی غیر تو نہیں کھڑا ہے۔ اور تب کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کو لے لیا۔ اظہار عالی ظرفی کی بے سود کوشش میں ان کاغذوں کو گنا بھی نہیں صرف اڑتی ہوئی نگاہ سے دیکھ کر انہیں سمیٹا اور جیب میں ڈال لیا۔

(۵)

وہی اماوس کی رات تھی۔ آسمانی شمعیں بھی دھندلی ہو چلی تھیں۔ ان کی فنا حرارت وحیات کے دیوتا کے آمد کی خبر دے رہی تھی۔ ستارۂ صبح سفیدۂ نور کے ساتھ یہ شہادت دینے کیلئے نمودار ہو چکا تھا۔ مسلفہ نیلگوں سیاہی نے رنگوں اور اثروں کے مقابلہ میں سر جھکا دی۔ افقوں سے وسط آسمان میں ہٹی جاتی تھی۔ افق مشرق فیروزہ یا نابہن ہو چکا تھا۔ اور افق مغرب ہلکے اودے رنگ کی طرف مائل تھا۔ پنڈت دیودت ٹھاکر کو رخصت کر کے گھر میں چلے۔ اس وقت ان کا دل فیاضی کی روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ خوش اعتقادی کی لہر اٹھی ہوئی تھی۔ کوئی سائل اسوقت ان کے دروازے سے بے فیض نہ جا سکتا۔ ست نارائن کی کتھا سننے کا۔ دھوم دھام کے ساتھ سننے کا فیصلہ ہو چکا۔ گرجا کے لئے گہنے اور کپڑے کے منصوبے بندھ چکے۔ اندر پہنچتے ہی انہوں نے سالگرام کے سامنے سچے دل سے سر جھکایا اور تب باقیماندہ رقعوں کو سمیٹ کر بحفاظت تمام اسی مخملی جبہ دان میں رکھ دیا۔ اسلئے نہیں کہ شاید ان مردوں میں سے پھر کوئی زندہ ہو۔ بلکہ معاش کی طرف سے بے فکر ہو کر اب وہ خاندانی شوکت و ثروت پر فخر کر سکتے تھے۔ وہ صابرانہ قناعت کے جوش میں مست تھے۔ بس اب

مجھے زندگی میں مال و دولت کی ضرورت نہیں۔ ایشور نے مجھے اتنا دے دیا ہے۔ اس میں میری اور گرجا کی زندگی پہلے ہی کٹ چکی ہے۔ ان کے دل میں یہ خیال گدگدا رہا تھا کہ جس وقت گرجا یہ خوشخبری سنے گی۔ اس وقت ضرور اٹھ بیٹھے گی۔ فکر اور تکلیف نے اس کی یہ گت بنا دی ہے جیسے کبھی پیٹ بھر روٹی نصیب نہ ہوئی۔ جیسے کسانہ قناعت اور مایوسانہ صبر کی ذلتکاریوں سے کبھی آزاد نہ ہوئی اس حالت اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ گرجا کے پاس گئے۔ اور اسے آہستہ سے ہلا کر کہا۔ "گرجا آنکھیں کھولو۔ دیکھو ایشور نے تمہاری بنتی سن لی۔ اور ہمارے اوپر دیا کی۔ کیسی طبیعت ہے؟"

مگر جب گرجا ذرا بھی نہ سنکی۔ تو انہوں نے چادر ہٹا دی۔ اور اس کے منہ کی طرف دیکھا۔ سینہ سے ایک جگر سوز آہ نکلی اور سر تھام کر وہیں بیٹھ گئے آنکھوں سے خون کے قطرے نکل آئے۔ آہ! کیا یہ دولت اتنی گراں قیمت پر ملی ہے۔ کیا ایشور کے بارے مجھے اس پیاری جان کی قیمت دی گئی ہے۔ ایشور تم خوب انصاف کرتے ہو۔ مجھے گرجا کی ضرورت ہے۔ روپیوں کی ضرورت نہیں۔ یہ سودا بہت گراں ہے۔

(۶)

اماوس کی اندھیری رات گرجا کی تاریک زندگی کی طرح ختم ہو چکی تھی کھیتوں میں ہل چلانے والے کسانوں کے گانے کی بلند اور سہانی آوازیں آ رہی تھیں سردی سے کانپتے ہوئے بچے سورج دیوتا سے باہر نکلنے کی التجا کر رہے تھے۔ پنگھٹ پر گاؤں کی البیلی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ پانی بھرنے کے لئے نہیں۔ ہنسنے کے لئے۔ کوئی گھڑے کو کنوئیں میں ڈالے اپنی پوپلی ساس کی نقل کر رہی تھی۔ کوئی ستون سے چمٹی ہوئی ہے۔ اپنی سہیلی سے مسکرا مسکرا کر راز و نیاز کی باتیں کرتی تھی۔ بوڑھی عورتیں روتے ہوئے پوتیوں کو گود میں لئے اپنی بہوؤں کو کوس رہی تھیں۔ کہ گھنٹہ بھر ہوا اب تک کنوئیں

ہے نہیں ہوئی تھیں۔ مگر راج وید لالہ شنکرداس ابھی تک میٹھی نیند سو رہے تھے۔ کھانستے ہوئے بچے اور کراہتے بوڑھے اُن کے دواخانہ کے دروازہ پر جمع ہو چکے تھے اس مجمع بے تمیزی سے کچھ دُور ہٹ کر دو تین خوش وضع مگر زرد رُو نوجوان سر جھکائے ٹہلتے نظر آتے تھے۔ اور وید جی سے تخلیہ میں کچھ باتیں کرنے کی فکر میں تھے۔ اتنے میں پنڈت دیودت ننگے سر، ننگے بدن سُرخ آنکھیں چہرہ سے وحشت برستی ہوئی۔ دواخانہ کے دروازہ پر آئے اور زور سے ہانک لگائی کہ وید جی چونک پڑے اور کہار کو آواز دی۔ کہ جاکر دروازہ کھولدے۔ یہ حضرت کسی برادری کی پنچائت سے لوٹے تھے۔ انہیں گراں خوابی کا مرض تھا۔ جو باوجود حکیم جی کے مسلسل زبانی اور طبی نسخوں کے کم نہ ہوتا تھا۔ دروازہ کھول کر اپنے حقہ چلم کی فکر میں آگ ڈھونڈھتے چلے گئے۔ حکیم جی چلنے کی کوشش کر رہے تھے کہ یکایک دیودت اُن کے روبرو جاکر کھڑے ہو گئے۔ اور نوٹوں کا پلندہ اُن کے آگے ٹیک کر بولے۔ وید جی! یہ پچھتر ہزار کے نوٹ ہیں۔ یہ آپ کا شکرانہ اور آپ کی فیس ہے آپ چلکر گرجا کو دیکھ لیجئے۔ اور ایسا کچھ کیجئے۔ وہ صرف ایکبار آنکھیں کھول دے۔ یہ اُس کی ایک نگاہ کا صدقہ ہے۔ صرف ایک نگاہ۔ آپ کو روپے انسان کی جان سے پیارے ہیں۔ وہ آپ کی نذر ہیں۔ مجھے گرجا کی ایک نگاہ ان روپوں سے کہیں گنا پیاری ہے۔

وید جی نے ندامت آمیز ہمدردی سے دیودت کی طرف دیکھا۔ اور صرف اتنا کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ میں ہمیشہ کیلئے تمہارا گنہگار ہوں مگر تم نے مجھے سبق دے دیا۔ ایشور نے چاہا۔ تو اب ایسی غلطی نہ ہوگی۔ مجھے افسوس ہے واقعی سخت افسوس ہے۔" یہ باتیں وید جی کے دل سے نکلی تھیں۔

— سماپت —

غیرت کی کٹار

(۱)

کتنا افسوسناک، کتنا پُر درد سانحہ ہے۔ کہ وہی نازنین جو کبھی ہمارے گوشۂ جگر میں بستی تھی، اُسی کے گوشۂ جگر میں چبھنے کیلئے ہمارا خنجر آبدار بے قرار ہو رہا ہو۔ جس کی آنکھیں ہمارے لئے آب حیات کے چھلکتے ہوئے ساغر تھیں، وہی آنکھیں ہمارے دل میں شعلہ اور خون کا طوفان برپا کریں۔ حسن اُسی وقت تک مایۂ راحت و شادمانی ہے، نعمت روحانی جب تک اُس کے قالب میں عصمت کی روح حرکت کر رہی ہو ورنہ وہ مایۂ شر ہے زہر اور عفونت سے لبریز اسی قابل کہ وہ ہماری نگاہوں سے دور رہے اور پنجہ و ناخن کا شکار بنے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ نعیمہ حیدر کی آرزوؤں کی دیوی تھی طالب و مطلوب کی تمیز نہ تھی، ایک طرف کامل دلجوئی تھی دوسری طرف کامل رضا جوئی۔ تقدیر نے بازی پلٹا۔ گل و بلبل میں نسیم کی غمازیاں شروع ہوئیں۔ شام کا وقت تھا۔ آسمان پر شفق کی دلفریب سرخی چھائی ہوئی تھی۔ نعیمہ اُمنگ اور فرحت اور شوق سے اُٹھی ہوئی بالاخانہ پر آئی۔ اُسی شفق کی طرح اس کا چہرہ بھی اُس وقت گلگوں ہو رہا تھا۔ عین اُسی وقت وہاں کا صوبیدار ناصر اپنے باد رفتار گھوڑے پر سوار اُدھر سے نکلا۔ اوپر نگاہ اُٹھی حسن عیر کا کرشمہ نظر آیا۔ گویا چاند شفق کے حوض میں نہا کر نکلا ہے۔ تیر نگاہ جگر کے پار ہوا۔ کلیجہ تھام کر رہ گیا۔ اپنے محل کو لوٹا نیم جان اور خستہ۔ ہوا خواہوں نے طبیب کی تلاش کی، اور تب راہ و رسم پیدا ہوئی پھر تالیف اور تعشق کی دشوار منزلیں طے ہوئیں۔ وفا اور حیا نے بہت بے رخی دکھائی مگر محبت کے شکوے اور عشق کی کفر شکن دھمکیاں آخر غالب آئیں۔ عصمت کا قلعہ ٹوٹ گیا!

اسکے بعد وہی ہوا جو ہو سکتا تھا۔ ایک طرف سے بدگمانی دوسری طرف سے تصنع اور
ریاکاری شکر رنجیوں کی نوبت آئی پھر دلخراشیاں شروع ہوئیں حتیٰ کہ دلوں میں میل
پڑ گئی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ نعیمہ ناصر کی آغوش محبت میں پناہ گزیں ہوئی
اور آج ایک مہینہ کی بیقراری انتظار کے بعد حیدر اپنے جذبات کے ساتھ برہنہ شمشیر
پہلو میں چھپائے اپنے جگر کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو نعیمہ کے خون سے بجھانے کیلئے
آیا ہوا ہے۔

(۲)

آدھی رات کا وقت تھا اندھیری رات تھی جسطرح حرم سرائے فلک میں حسن کے
ستارے جگمگا رہے تھے۔ اسی طرح ناصر کی شبستان حرم بھی حسن کی شمعوں سے روشن تھی
ناصر ایک ہفتہ سے کسی مہم پر گیا ہوا تھا۔ اسلئے دربان غافل ہو گئے انہوں نے حیدر کو دیکھا مگر
اُن کے لقمہ تر سے تند تھے۔ خواجہ سراؤں کی نگاہ پڑی لیکن وہ پہلے ہی شرمندہ احسان ہو
چکے تھے خواصوں اور کنیزوں نے بھی معنی خیز نگاہوں سے اسکا استقبال کیا حیدر انتقام کے
نشہ میں گنہگار نعیمہ کی خوابگاہ ناز میں جا پہنچا جہاں کی ہوا صندل اور گلاب سے معطر تھی۔
کمرہ میں ایک موم کی شمع روشن تھی۔ اسی کی راز دارانہ روشنی میں آرائش اور تکلف
کی گلکاریاں نظر آتی تھیں، جو عصمت جیسی بیش بہا جنس کے بدلے میں خریدی گئی
تھیں، وہیں عشرت اور راحت کی گود میں لیٹی ہوئی، نعیمہ مست خواب تھی۔
حیدر نے ایک بار نعیمہ کو آنکھ بھر دیکھا۔ وہی موہنی صورت تھی، وہی دلربا ملاحت اور
وہی تمنا خیز شگفتگی وہی نازنین جسے ایک بار دیکھ کر بھولنا غیر ممکن تھا۔
ہاں وہی نعیمہ تھی۔ وہی ساعد سیمیں جو کبھی اسکے گلے کا ہار بنتے تھے۔ وہی پھول سے
رخسارے جو اسکی نگاہ شوق کے سامنے سرخ ہو گئے تھے انہیں گوری گوری کلائیوں میں اس نے
شگفتہ کلیوں کے کنگن پہنائے تھے جنہیں وہ وفا کے کنگن سمجھا تھا۔ اسی گلے میں اسنے پھولوں

کے ہار سجائے تھے۔ اُسے کیا معلوم تھا۔ کہ پھولوں کے ہار اور کلیوں کے کنگن کے ساتھ وفا کے کنگن اور پریم کے ہار بھی مُرجھا جائینگے

ہاں یہ ہی گلاب کے سے ہونٹ ہیں، جو کبھی اسکی دلجوئیوں میں پھول کیطرح کھل جاتے تھے۔ جِن سے اُلفت کی دلآویز مہک اُڑتی تھی یہ وہی سینہ ہے جو کبھی اُسکی محبت کا تماشا تھا مگر جِس پھول میں دل کی مہک تھی، اُس میں دغا کے کانٹے ہیں۔

(۳)

حیدر نے شمشیر آبدار پہلو سے نکالی اور دبے پاؤں نعیمہ کی طرف آیا لیکن اُسکے ہاتھ نہ اُٹھ سکے جسکے ساتھ عمر بھر زندگی کی بسر کی، اُسکی گردن پر چھُری چلاتے ہوئے اُس پر رقت کا غلبہ ہُوا۔ دِل میں حسرتناک یادگاروں کا ایک طوفان سا آ گیا۔ کیا خوبی تقدیر ہے جس محبت کا آغاز ایسا پُر مسرت ہو، اُس کا انجام ایسا دلخراش ہو۔ اُسکے پَیر تھر تھرانے لگے لیکن غیرت نے للکارا۔ دیوار پر لٹکی ہوئی تصویریں اُس کی اِس کمزوری پر مسکرائیں۔

مگر کمزور ارادہ ہمیشہ سوال و دلیل کی آڑ لیا کرتا ہے حیدر کے دلمیں خیال پیدا ہُوا اِس باغ محبت کے اُجاڑنے کا الزام میرا اوپر نہیں ہے۔ اگر مَیں نے طعنہ اور نفرین کے بجائے دلداریوں سے کام لیا ہوتا۔ تو آج یہ دِن نہ آتا میری ہی ستم شعاریوں نے محبت اور وفا کی جڑ کاٹی۔ عورت کمزور ہوتی ہے۔ جس عورت نے محبت کے مزے اُٹھائے ہوں اور اُلفت کی ناز برداریاں دیکھی ہوں۔ وہ طعن اور تحقیر کی آنچ کیا سہہ سکتی ہے لیکن پھر غیرت نے اُکسایا گویا وہ دھندلی شمع بھی اُس کی کمزوری پہ ہنسنے لگی۔

غیرت اور استدلال میں سوال و جواب ہو رہے تھے کہ دفعتاً نعیمہ نے کروٹ بدلی اور انگڑائی لی۔ حیدر نے فوراً تلوار اُٹھائی۔ خطرۂ جان میں پس و پیش کہاں، دل نے فیصلہ کر لیا۔ تلوار اپنا کام کرنے والی ہی تھی کہ نعیمہ نے آنکھیں کھولدیں، موت کی کٹار سر پر نظر آئی وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ حیدر کو دیکھا۔ صورتِ حال سمجھ میں آ گئی۔ بولی "حیدر"!

(۳)

حیدر نے اپنی خفت کو غصہ کے پردے میں چھپا کر کہا۔ ہاں میں ہوں حیدر! نعیمہ سر جھکا کر حسرتناک انداز سے بولی۔ تمہارے ہاتھوں میں یہ چمکتی ہوئی تلوار دیکھ کر میرا کلیجہ تھر تھرا رہا ہے۔ تمہیں مجھے نازبرداریوں کا عادی بنا دیا ہے۔ ذرا دیر کیلئے اس کٹار کو میری آنکھوں سے چھپا لو۔ میں جانتی ہوں۔ تم میرے خون کے پیاسے ہو۔ تم اتنے بے رحم اور سنگدل ہو۔ میں نے تم سے دغا کی ہے۔ تمہاری خطاوار ہوں۔ لیکن حیدر یقین مانو اگر مجھے چند آخری باتیں کہنے کا موقع نہ ملتا تو شاید میری روح کو دوزخ میں بھی یہی آرزو رہتی۔ سزائے موت سے پہلے اپنے گناہوں سے آخری ملاقات کی اجازت ہوتی ہے۔ مانا کہ اب تم میرے کوئی نہیں ہو۔ مانا کہ اب تم میرے کوئی نہیں ہو۔ مگر کبھی وقت تھے اور تم چاہے اپنے دل میں سمجھتے ہو میں سب کچھ بھول گئی لیکن میں اتنی محبت فراموش نہیں ہوں۔ اپنے ہی دل سے فیصلہ کرو۔ تم میری بے وفائیاں چاہے بھول جاؤ۔ لیکن میری محبت کی دلکش یادگاریں نہیں مٹا سکتے۔ میری آخری باتیں سن لو۔ اس ناپاک زندگی کا قضیہ پاک کر دو۔ میں تم سے صاف کہتی ہوں۔ آخری وقت میں کیوں ڈروں۔ میری درگت کے ذمہ وار تم ہو۔ ناراض نہ ہو اگر تمہارا خیال ہے کہ میں یہاں پھولوں کی سیج پر سوتی ہوں تو وہ غلط ہے۔ میں نے عصمت کھو کر عصمت کی قدر جانی ہے۔ میں حسین و نازک اندام ہوں۔ تمام میری رشنا کا غلام ہے لیکن میرے دل سے یہ خیال کبھی دور نہیں ہوتا۔ کہ وہ صرف حسن کا اور ادا کا بندہ ہے

اُف! میں نے عصمت کھو کر عصمت کی قدر جانی ہے۔ لیکن میں کہہ چکی ہوں اسکے تم ذمہ وار ہو۔ حیدر نے پہلو بدل کر پوچھا کیونکر؟ نعیمہ نے اسی انداز سے جواب دیا تم نے مجھے بیوی بنا کر نہیں معشوق بنا کر رکھا۔ تم نے مجھے نازبرداریوں کا عادی بنایا لیکن فرض کا سبق نہیں پڑھایا۔ تم نے کبھی نہ اپنی باتوں سے نہ فعلوں سے مجھے یہ خیال کرنے کا موقع دیا۔ کہ اس محبت کی بنیاد فرض پر ہے۔ تم نے مجھے ہمیشہ رعنائیوں اور

ستیوں کے طلسم میں پھنسا رکھا۔ اور مجھے نفس کی دار شکیبوں کا غلام بنا دیا، جن کی کشتی پر اگر فرض کا ناخدا نہ ہو تو پھر اُسے دریا میں ڈوب جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، اب تو تمہاری غیرت کی کٹار میرے خون کی پیاسی ہے اور یہ سر تسلیم اس کے سامنے خم ہے میری آخری تمنا ہے اگر تمہاری اجازت پاؤں تو کہوں؟

یہ کہتے کہتے نعیمہ کی آنکھوں میں اشک کا سیلاب آ گیا۔ اور حیدر کی غیرت اس کے سامنے نہ ٹھہر سکی، غمگین انداز سے بولا، کیا کہتی ہو؟

نعیمہ نے کہا، اچھا اجازت دی ہے تو انکار نہ کرنا۔ مجھے ایکبار پھر اُن اچھے دنوں کی یاد تازہ کر لینے دو، جب موت کی کٹار نہیں، محبت کے پیکان جگر کو چھیدا کرتے تھے۔ ایکبار پھر مجھے اپنے آغوش الفت میں لے لو۔ میری آخری التجا ہے ایکبار پھر اپنے ہاتھوں کو میری گردن کی حمائل بنا دو۔ بھول جاؤ میں نے تمہارے ساتھ دغا کی ہے بھول جاؤ کہ یہ جسم گندہ اور ناپاک ہے۔ مجھے محبت سے گلے لگا لو۔ اور یہ مجھے دیدو تمہارے ہاتھوں میں یہ زیب نہیں دیتی۔

یہ کہکر نعیمہ نے حیدر کے کمزور ہاتھوں سے وہ شمشیر آبدار چھین لی۔ اور اس کے سینے سے لپٹ گئی، حیدر جھجکا لیکن وہ صرف عارفانہ جھجک تھی غیرت اور جذبۂ انتقام کی دیوار ٹوٹ گئی۔ دونوں ہم آغوش ہو گئے اور دونوں کی آنکھیں اُمنڈ آئیں۔

نعیمہ کے چہرے پر ایک دلآویز جان بخش تبسّم نظر آیا۔ اور متوالی آنکھوں میں مسرت کی سُرخی جھلکنے لگی۔ بولی۔ آج کیسا مُبارک دن ہے۔ کہ دل کی سب آرزوئیں پوری ہوتی جاتی ہیں، لیکن یہ کم بخت آرزوئیں کبھی پوری نہیں ہوتیں تم نے مجھے کتنی بار پریم کے پیالے پلائے ہیں، اُس شیشہ و ساغر کی یاد نہیں بھولتی، آج ایک بار پھر مئے الفت کے دَور چلنے دو، یاد ہے ، رگ سے پہلے الفت

کی شراب پلاؤ۔ ایک بار پھر میرے ہاتھوں سے پیالہ لے لو۔ میری طرف اُنہیں پیار کی نگاہوں سے دیکھ کر جو کبھی آنکھوں سے نہ اُترتی تھیں۔ پی جاؤ۔ مرتی ہوں تو خوشی سے مروں

نعیمہ نے اگر عصمت کھوکر عصمت کی قدر جانی تھی۔ تو حیدر نے بھی محبت کھو کر محبت کی قدر جانی تھی۔ ندامت اور التجا اور پھر تسلیم یہ غصہ اور انتقام کے مہلک دشمن ہیں۔ ایک نازنین کے نازک ہاتھوں میں تو اُن کی کاٹ شمشیر آبدار کو مات کر دیتی ہے۔ رمے تاب کے دور چلے حیدر نے مستانہ بلانوشی کے ساتھ پیالے پر پیالے پر پیالے خالی کرنے شروع کئے۔ اُس کے جی میں بار بار آتا تھا کہ نعیمہ کے پیروں پر سر رکھ دوں۔ اس اُجڑے ہوئے آشیانے کو آباد کر پھر سرور کی کیفیت پیدا ہوئی اور اپنے قول فعل پر اُسے اختیار نہ رہا۔ وہ رویا، گڑگڑایا، منتیں کیں یہاں تک کہ اُن دغا کے پیالوں نے اُسے سرنگوں کر دیا۔

(۵)

حیدر کئی گھنٹے تک بے سُدھ پڑا رہا۔ وہ چونکا تو رات بہت کم باقی رہ گئی تھی اُس نے اُٹھنا چاہا لیکن اُسکے ہاتھ پیر ریشم کی ڈوریوں سے مضبوط بندھے تھے۔ اُس نے دیکھا نعیمہ وہی خنجر آبدار لئے کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک قاتلانہ تبسم کی سُرخی تھی۔ فرضی معشوق کی سفاکی و خنجر بازی کے ترانے وہ بارہا گا چکا تھا مگر اس وقت اُسے اس نظارہ سے شاعرانہ لُطف اُٹھانے کا جیوٹ نہ تھا۔ خطرہ جان نشہ کیلئے ترشی سے بھی زیادہ قاتل ہے۔ گھبرا کر بولا۔ نعیمہ؟

نعیمہ نے تیز لہجہ میں کہا۔ ہاں میں ہوں۔ نعیمہ۔

حیدر غصہ سے بولا۔ کیا پھر دغا کی وار کی؟

نعیمہ نے جواب دیا۔ جب وہ مرد جسے خدا نے شجاعت اور قوت حوصلہ دیا ہے دغا کی وار کر بیٹھے۔ دغا اور فریب عورتوں کے ہتھیار ہیں۔ کیونکہ عورت کمزور ہوتی ہے تمکو معلوم

ہو گیا ہوگا۔ کہ عورت کے نازک ہاتھوں میں ہتھیار کیسی کاٹ کرتے ہیں۔ یہ دیکھو یہ وہی شمشیر آبدار ہے۔ جسے تم غیرت کی کٹار کہتے تھے۔ حیدر! انسان تھوڑا کھو کر بہت کچھ سیکھتا ہے۔ تم نے عزت و حرمت ننگ و ناموس سب کچھ کھو کر بھی کچھ نہ سیکھا تم مرد تھے نامر تمہارا رقیب تھا۔ تمہیں اسکے مقابلہ میں اپنی تلوار کے جوہر دکھانا تھا۔ لیکن تم نے نرالی روش اختیار کی، ایک بیکس عورت پر وار کرنا چاہا۔ اور اب تم اُسی عورت کے سامنے بے دست و پا پڑے ہوئے ہو۔ تمہاری جان بالکل میری مٹھی میں ہے۔ میں ایک لمحہ میں اُسے مسل سکتی ہوں اور اگر میں ایسا کروں تو تمہیں میرا منت گزار ہونا چاہیے۔ کیونکہ ایک مرد کیلئے غیرت کی موت بے غیرتی کی زندگی سے اچھی ہے۔ لیکن میں تمہارے اوپر رحم کروں گی۔ فیاضی کا برتاؤ کرونگی۔ تم غیرت کی موت کے مستحق نہیں ہو۔ جو غیرت چند میٹھی باتوں اور ایک پیالہ شراب کے ہاتھوں بکجائے وہ اصلی غیرت نہیں ہے۔ حیدر! تم کتنے سادہ لوح ہو، اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جس عورت نے عصمت جیسی بے بہا جنس دیکر یہ عیش اور تکلیف پایا ہے۔ وہ زندہ رہ کر ان نعمتوں کا سکھ لوٹنا چاہتی ہے۔ جب تم سب کچھ کھو کر زندگی سے بیزار نہیں ہوں تو میں سب کچھ پا کر کیوں موت کی خواہش کروں۔ اب رات بہت کم رہ گئی ہے۔ یہاں سے جان لے کر بھاگو۔ ورنہ میری شفاعت بھی تمہیں نامر کے غصہ کی آگ سے نہ بچا سکے گی۔ تمہاری یہ غیرت کی کٹار میرے قبضہ میں رہے گی۔ اور تمہیں یاد دلاتی رہے گی۔ کہ تم نے عزت کے ساتھ غیرت بھی کھو دی۔

منزل مقصود

(۱)

آہ! آج تین سال گذر گئے۔ یہی مکان ہے یہی باغ ہے یہی گنگا کا کنارہ یہی سنگ مرمر کا حوض یہی میں ہوں۔ اور یہی در و دیوار، مگر اب ان کیفیات سے دل متاثر نہیں ہوتا۔ وہ نشہ جو گنگا کے لطف انگیز تلاطم اور ہوا کے دلفریب جھونکوں سے دل پر طاری ہو جاتا تھا، اُس کیلئے اب بھی ترس ترس کے رہ جاتا ہے۔ اب وہ دل نہیں رہا وہ نازنین جس پر زندگی کا مدار تھا۔ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

موہنی نے دلفریب صورت پائی تھی۔ اُس کے حسن میں غضب کی تاثیر تھی۔ اُسے پیار کرنا مشکل تھا۔ وہ پرستش کرنے کے قابل تھی۔ اُس کے چہرہ پر ہمیشہ ایک دل آویز روحانیت کا جلوہ رہتا تھا۔ اُس کی آنکھیں جنہیں شرم کی متانت اور پاکیزگی کا سرور تھا۔ محبت کا سرچشمہ تھیں۔ ایک ایک نگاہ ایک ایک حرکت ایک ایک بات اس کے دل کی پاکیزگی اور خلوص کا اثر دل پر پیدا کرتی تھی۔ جب وہ اپنی شرمگیں نگاہوں سے میری طرف تاکتی۔ تو اُس کی کشش اور اُس کی گرمی میرے دل میں ایک عجیب کا عالم پیدا کر دیتی ہے۔ اُس کی آنکھوں سے روحانی جذبات کی شعاعیں نکلتی تھیں۔ مگر اُس کے لب کلمہ محبت سے نا آشنا تھے۔ اُس نے کبھی کنایت بھی اس انتہا پریم کا اظہار نہیں کیا۔ جس کی لہروں میں وہ خود تنکا کی طرح بہی جاتی تھی۔ اسکی محبت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ محبت جس کی منزل

وصال ہے۔ محبت نہیں نفس پرستی ہے۔ موہنی کی وہ محبت تھی جو وصال میں بھی ہجر کے مزے لیتی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے، ایکبار جب اسی حوض کے کنارے چاندنی رات میں میری گرم جوشیوں سے مخمور ہو کر اُس نے کہا تھا۔ آہ! وہ آواز بھی دل پر نقش ہے۔ "وصال محبت کا آغاز ہے۔ انجام نہیں" مسلمہ الفت پر اُس سے زیادہ شاندار اس سے زیادہ رفیع خیال کبھی میری نظر سے نہیں گزرا۔ وہ محبت جو نگاہوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ میری خود سرائی ہو مگر وہ محبت جو میری کمزوریوں کے باوجود موہنی کو مجھ سے تھی۔ میرے دل میں اپنی وسعت ہی نہ تھی۔ مجھے حیرت ہوتی تھی۔ کہ مجھ میں وہ کون سا وصف تھا۔ جس نے موہنی کو جذبۂ الفت سے بے خود کر دیا تھا۔ جسامت، حسن، اخلاق، جوہر مردانگی یہی وہ اوصاف ہیں۔ جن پر محبت نثار ہوتی ہے۔ مگر میں اُن میں سے ایک پر بھی ناز نہیں کر سکتا تھا۔ شاید میری کمزوریاں ہی اُس سوزِ الفت کا باعث تھیں۔

موہنی میں وہ ادائیں نہ تھیں۔ جن پر رنگیلی طبیعتیں فدا ہو جایا کرتی ہیں۔ ترچھی چتون، نگاہ ناز، دلآویز تبسم، زبان شوخ، ان کا یہاں وجود نہ تھا۔ مگر جس طرح چاند کی مدھم خوشگوار روشنی میں کبھی کبھی پھواریں پڑنے لگتی ہیں، اُسی طرح عالم خلوص میں اُس کے چہرے پر ایک حسرت ناک مسکراہٹ جلوہ افروز ہوتی اور آنکھیں آبگوں ہو جاتیں یہ ادا نہ تھی جذبات صادق کی تصویر تھی۔ جو میرے دل میں پاکیزہ الفت کا ہیجان پیدا کر دیتی تھی

(۲)

شام کا وقت تھا۔ دن اور رات باہم بغلگیر ہو رہے تھے آسمان پر متوالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور میں موہنی کے ساتھ اسی حوض کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ روح افزا ہوائیں اور مخمور گھٹائیں گوشۂ دل میں سونے والے جذبہ

الفت کو بیدار کر دیا کرتی ہیں۔ وہ مدہوش سرمستی جو اُس وقت ہمارے دلوں پر چھائی ہوئی تھی، اُس پر میں ہزاروں بیداریوں کو قربان کر سکتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس عالمِ بیخبری میں ہمارے دل بیتاب ہو کر آنکھوں سے ٹپک پڑیں گے۔ آج موہنی کی زبان بھی ضبط کی بیڑیوں سے آزاد ہو گئی تھی اور اُس کی جذبۂ لطیف میں ڈوبی ہوئی باتوں سے میری روح کو بالیدگی ہوتی تھی۔

یکایک موہنی نے چونک کر گنگا کی طرف دیکھا۔ ہمارے دلوں کی طرح اُس وقت گنگا بھی اُمڈی ہوئی تھیں۔

اُس پر خروش اور ناہموار سطحِ آب پر ایک چراغ بہتا ہوا چلا جاتا تھا۔ اور اُس کا عکس گلفشاں تھرکتا اور ناچتا ایک دُم دار ستارے کی طرح صفحۂ آب کو منور کر رہا تھا۔ آہ! اُس ہستی موہوم کی کیا بساط تھی۔ کاغذ کے چند پُرزے، بانس کی چند تیلیاں، مٹی کا ایک دیا۔ گویا کسی نامراد کی آرزوؤں کی تربت تھی، جس پر کسی غمخوار نے ترس کھا کر ایک دیا جلا دیا تھا۔ مگر وہ ہستی بے وجود اُس اتھاہ ساگر میں اُچھلتی ہوئی لہروں سے ٹکراتی، گردابوں سے ہچکولے کھاتی، شور انگیز موجوں کو روندتی چلی جاتی تھی۔ شاید جل دیویوں نے اُس کی ضعیفہ ہستی پر ترس کھا کر اُسے اپنے آنچلوں میں چھپا لیا تھا۔

جب تک وہ چراغ جھلملاتا اور ٹمٹماتا۔ ہموار لہروں سے جھکولے لیتا دکھائی دیا، موہنی ٹکٹکی لگائے ایک انداز محویت کے ساتھ اُس کی طرف تاکتی رہی۔ جب وہ دائرہ نظر سے دُور نکل گیا۔ تو وہ ایک بیتابانہ جوش سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور بولی "میں کنارے پر جا کر اس چراغ کو دیکھوں گی"۔

جس طرح سے حلوائی کی صدائے خوشگوار سُن کر بچے گھر سے باہر نکل پڑتے ہیں۔

اور پُر اشتیاق نگاہوں سے دیکھتا اور بے صبر آوازوں سے لپکا رہتا اس خوانِ نعمت کی طرف دوڑتا ہے۔ اسی جوش اور اشتیاق کے ساتھ موہنی ندی کے کنارے چلی۔

باغ سے ندی تک سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں تیزی کے ساتھ نیچے اُترے اور کنارے پہنچتے ہی موہنی نے فرطِ مسرت سے اُچھل کر زور سے کہا ابھی ہے! ابھی ہے! دیکھو وہ نکل گیا"۔

وہ معصومانہ جوش اور انتشار انگیز بے صبری جو موہنی کے چہرے پر اس وقت نمایاں تھی۔ مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ میرے دل میں سوال پیدا ہوا اس چراغ سے اس قدر تعلقِ خاطر اس قدر وحید کیوں؟ مجھ جیسا شاعرانہ حس سے عاری شخص اس معمے کو مطلق نہ سمجھ سکا۔

میرے دل میں وہمے پیدا ہوئے۔ اندھیری رات ہے۔ گھٹائیں اُمڈی ہوئی دریا ٹھیانی پر، ہوا تند۔ یہاں اس وقت ٹھہرنا مصلحت نہیں۔ مگر موہنی وہ پُر شوق بھولے پن کی تصویر۔ اُسی چراغ کی طرف آنکھیں لگائے خاموش کھڑی تھی۔ اور وہ چراغ تاشاد جیوں کا توں بہتا۔ مچلتا بدلا جاتا تھا۔ نہ جانے کہاں رکس دلیس کو؟

مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ چراغ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ موہنی نے حسرتناک لہجے میں پوچھا۔ کیا کچھ گیا ہوگا؟"

اور قبل اس کے کہ میں کچھ جواب دوں۔ وہ اُس کشتی کے قریب چلی گئی جس پر ہم بیٹھ کر کبھی کبھی دریا کی سیر کیا کرتے تھے۔ اور پیار سے میرے گلے لپٹ کر بولی۔ میں اُس چراغ کو دیکھنے جاؤں گی۔ میں دیکھوں گی۔ کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ رکس دلیس کو۔

یہ کہتے کہتے موہنی نے کشتی کی رسی کھول لی۔ جس طرح درختوں کی ڈالیاں طوفان کے جھونکوں سے جھکولے کھاتی ہیں۔ اسی طرح اُس وقت یہ کشتی ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ دریا کی وہ مہیب وسعت، موجوں کی وہ ڈراؤنی چھلانگیں پانی کی وہ پُرشورش صدا، اس ہولناک تاریکی میں اس کشتی کا بیڑا کیونکر پار ہوگا میرا دل بیٹھ گیا۔ کیا اُس نامراد کی تلاش میں یہ کشتی بھی ڈوبے گی، مگر موہنی کا دل اُسوقت اُس کے بس میں نہ تھا۔ اسی چراغ کی طرح اُس کا دل بھی جذبات کے وسیع، متلاطم، پُرشور دریا میں بہا جا رہا تھا۔

ہم کشتی میں بیٹھ گئے۔ اور کشتی لہروں پر جھولے کی طرح جھولتی چلی۔ آہ کیسا ہولناک منظر تھا۔ متوالی گھٹائیں جھکتی چلی آتی تھیں۔ گویا دریا سے گلے ملیں گی۔ اور وہ دریائے سیاہ یوں اُٹھتا تھا۔ گویا بادلوں کو چھولے گا۔ دہشت سے آنکھیں مندی جاتی تھیں۔ ہم تیزی کے ساتھ اُچھلتے، کراروں کے گرنے کی آوازیں سنتے، سیاہ درختوں کا جھرمنا دیکھتے چلے جاتے تھے آبادی پیچھے چھوٹ گئی، دیوتاؤں کی بستی سے بھی آگے نکل گئے۔ یکایک موہنی چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی، اور بولی۔ ابھی ہے! ابھی ہے! دیکھو بہا جا رہا ہے، میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا، وہ چراغ جوں کا توں ہلتا جھلتا چلا جاتا تھا۔

(۳)

اُس چراغ کو دیکھتے ہم بہت دور نکل گئے۔ موہنی نے یہ راگ الاپنا شروع کیا۔

”میں ساجن سے ملن چلی“

کیسا دلنواز نغمہ تھا۔ اور کیسی پُر درد رسیلی آواز، جذبہ اور رقت میں

ڈوبے ہوئے۔ نغمہ دلکش میں تخیلات کو بیدار کرنے کی زبردست قوت ہوتی ہے، وہ انسان کو عالم موجودات سے اٹھا کر عالم خیال میں پہنچا دیتا ہے میری نگاہ خیال میں اس وقت ندی کی پُرشور لہریں، لب ساحل جھومتی ہوئی ڈالیاں، سنسناتی ہوئی ہوا سب متشکل نظر آتی تھیں اور سب کی سب تیزی سے قدم اٹھائے چلی جاتی تھیں۔ اپنے ساجن سے ملنے کیلئے اشتیاق اور الفت سے جھومتی ہوئی ایک نازنین کی دھندلی، خوابی تصور ہوا میں لہروں میں درختوں کے جھرمٹ میں محو خرام نظر آتی تھی۔ اور وہ جاتی تھی۔ ساجن سے ملنے کیلئے اس نغمے نے سارے منظر پر اشتیاق کا جادو پھونک دیا۔

میں ساجن سے ملن چلی

ساجن بست کون سی نگری، میں بوری ناجانوں نا مجھے آس ملن کی اس سے ایسی پریت بھلی، "میں ساجن سے ملن چلی"

موہنی خاموش ہوئی، تو چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور اس سناٹے میں ایک بہت مدھم، رسیلی، خواب انگیز آواز افق کے اس پار سے، یا دریا کے نیچے سے یا ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آتی ہوئی گوش خیال میں سنائی دیتی تھی۔

میں ساجن سے ملن چلی

میں اس نغمے سے اسقدر متاثر ہوا کہ ذرا دیر کیلئے مجھے خیال نہ رہا کہ کہاں ہوں۔ اور کہاں جارہا ہوں۔ دل و دماغ میں وہی راگ گونج رہا تھا۔ دفعتہ" موہنی نے کہا، اس چراغ کو دیکھو۔

میں نے چراغ کی طرف دیکھا، اس کی روشنی ماند ہوگئی تھی اور مایہ زندگی ختم ہوچلا تھا۔ آخر وہ ایک دفعہ ذرا بھبکا اور گل ہوگیا جس طرح

پانی کی بوند دریا میں گر کر غائب ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح تاریکی کی وسعت میں اُس چراغ کی ہستی غائب ہوگئی۔ موہنی نے آہستہ سے کہا: "ایسا نہیں دکھائی دیتا، بُجھ گیا!"

یہ کہکر اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ جذبات درد اُمڈ آئے۔ رقت سے گلا پھنس گیا۔ زبان سے صرف اتنا نکلا۔ "کیا یہی اسکی منزل مقصود تھی؟" آنکھوں سے آنسو گرنے لگے میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ موہنی کی بے چینی اور اشتیاق بے صبری اور افسردگی کا راز سمجھ میں آگیا اور بے اختیار میری آنکھوں سے بھی آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے۔ کیا اُس پُر شور، پُر خطر، طوفانی سفر کی یہی منزل مقصود تھی۔

(۳)

دوسرے دن موہنی اُٹھی تو اُس کا چہرہ زرد تھا۔ اُسے رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ وہ طبعاً شاعرانہ جذبات کی عورت تھی۔ رات کے اس واقعہ نے اسکی درد مند، ذکی الحس طبیعت پر بہت اثر پیدا کیا تھا۔ ہنسی اُس کے ہونٹوں پر یونہی بہت کم آتی تھی، ہاں چہرہ شگفتہ رہتا تھا۔ آج سے وہ شگفتگی بھی رخصت ہوئی۔ ہر دم چہرے پر ایک حسرت سی چھائی رہتی اور باتیں جگر خراش، رقت آمیز ہوتی تھیں۔ میں اُسکے دل کو ان خیالات سے دور رکھنے کیلئے کئی بار ظرافت آمیز قصے لایا۔ مگر انہیں اس نے کھولکر بھی نہ دیکھا۔ وہ میری حاضری میں وہ شاعری کی تصنیفیں دیکھا کرتی۔ مگر اسلئے نہیں کہ پڑھنے سے اُسے کوئی لطف حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اُسے رونے کیلئے کوئی خیال مل جاتا۔ وہ اشعار جو اس زمانے میں اُس نے کہے سوز و گداز کے نمونے ہیں۔ کون ایسا پتھر ہے۔ جو انہیں پڑھ کر اپنے آنسو روک لے گا۔ وہ کبھی کبھی اپنے اشعار مجھے سناتی۔ اور جب میں لذت درد سے وجد میں آکر داد دیتا تو

مجھے اُس کی رُوحانی مسرت کا نشہ نظر آتا تھا، ظرافت اور رنگینی ممکن ہے بعض طبیعتوں پر اثر نہ پیدا کر سکے، مگر وہ کونسا دل ہے۔ جو سوز کے جذبات سے پگھل نہ جائے گا۔

ایک روز ہم دونو اسی باغ کی سیر کر رہے تھے۔ شام کا وقت تھا اور چیت کا مہینہ۔ موہنی کی طبیعت آج شگفتہ تھی۔ بہت دنوں کے بعد آج اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی تھی جب شام ہو گئی اور پورنماشی کا چاند گنگا کی گود سے نکل کر اوپر اُٹھا۔ تو ہم اُسی حوض کے کنارے بیٹھ گئے۔ یہ مولسریوں کی قطار اور یہ حوض موہنی کی یادگاریں ہیں چاندنی میں بساط آئی اور چوپڑ ہونے لگے آج طبیعت کی فرحت نے اُسکے حُسنِ صبیح کو چمکا دیا تھا۔ اُسکی دلآویز شرارتیں مجھے مخمور کئے دیتی تھیں میں کئی بازیاں کھیلا اور ہر بار ہارا، ہارنے میں جو لُطف تھا وہ جیتنے میں کہاں ہم تلاش رہتے ہیں جو لُطف ہے وہ چہکنے اور متوالے ہونے میں نہیں

چاندنی خوب چھٹکی ہوئی تھی۔ یکایک موہنی نے گنگا کی طرف دیکھا اور مجھ سے بولی، "وہ اُس پار کیسی روشنی نظر آ رہی ہے" میں نے بھی نگاہ دوڑائی۔ چِتا کی آگ روشن تھی، لیکن میں نے ٹال کر کہا۔ "ملاح کھانا پکا رہے ہیں۔"

موہنی کو یقین نہ آیا۔ اُس کے چہرے پر ایک حسرت ناک مسکراہٹ دکھائی دی اور آنکھیں آنسوؤں ہو گئیں۔ ایسے دلخراش نظارے اُس کے ذکی الحس اور دردمند دل پر وہی اثر پیدا کرتے تھے۔ جو لُو کی لپیٹ پھولوں کے ساتھ کرتی ہے۔

تھوڑی دیر تک وہ خاموش بے حس و حرکت بیٹھی رہی پھر غمناک لہجے میں بولی۔ "منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔"

تمت